ارضِ شام، اس کا موجودہ بحران اور امت مسلمہ پر اس کے اثرات

(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

تحقیقی مقالہ برائے

پی ایچ-ڈی علوم اسلامیہ

محقق

قوی اللہ

پی ایچ ڈی اسکالر علومِ اسلامیہ

رجسٹریشن نمبر:654-PHD/IS/F16

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن 2016ء-2022ء

ارضِ شام، اس کا موجودہ بحران اور امت مسلمہ پر اس کے اثرات

(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

تحقیقی مقالہ برائے

پی ایچ-ڈی علوم اسلامیہ

محقق

قوی اللہ

پی ایچ ڈی اسکالر علومِ اسلامیہ

رجسٹریشن نمبر:654-PHD/IS/F16

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن2016ء-2022ء

فہرستِ عنوانات

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **ارضِ شام، اس کا موجودہ بحران اور امت مسلمہ پر اس کے اثرات**
(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

نام ڈگری: ڈاکٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: قوی اللہ

رجسٹریشن نمبر: 654-PHD/IS/F16

ڈاکٹر راؤ فرحان علی
(نگرانِ مقالہ) ____________________ دستخط نگرانِ مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی
(صدر، شعبہ علوم اسلامیہ) ____________________ دستخط صدر، شعبہ علوم اسلامیہ

پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) ____________________ دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز
(پرو ریکٹر اکیڈمکس) ____________________ دستخط پرو ریکٹر اکیڈمکس، نمل

میجر جنرل (ر) محمد جعفر
(ریکٹر نمل) ____________________ دستخط ریکٹر نمل

تاریخ ____________________

حلف نامہ فارم

(Candidate Declareation Form)

میں قوی اللہ ولد راج بیگ رجسٹریشن نمبر:654-PHD/IS/F16

طالب علم، پی ایچ ڈی، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز(نمل)اسلام آباد حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ

مقالہ بعنوان: **ارضِ شام، اس کا موجودہ بحران اور امت مسلمہ پر اس کے اثرات**
(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے، اور ڈاکٹر راؤ فرحان علی کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کرایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: قوی اللہ

دستخط مقالہ نگار: ____________

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اظہار تشکر (A Word of Thanks)

سب سے پہلے میں اس منعم حقیقی، پروردگار عالم کا شکر و سپاس بجالاتا ہوں جس کا شکر ہر سانس کے تسلسل سے جڑا ہوا ہے جس کی نصرت اور عطا کردہ توفیق سے یہ کام ممکن ہو سکا اور پھر لاکھوں درود و سلام ہوں حبیب خدا جناب محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر، اس کے بعد میں ہر اس شخص کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے کسی بھی طرح سے مجھے اس تحقیقی کام میں معاونت فراہم کی، بالخصوص نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ریکٹر میجر جنرل (ر) محمد جعفر صاحب، شعبہ تحقیق کے ڈین ڈاکٹر مستنفیض احمد علوی صاحب، ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ جناب ڈاکٹر نور حیات صاحب اور خاص کر اپنے سپر وائزر جناب ڈاکٹر راؤ فرحان علی صاحب کا اور دیگر اساتذہ کرام کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے مجھے یونیورسٹی میں داخلہ سے لے کر Topic کی منظوری اور مقالے کی تکمیل تک ہر ممکن تعاون فرمایا میں مقالے کی کمپوزنگ پر سعید الرحمٰن کیانی کا مشکور ہوں جس نے اپنی مصروفیات کے باوجود مقالے کی تکمیل میں شب و روز کام کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے والدین کا شکر گزار ہوں جن کی دعائیں شب و روز شامل حال رہیں۔

دعا گو ہوں کہ خداوند عالم ان سب کو حفظ و امان میں رکھے ان کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے اور دنیا اور آخرت کی سعادت نصیب فرمائے۔ (آمین)

قوی اللہ

پی ایچ ڈی اسکالر علوم اسلامیہ

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز

دورانِ تحقیق مشکلات

کرونا لاک ڈاؤن کی وجہ سے تحقیق میں بہت زیادہ مشکلات پیش آئیں۔ ملک میں لائبریریز بند ہونے کی وجہ سے مقالے کے متعلقہ ڈیٹا تک رسائی بہت کٹھن مرحلہ رہا۔

اسکالر کی جانب سے ملک شام جانے کے لئے شامی سفارت خانہ میں رابطہ کیا گیا جو کہ کرونا وائرس اور موجودہ ملکی حالات کی وجہ سے ممکن نہ ہوا۔

تلخیص مقالہ(Abstract)

Peace and security are the most important concerns in the stability of any society. However the issue is more highlighted, when it is sourted in the framework of the duties and responsibilities of Muslim Ummah. It is because Islamic teachings tell us about peace as a core ingredient for the establishment of the Muslim society. Unfortunately, the scale of peace in Syria is almost negligible as the war has affected its society to collapse in all spheres of Life.

In this study, foreign interference in the Syrian cries with respect to the plan of establishment of the Jewish state with the name of *Greater Israel* is also discussed in a very thorough manner as it is one of the main cause and factor of the war initiated in the region of Middle East.

Other related issues that are covered in the study are Political and economic crisis, refuges resettlement, the damage caused by the civil war and its impact on the Muslim Ummah.

The study further focuses on the machenism to restore the law and order situation, highlighting the role of Muslim scholars and political leaders, the role of OIC in this regard.

Similarly, for the sake of understanding, differentiation between terrorism and Jihad and the problem of Sectarianism are aslo discussed in this study.

The research consists of five chapters, mainly inculcating the topics like introductions of Syria, it's ongoing current crises, it's causes, it's stimulators behind the crises and it's impact on Muslim Ummah as a whole.

The above problem can be resolved in the light of Qur’an and Sunnah if true will is prevailing to settle it down once and for all.

مقدمہ

موضوع کا تعارف

الحمدللہ الذی ھدانا لھذا و ما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ

الصلاۃ و السلام علی سید الانبیاء و المرسلین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین

شام کا بیشتر حصہ ریگستانی یا نیم ریگستانی ہے۔ بحیرہ روم کے قریب واقع انصاریہ پہاڑی سلسلہ، وسطی شگافی وادی اور لبنان کی پہاڑیوں کے درمیان واقع چند زرخیز وادیاں اور نخلستان ہیں۔ شام بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ ملک کی ستر فیصد آبادی کا انحصار کھیتی باڑی پر ہے۔ چند سیراب ہونے والے علاقوں کو چھوڑ کر شام کی کھیتی کا دارومدار بارش پر ہے۔ کپاس ایک اہم نقدی فصل ہے جس کو برآمد کر کے زرمبادلہ حاصل کیا جاتا ہے۔ شام کی ایک بڑی ریلوے لائن حلب شہر سے ترکی کو پار کرتی ہوئی جزیرہ صوبے سے گزر کر عراق تک جاتی ہے۔ دوسرے ریلوے لائن جو کہ جہاز لائن کہلاتی ہے۔ یہ ریلوے لائن درحقیقت حاجیوں کو مکہ اور مدینے لے جانے کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ شام کا شمار دنیا کے قدیم ترین ممالک میں ہوتا ہے جسکی تہذیب کوئی ساڑھے تین ہزار سال پرانی ہے۔ تاریخ دان شام کا تعلق قدیم ہندوستان سے بھی جوڑتے ہیں، محققین کے مطابق مقدس سنسکرت زبان کا جنم شام میں ہوا تھا، شمالی شام میں واقع آثار قدیمہ سے مقدس رِگ وید کی لکھائی کی دریافت بھی ہوئی ہے، اسی طرح شام اور عراق میں مظالم کے شکار اقلیتی فرقے یزیدی کو قدیم ہندوؤں کا ایک گمشدہ قبیلہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ سرزمین شام تمام مذاہب کے ماننے والوں کیلیئے قابلِ احترام ہے۔ لیکن ہنستا کھِلتا ملک شام حکومتی نااہلی اور بیرونی مداخلت کی وجہ سے گزشتہ 10 سالوں سے خانہ جنگی کا شکار ہے۔ ملک شام کی اس خانہ جنگی کی وجہ سے امت مسلمہ کا اتحاد و اتفاق شدید نقصان کا شکار ہے۔ اور امت مسلمہ ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہے۔ مقالہ ہٰذا اسی حوالے سے ایک کوشش ہے جس میں ارضِ شام کا بحران، اثرات اور اس کا حل پیش کیا گیا ہے۔

موضوع پر سابقہ کام کا جائزہ

ارضِ شام کے موجودہ بحران کے حوالے سے جامعات کی سطح پر پہلے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے اور نہ ہی اس ضمن میں مقالات مل سکے ہیں۔

البتہ اس موضوع پر جس نوعیت کا کام پاکستان میں اور اس سے باہر ہوا ہے اس کی تفصیل یوں ہے:

1- زیادہ تر کام صحافتی حلقے میں ہوا ہے جو رپورٹس اور کالمز کی شکل میں ہے۔

2- انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کی جانب سے اس پر رپورٹس شائع کی گئی ہیں اور مختلف این جی اوز نے اس پر کام کیا ہے۔

3- اردو زبان میں ایسی معتبر کتب دستیاب نہیں ہیں جن کو تحقیق کی بنیاد بنایا جاسکے۔

4- عربی زبان میں اس موضوع پر مختلف جہات میں کام ہوا ہے لیکن یہ مرتب انداز میں کم ہے۔

5- اس موضوع سے متعلقہ چند کتب کے نام یہ ہیں:

محمد حسین ہیکل، **ما الذی جری فی سوریا**(القاہرہ، مکتبہ طیاف، 2014ء)

یہ معروف مصری صحافی و مصنف محمد حسین ہیکل کی کتاب ہے جو شام کے حالات پر تفصیلاً لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت 1962ء میں ہوئی تھی، لیکن 2016ء تک اس کے مختلف ترمیم واضافہ شدہ ایڈیشنز شائع ہوتے رہے ہیں۔ کتاب 250 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے حصے میں شام میں 1961ء کے فوجی انقلاب پر گفتگو کی گئی ہے جس میں سینکڑوں شامی عوام جاں بحق ہوئے تھے۔ اس کے دوسرے حصے میں حافظ اسد اور ان کے طرزِ حکومت پر گفتگو کی گئی ہے۔

مجوب زویری، **العرب وایران مراجعۃ فی التاریخ**(دوحہ، المرکز العربي للدراسات، 2013ء)،

مجوب زویری قطر یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ان کی یہ کتاب مشرق وسطی کے حالات پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب میں تین پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ پہلے حصے میں انقلاب ایران کے بعد خلیج کی صورت حال اور ایران کے اثر ورسوخ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں عراق جنگ (2003ء) کے بعد کے حالات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ جبکہ کتاب کا تیسرا اہم پہلو خطے کی حالیہ سیاست میں عرب وایران کے تنازعے، مسائل اور سماجی مشکلات پر بات کی گئی ہے۔ اس میں بالخصوص شامی بحران کا تناظر نہایت اہم ہے۔

رضوان زیادہ، **التحول الدیمقراطی فی سوریہ**(القاہرہ، مرکز لدراسات حقوق الانسان، 215ء)،

مصنف رضوان زیادہ برلن میں مقیم شامی مفکر ہیں۔ ان کی اس کتاب میں شام کے بحران کے حوالے ممکنہ حلول پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب 283 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں عالمی رہنماؤں کے لیے شام کے بحران کی نظریاتی اساسات کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ قابل عمل تجاویز دی گئی ہیں تاکہ یہ مسئلہ حل کیا جاسکے۔

یوسف سیوفی، **ذکری استقلال سوریا** (بیروت، دارالامان الجدیدہ، 2017ء) 189

یہ شامی مصنف سیوفی اخوان کی کتاب ہے۔ اس میں شام کی تاریخ کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں ملک شام کی قدیم تاریخ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں استعماری عہد کی صورتحال پر بات کی گئی ہے جبکہ تیسرے حصے میں خلافت عثمانیہ کے بعد شام کی مستقل موجودہ حیثیت میں تشکیل اور یہاں کے حالات کو تصنیف کیا گیا ہے۔

The Syrian withdrawal: Where Things Stand (RAND Studies, 2017),

یہ امریکی تھنک ٹینک RAND (ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ) کی ایک رپورٹ ہے۔ جو 2017ء میں شائع کی گئی تھی۔ اس پورٹ میں شامی بحران کے سات سالوں کے بعد بننے والے منظرنامے پر بحث کی گئی ہے کہ اس بحران نے شام اور خطے کے اندر کس قسم کے مسائل کو جنم دیا ہے اور عالمی سطح پر اس کے کیا نتائج مرتب ہوئے ہیں۔

جوازِ تحقیق

اس موضوع پر ہونے والے سابقہ کام میں جو کمی سامنے آئی ہے وہ اس طرح تھے،

1- اس موضوع پر ہونے والا کام منظم انداز میں نہیں ہے۔ یہ چونکہ زیادہ تر صحافتی ضروریات کے تحت لکھا گیا ہے اس لیے اس میں ترتیب کا مسئلہ ہے۔
2- اس میں جانبدارانہ عنصر پایا جاتا ہے۔
3- اس میں موجودہ بحران کی ہمہ جہتی کو نظر انداز کیا گیا جس میں داخلی کے علاوہ خارجی پہلو بھی اہم ہیں۔
4- اس کی مذہبی اساسات پر صرف فرقہ وارانہ لحاظ سے کچھ بات کی گئی ہے مگر بالخصوص حل کے لیے اس کی مذہبی ضروریات و اہمیت کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔

لہٰذا ضروری تھا کہ اس موضوع کو ایک منظم انداز میں مقالے کی صورت میں پیش کیا جائے۔

ضرورت واہمیت

اس سرزمین کی خاص فضیلت قرآن وحدیث میں مذکور ہے۔ اس کی اہمیت کے درج ذیل نکات ہیں۔

1. روایات کے مطابق اس مبارک سرزمین کی طرف حضرت امام مہدی حجاز مقدس سے ہجرت فرماکر قیام فرمائیں گے اور مسلمانوں کی قیادت فرمائیں گے۔
2. صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی اسی علاقہ یعنی دمشق کے مشرق میں سفید مینار پر ہوگا۔[1] غرضیکہ یہ علاقہ قیامت سے قبل اسلام کا مضبوط قلعہ ومرکز بنے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے جزیرۂ عرب کے باہر اگر کسی ملک کا سفر کیا ہے تو وہ صرف ملک شام ہے۔ فرمان رسول ﷺ کے مطابق شام کی سرزمین سے ہی حشر قائم ہوگا[2]۔

تابناک تاریخ وفضائل کے حامل شام میں گزشتہ دس برسوں سے جاری خانہ جنگی میں بی بی سی کے مطابق لگ بھگ پانچ لاکھ شامی شہری مارے جاچکے ہیں جبکہ دس لاکھ سے زائد زخمیوں کی تعداد ہے، شامی باشندوں ایک بڑی تعداد یورپ جانے کی کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔

شامی بحران کو دس سال کا عرصہ بیت چکا ہے مگر یہ مسئلہ وقت کے ساتھ مزید گھمبیر اور لاینحل ہوتا جارہا ہے۔ یہ اب ایسی شکل اختیار کرچکا ہے کہ جس کے حل کی عالمی ومقامی پیش رفت میں کہیں بھی عوام اور مہاجرین کی فلاح وبہبود پیش نظر نہیں ہے۔ سیاسی رسہ کشی میں یہ عالمی کھیل اور مقامی حریفانہ کشمکش کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

عرب اسپرنگ کی چنگاری نے تیونس، لیبیا اور مصر کی حکومتوں کو بھسم کرڈالا تو شام میں بھی عوام اپنے حقوق کیلئے سڑکوں پر نکل آئے۔ آج ایک طرف کچھ عالمی ممالک بشار الاسد کی حکومت کو بچانے کیلئے مہلک اسلحہ اور فضائی طاقت فراہم کررہے ہیں تو دوسری طرف باغیوں کو بھی جدید تباہ کن اسلحہ دیگر ممالک سے وافر مقدار میں دستیاب ہے۔

2011 میں تیونس، مصر، لیبیا اور سوریا میں موجود حکومتوں کے خلاف انقلاب آئے، لیکن تیونس کے صدر زین العابدین نے 24 سالہ اقتدار کو چھوڑ کر ملک کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ مصر کے صدر حسنی مبارک نے عوامی مظاہروں

---

[1] صحیح مسلم، حدیث نمبر: 4523

[2] سنن ترمذی، حدیث نمبر: 1276

کے بعد فوج کی دخل اندازی پر 30 سالہ اقتدار سے علیحدگی اختیار کرکے ملک کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ لیبیا کے صدر معمر القذافی کے خلاف انقلاب آنے پر اس کا 42 سالہ طویل دور ختم ہوگیا مگر ملک مزید تباہی سے بچ گیا۔ لیکن ملک شام میں ایسا نہیں ہوسکا۔ وہاں خانہ جنگی کے بعد مزید ابتری کا شکار ہوتی گئی۔

شامی بحران کے مسلم ممالک، بالخصوص پڑوسی ریاستوں کی معیشت پر جو منفی اثرات مرتب کیے ہیں ان کا ایک سبب تو مہاجرین کی مہاجرت ہے۔ جس کے باعث ان ملکوں میں بے روزگاری کے اندر اضافہ ہوا۔ جب اتنی زیادہ تعداد میں لوگ ان سرحدوں کو عبور کرکے داخل ہوئے تو ان کے روزگار کا مسئلہ بنیادی تھا جس کا بوجھ معیشت پر پڑا۔ دوسری وجہ دفاعی اخراجات میں اضافہ بھی جس سے اقتصادی بحران نے جنم لیا۔ پڑوسی مسلم ممالک چونکہ اس بحران سے براہ راست متأثر ہو رہے تھے۔ یہ خطہ جہاں ایک طرف فرقہ وارانہ آگ میں جھلس رہا تھا وہیں اس کے ساتھ یہ علاقہ عالمی طاقتوں کی باہمی رقابت کی آماجگاہ بھی بن گیا تھا۔ اس لیے پڑوسی ممالک اپنی سرحدوں اور دفاعی نظام کے متعلق بھی فکرمند تھے اور کسی ممکنہ نقصان سے بچنے کے لیے وہ سکیورٹی کا نظام فعال وزیادہ مضبوط بنانے کے لیے مجبور ہوئے۔ ان اقدامات کی خاطر بھی انہیں بھاری پیسہ لگانا پڑا جس سے ان کی معیشت متأثر ہوئی۔

شام کی خانہ جنگی نے جس طرح امت مسلمہ کے مختلف طبقات کے مابین مسلکی اختلافات کی شدت کو بڑھاوا دیا اور مسلح فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوا، اسی طرح شامی بحران کے مسلم ممالک کی معیشت پر بھی منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یہ جنگ جس کا دائرہ قدرے کم ہوا ہے لیکن ختم نہیں ہوئی، کئی سطح پر ایک چیلنج بن کر سامنے آئی جس میں ایک چیلنج اقتصادی نمو میں خسارے کا بھی رہا ہے۔ ابھی جولائی 2020ء کے شروع میں عالمی بینک نے ایک تفصیلی رپورٹ جاری کی ہے جس میں بتایا گیا کہ ملک شام کے بحران اس کے پڑوسی مسلم ممالک کی معیشت کو کس طرح متأثر کیا ہے اور وہ اس کے لیے کیا اقدامات کرسکتے ہیں۔

شام کے ماضی اور حال کی تاریخی اہمیت واثرات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ چیز نہایت اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے کہ اس پر تحقیق کی جائے اور اس کی مختلف سیاسی، معاشرتی، معاشی اور دینی جہات پر حالیہ بحران کے تناظر میں بات کی جائے۔ اس مقالے میں موجودہ ملکِ شام کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے شام کے موجودہ بحران پر تحقیق کا انتخاب کیا گیا ہے۔

مقاصدِ تحقیق

اس موضوع کے انتخاب کے اہداف و مقاصد درج ذیل ہیں:

1- شامی عوام اس بحران سے کن مسائل کا شکار ہوئے۔ ان کے جسمانی، نفسیاتی اور امن امان کے کیا مسائل و مشکلات ہیں اور اس کے تدارک کے لیے کیا اقدامات ممکن ہیں کیا کچھ کیا جارہا ہے۔ اس پہلو کا جائزہ لینا۔

2- شام کے مسئلے کی ایک جہت مذہبی بھی ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش اور یہ کہ دینی رہنمائی میں اس بحران کو کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے اور اس سے جنم لینے والی کدورت کی حدت کو کیسے کم کیا جاسکتا ہے۔ اس پہلو کا تجزیاتی مطالعہ کرنا۔

3- اس بحران نے عالمی سطح پر دین اسلام کی شناخت کو کس قدر متأثر کیا ہے اور اس ضمن میں مسلم ممالک کیا اقدامات کرسکتے ہیں۔ اس کا تجزیہ کرنا۔

4- اس بحران کے پس پردہ عوامل اور محرکات کا جائزہ کہ جس میں داخلی اور بیرونی دونوں لحاظ سے اس کے اسباب پر روشنی ڈالی جائے گی۔

5- اس بحران کے اثرات کا جائزہ کہ اس سے داخلی سطح پر خارجہ حوالے سے مسلم امہ پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

6- اس بحران کے حل کے لیے اسلامی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرنے کی سعی کہ ایسے بحرانوں میں دین اسلام کی ہدایات کیا ہوسکتی ہیں۔

سوالاتِ تحقیق

1۔ ارضِ شام کی اہمیت کیا ہے؟

2۔ ارضِ شام کے موجودہ بحران کی نوعیت اور وسعت کیسی ہے؟

3۔ شام کے موجودہ بحران کے اسباب و محرکات کون سے ہیں؟

4۔ مسلم امہ پر اس بحران کے کیسے اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

5۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس بحران کا حل کیا ہے؟

تحدید اور دائرہ کار موضوع

اس موضوع کا تحدید ارض شام کا تعارف اور ملکِ شام میں دس سال سے جاری خانہ جنگی کی صورت میں جو بحران ملکِ شام اور امت مسلمہ کو درپیش ہے چاہے وہ معاشی ہو یا معاشرتی، مذہبی ہو یا سیاسی، داخلی ہوں یا خارجی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ اس بحران کا احاطہ کیا جائے اور ایک کامل حل تلاش کیا جائے۔

منہج تحقیق:

1- اسلوب بیانیہ، تاریخی اور تجزیاتی اختیار کیا گیا ہے۔
2- دوران تحقیق بنیادی کتب کے ساتھ ثانوی مراجع سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔
3- جدید ذرائع ابلاغ، پرنٹ اور ڈیجیٹل میڈیا کی رپورٹس سے مدد حاصل کی گئی ہے۔
4- مشہور ویب سائیٹس (www.sunnah.com, www.mulismheritage.com, www.islamweb.net) وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔
5- ڈی ڈبلیو، www.dw.com
6- ورلڈ بینک رپورٹس سیریا 2017،2018،2019
7- یو این رپورٹس سیریا 2018،2019،2020
8- بی بی سی، www.bbc.com

باب اول

ارضِ شام کا تعارف

فصل اول　　شام کا تعارف اور تاریخ

فصل دوم　　شام کی اہمیت و فضیلت

فصل اول

ملک شام کا تعارف

ارضِ شام کا مختصر تعارف

تاریخ میں ملکِ شام کا علاقہ موجودہ چار ممالک کی جغرافیائی حدود پر مشتمل تھا۔ وہ چار ممالک یہ تھے: موجودہ شام، فلسطین، اردن اور لبنان (اگرچہ اسرائیل بھی بطور ریاست شامل ہے لیکن ریاست پاکستان اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتی ایک مقبوضہ علاقہ سمجھتی ہے اس لیے ہم اس کو ایک آزاد ریاست نہیں سمجھ سکتے)۔[1] پہلی جنگ عظیم تک ملک شام اس سارے جغرافیے پر پھیلا ہوا تھا، تاہم 1920ء میں برطانیہ اور فرانس نے جب اس علاقے پر قبضہ جمایا تو اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور تب سے شام موجودہ سوریا کہلایا اور اس کے ساتھ باقی تین ممالک بھی وجود میں آگئے۔ عربی میں موجودہ شام کو سوریا کہا جاتا ہے جبکہ انگریزی میں اسے سیریا کا نام دیا گیا۔ البتہ اُردو میں اسے اب بھی شام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قدیم کتبِ تاریخ میں، بالخصوص اسلامی تہذیبی ذخیرے میں جب بھی ارضِ شام کا استعمال ہو گا اس سے مراد قدیم جغرافیہ کا حامل شام ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں بھی اس سے مراد یہی ہوتا ہے۔ شام اصل میں سریانی زبان کا لفظ ہے۔ یہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام بن نوح کی جانب منسوب ہے۔[2] کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد سام بن نوح اسی علاقے میں آباد ہوئے تھے، اس لیے یہ سرزمین انہی کے نام سے منسوب ہوئی۔ پھر اسے عربی میں معرب کر کے سام سے شام کہا جانے لگا اور اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔

اسی مبارک سرزمین پر مسلمانوں کا قبلہ اول بیت المقدس واقع ہے۔ اس کی طرف آنحضرت ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ تک رُخ کر کے نمازیں ادا فرمائیں اور عبادت کی[3]۔ زمین کا یہ ٹکڑا مسجد حرام اور مسجد نبوی کے بعد سب سے زیادہ مقدس ہے۔ یہ وہ واحد سرزمین ہے جس کی طرف آنحضرت ﷺ نے جزیرہ عرب سے باہر سفر کیا۔ قرآن کریم

---

[1] محمود صالح، الہلال الخصیب (بیروت، دار المشرق، 2018ء)243

[2] عمر عبد الحکم، الثورہ الجہادیہ فی سوریا (القاہرہ، مکتبہ طیاف، 2017ء)10

[3] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ سیقول السفہاء، حدیث نمبر:4486

میں جو معراج کا واقعہ مذکور ہے اس مبارک سفر کی ابتداء پر بھی اسی سرزمین سے ہوئی تھی۔ اسی سرزمین پر ہی آپ ﷺ نے تمام انبیاء کی امامت بھی فرمائی تھی۔ [1]

جدید شام کا پس منظر

بیسویں صدی عیسوی کے شروع سے دنیا کے نقشے پر تیزی کے ساتھ تبدیلیاں وقوع پذیر ہونی شروع ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں اس قدر حیران کن اور سرعت کے ساتھ سامنے آئیں کہ ساری دنیا کے لوگ ششدر رہ گئے۔ بالخصوص خلافتِ عثمانیہ کا طویل و عریض رقبہ جس طرح سکڑنے لگا یہ ناقابل یقین تھا۔ اسی دوران ملک شام کا علاقہ بھی خلافت عثمانیہ کے اقتدار سے علیحدہ ہو گیا اور یہ علاقہ ٹکڑوں میں بٹ کر مختلف ممالک کی شکل اختیار کر گیا۔ [2]

1911ء میں پہلے اٹلی کی افوج اور ترک سلطنت کے مابین لڑائیاں ہوئیں۔ اس میں ترکی کو شکست اٹھانی پڑی اور لیبیا اٹلی کے زیر قبضہ چلا گیا۔ اس کے بعد 1912ء میں دیگر چھوٹے چھوٹے یورپی ممالک کے اتحاد کے ساتھ لڑائیوں کے دوران ترک سلطنت کی باگ ڈور سے مزید کئی علاقے جاتے رہے۔ جب ترک سلطنت کو یکے بعد دیگرے متعدد میدانوں میں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تو جزیرہ عرب میں بھی تشویش کی لہر دوڑ گئی اور قوم پرست عرب رہنما عوام کے اندر یہ تاثر پیدا کرنے لگے کہ انہیں اب خلافت عثمانیہ کی کمان سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنے مستقبل کے فیصلے خود کرنے چاہئیں۔ علیحدگی کی اس تحریک کی ابتداء لبنان سے ہوئی۔ یہ تحریک اس قدر مؤثر اور طاقتور ثابت ہوئیکہ 1913ء میں عراق اور شام کے علاقوں میں بھی عوام کی اکثریت اس بات کی قائل ہو چکی تھی کہ انہیں واقعی اب ترک سلطنت سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ [3] اسی برس جزیرہ عرب کے قوم پرست نوجوان رہنماؤں نے مل کر پیرس میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں اس پر اتفاق کیا گیا کہ انہیں اب علیحدگی کے لیے ایک جامع منصوبے کو عمل میں لا کر اس تحریک کو کامیاب بنانا چاہیے۔

جزیرہ عرب میں قوم پرستی کی اٹھنے والی تحریک بالآخر کامیاب ثابت ہوئی۔ 1918ء میں جب پہلی جنگ عظیم اختتام کو پہنچی تو لبنان فرانس کی ماتحتی میں ایک الگ ملک بن چکا تھا۔ اسی طرح شام، عراق اور اردن کے کے علاقے بھی برطانیہ اور فرانس کے مابین تقسیم ہو چکے تھے۔ یہ نئی تقسیم 1918ء میں ہونے والے سائیکس پیکو کانفرنس کے بعد سامنے آئی تھی۔ [4] اس میں جو بات سب سے اہم ہے وہ یہ تھی کہ جزیرہ عرب کے قوم پرست رہنماؤں نے یورپی

---

[1] سلیمان المدنی، ھؤلاء حکموا سوریا (القاہرہ، دار المعارف، 2017ء) 49

[2] دکتور محمد ذوقان، تطور الحرکۃ الباطنیہ فی سوریا (بیروت، المکتبہ العلمیہ، 2014ء) 56

[3] ایضاً 110

[4] عمر عبد الحکم، الثورہ الجہادیہ فی سوریا (القاہرہ، مکتبہ طیاف، 2017ء) 37

ممالک کے ساتھ مل کر ترک سلطنت سے علیحدگی کی تحریک چلائی تھی۔ انہیں اس چیز کی یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ جزیرہ عرب کے ترک سلطنت سے علیحدگی کے بعد یہاں کے مقامی رہنما اس خطے کی قسمت کا فیصل کریں گے۔ تاہم 1914ء سے 1918ء تک جاری رہنے والی پہلی جنگ عظیم کے دوران عرب رہنما اس امید پر برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر لڑتے رہے کہ جب یہ جنگ ختم ہو گی تو یورپی طاقتیں جزیرہ عرب میں اپنے عمل دخل کو کم کر دیں گی۔ مگر 1918ء میں جب جنگ عظیم آخری مراحل میں تھی اور ترک سلطنت کی شکست واضح نظر آنے لگی تھی کہ یورپی ممالک نے باہمی سطح پر سائیکس پیکو کا معاہدہ کیا تھا جس میں جزیرہ عرب کے علاقوں کی سرپرستی کو آپس میں تقسیم کر دیا تھا۔ حیران کن امر یہ تھا کہ عرب قوم پرستوں کو اس معاہدے کی خبر ہی نہیں کی گئی تھی۔ جب روسی اخبارات نے اس کی خبر لگائی تو انہیں علم ہوا اور وہ اس پر سخت تذبذب کا شکار ہوئے، تاہم ان کے ہاتھ میں اب کچھ خاص باقی نہیں تھا۔ برطانیہ اور فرانس کے اس دھوکے پر جزیرہ عرب کے عوام میں ان کے خلاف سخت احتجاج سامنے آیا اور ایک نئی تحریک کا اعلان ہوا جس میں عہد کیا گیا کہ اس خطے سے یورپی اقوام کے قبضے کو ختم کیا جائے گا۔

اس مقصد کے لیے بیروت میں عرب رہنماؤں نے نومبر 1918ء میں ایک اجلاس منعقد کیا جس میں بالخصوص شام کے علاقے کے لیے نمائندے مقرر کیے گئے۔ اس دوران شریفِ مکہ کے بیٹے شاہ فیصل بن حسین جنھوں نے جزیرہ عرب میں ترک خلافت کے خلاف علم بلند کر رکھا تھا اور علیحدگی کی مہم میں پیش پیش رہے تھے، انہوں نے بھی برطانیہ و فرانس سے سخت احتجاج کیا۔ جب نئی تحریک اپنے ابتدائی مراحل میں ہی تھی 1919ء کے شروع میں اعلان کیا گیا کہ یورپی ممالک نے ملک شام کا اقتدار شاہ فیصل بن حسین کے سپرد کر دیا ہے۔ امیر فیصل کو بعد میں ایک معاہدے کے ذریعے عراق کا حکمران مقرر کر دیا گیا۔ وہ 1933ء تک اس کے حاکم رہے۔ ستمبر 1933ء میں وہ سوئٹزرلینڈ میں دل کے دورے کے بعد وفات پا گئے۔

1927ء سے 1970ء تک ملک شام مسلسل بدامنی اور عدم استحکام کا شکار رہا۔ اقتدار کی رسہ کشی میں قتل وغارت ہوتی رہی اور عوام کے حقوق کا استحصال کیا جاتا رہا۔ [1]

ملکِ شام عہدِ خلافت عثمانیہ میں

عثمانی خلفاء ترکوں کی ایک نسل سے نسبت رکھتے تھے۔ اس خلافت کی بنیاد عثمان بن ارطغرل بن سلیمان شاہ سلطان ماہان نے رکھی تھی۔ عثمان بن ارطغرل اپنے قبیلے کے ساتھ 1251ء میں مراکش کی جانب منتقل ہوئے تھے۔ ان کے والد اصل میں سلطان علاء الدین سلجوقی کی حمایت میں لڑتے رہے، جس کے بعد سلطان نے ارطغرل کو کچھ علاقوں پر اپنا نمائندہ بنا دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد بیٹے عثمان نے ان علاقوں کا کنٹرول سنبھالا۔ جب سلطان علاء الدین سلجوقی

---

[1] عمر عبد الحکم، الثورہ الجہادیہ فی سوریا (القاہرہ، مکتبہ طیاف، 2017ء) 84

کی وفات ہوئی تو عثمان کے زیر تسلط سارا علاقہ ان کے مکمل اختیار میں آگیا۔ انہوں نے فتوحات جاری رکھیں اور خلافت عثمانیہ کی بنیاد رکھی۔ 1326ء میں خلیفہ عثمان کی وفات ہوئی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے مراد الاول کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ ان کے بعد بایزید الاول، پھر سلطان محمد الثانی نے خلافت عثمانیہ کی باگ ڈور سنبھالی۔ سلطان محمد الثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا۔ ان کے بعد سلطان سلیم الاول اقتدار میں آئے جنہوں نے مصر اور شام تک اپنی حکومت کو وسعت دی۔[1]

سلطان سلیم الاول نے مصر اور شام کو فتح کرنے کے بعد ان علاقوں کی تفویض خان بیگ کو دیدی۔ انہوں نے مصر میں رہتے ہوئے شام میں اپنے لیے ایک نائب کو متعین کر دیا جن کا نام جان بردای الغزالی تھا۔ جب 1520ء میں سلطان سلیم الاول کی وفات ہوئی تو خلافت کے منصب پر ان کے بیٹے سلطان سلیمان الاول براجمان ہوئے۔ اس وقت شام میں جان بردای الغزالی گورنر متعین تھے۔[2] سلطان سلیم الاول کی وفات کی خبر سن کر ان کے دل میں بغاوت کے جذبے نے اٹھان بھری اور دمشق کی ترک سلطنت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ سلطان سلیمان الاول نے بغاوت کو کچلنے کے لیے فرحت باشا کی زیر سرپستی ایک لشکر بھیجا۔ جان بردی الغزالی دمشق کے قلعہ سے فرار ہوگیا۔ مگر اس کے اپنے ساتھیوں میں سے کسی نے اس کو پکڑ کو فرحت باشا کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے اس کا سر کاٹ کر خلیفہ کے دربار میں بھیج دیا۔ یہ خلافت عثمانیہ کی ماتحتی میں شام کی سرزمین پر اقتدار کے لیے ہونے والی پہلی بغاوت تھی جو ناکام بنادی گئی۔[3]

شام کی قدیم تاریخ

جب بھی کتبِ تاریخ میں ملکِ شام کا ذکر ہوتا ہے تو اس کی ابتداء عموماً طوفانِ نوح کے بعد سے ہوتی ہے۔ مؤرخین کے مطابق شام میں طوفانِ نوح کے بعد جن قبائل نے آکر بسیرا کیا ان میں ایک نسل آرامیوں کی تھی۔ یہ آرام کی اولاد تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی پانچویں اولاد تھے۔ یہ قبیلہ دمشق، بعلبک اور بقاع کے علاقوں میں آباد ہوا۔[4]

---

[1] محمد النجار، الحرب السریہ فی الشرق الاوسط (اردن، مکتبہ المنار، 2019ء) 175

[2] محمد عبد الواحد، الدکتاتوریہ محنۃ الاسلام (القاہرۃ، دارالمعارف، 2014ء) 98

[3] ایضاً 124

[4] اسعد صقر، الشرق الاوسط الجدید (بیروت، دارالحریہ، 2020ء) 36

دوسرا قبیلہ جو شام میں آکر آباد ہوا تھا وہ کنعانیوں کا تھا۔ یہ کنعان بن حام بن نوح کی اولاد تھے۔ انہوں نے صیدا[1] کے علاقے میں رہائش اختیار کی۔ اس قبیلے کی ایک شام فرات کے کنارے بھی آباد ہوئی جو حثیین کہلاتے تھے۔ اسی طرح امویوں کی ایک شاخ جبل افرام کے قریب رہائش پذیر ہوئی۔[2] یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے کچھ پہلے اردن سے ہجرت کر کے آئے تھے اور انہوں نے یہاں باسان کے نام سے مملکت قائم کی تھی۔

قدیم تاریخ میں جو قبائل شام کی سرزمین پر آکر آباد ہوئے ان میں سے ایک عبرانی بھی تھا۔ یہ عابر بن فالغ کی اولاد تھے۔ یہ پہلے دریائے فرات کی مشرقی جانب آباد ہوئے، اس کے بعد انہوں نے دریا کو عبور کر کے مغربی طرف ڈیرے ڈال لیے تھے۔ مغربی جانب یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک کلدانی تہذیب کا حصہ بن گیا جبکہ دوسرا قبیلہ قحطان یا یقطان کے نام سے مشہور تھا یہ جزیرہ عرب کے قلب میں منتقل ہو گیا۔

اس قبیلے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔[3] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہما السلام پیدا ہوئے۔ آپ کی اولاد پہلے مصر کی طرف ہجرت کر کے گئی۔ وہاں یہ چار سو سال تک رہائش پذیر رہے۔ اس کے بعد شام کی سرزمین پر واپس آ گئے۔

سرزمینِ شام کے ابتدائی قدیم آبادکاروں میں ایک قبیلہ سامرائیوں کا بھی تھا۔ یہ اصل میں بلاد کلدان سے تعلق رکھتے تھے وہیں سے آشوریوں نے انہیں جلاوطن کر دیا تھا جس کے بعد یہ شام کے علاقے سامراء[4] میں آ گئے تھے۔ یہ علاقہ انہیں کے نام سے آج بھی موجود ہے۔

قدیم مصری آثار سے اہل علم نے پتہ لگایا ہے کہ سرزمین شام پہ فراعنہ کے خاندان نے بھی وقتاً فوقتاً حکومت کی تھی۔ ان میں سے ایک اس خاندان کی اٹھارویں پشت کے بادشاہ توتمس الاول کا حملہ تھا جو اس نے شام پر سترھویں صدی عیسویں قبل المیلاد پر کیا تھا۔ وہ اس دوران دریائے فرات تک آیا تھا۔ وہاں اس نے حثیین کا قبیلہ آباد کیا تھا۔ ایک شہر کرکمیش کے نام سے آباد کیا تھا جو بطور یادگار تھا۔ اس کے بعد توتمس ثالث نے شام پر کئی حملے کیے تھے اور وہاں سے باقاعدہ سفارت کاری کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس نے شام میں بنائے گئے کئی قلعوں کی دیوراں پر اپنے حملوں کی یادگار کے طور پہ عبارتیں کندہ کرائی تھیں۔ حتیٰ کہ شام کے لوگوں سے وصول کیے جانے والے جزیے

---

[1] Masalha,Nor. Decolonizing History, Narrating the subaltern, Reclaining memory. London: Zed Books limited 115-116.

[2] خلیل مصطفی، سقوط الجولان (اسکندریہ، دارالنصر، 2015ء) 122

[3] ایضاً 138

[4] "Unesco, Samarra Archaeological city, http://whc.unesco.org

کی تفصیلات بھی رقم کی گئی تھیں۔ اسی طرح سولہوں صدی عیسوی قبل المیلاد فراعنہ خاندان کے ایک اور بادشاہ رعمسیس اول[1] نے بھی شام کی سرزمین کی طرف مہم جوئی کی تھی۔ پہلے وہ فلسطین آیا، یہاں اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد جب وہ فرات کے قریب پہنچا تو اسے ایک بہت بڑے لشکر کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کی قیادت حثیین کا قبیلہ کر رہا تھا۔ یہ لشکری اتنا بڑا اور ہتھیاروں سے اس قدر لیس تھا کہ رعمسیس نے جنگ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے حثیین سے امن کا ایک معاہدہ کیا اور واپس مصر کو روانہ ہو گیا۔

حثیین کا قبیلہ اپنی طاقت اور جنگی مہارتوں میں نہایت مشہور تھا۔ وہ مصر سے ہونے والی مہم جوئیوں کو روکنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ رعمسیس اول کے بعد اس کے بیٹے ساتی اول نے بھی شام پر حملہ کیا تھا۔ ساتی اول ماضی کی تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک طاقتور لشکر کے ساتھ آیا تھا، وہ قادسیہ کے قلعے تک پہنچا وہاں ایک جنگ ہوئی جس میں مصریوں کو فتح حاصل ہوئی اور انہوں نے قادسیہ پر قبضہ جمالیا۔ حثیین نے کچھ توقف کے بعد مصری لشکر کا دوبارہ سامنا کیا جس میں وہ فاتح ٹھہرے۔ حثیین نے قادسیہ کا قلعہ واپس لے لیا اور اس کی دیواروں پر اپنی جوانمردی کے گیت لکھے۔ اسی طرح کرنک کے علاقے میں واقع ہیکلِ آمون کی دیوروں پر بھی حثیین نے اپنی فتح کی تاریخ درج کی ہے جو آج بھی موجود ہے۔ حثیین کی مصریوں پر پے در پے فتوحات نے ان کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ وہ اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ دریائے فرات کے کنارے سے گزرنے والے مصری قافلوں پر بھی پابندی عائد کر دی تھی جو تجارت یا جنگ کی غرض سے وہاں سے گزرتے تھے۔[2]

فرعون ساتی اول کے بعد اس کا بیٹا جب مصر کے عرش پر براجمان ہوا تو اس نے بھی شام کو اپنا ہدف بنالیا۔ رعمسیس ثانی اپنے پیش رو فراعنہ سے کافی بہادر اور جنگی مہارتوں میں پختہ تھا۔ وہ بیروت تک دو دفعہ آیا اور یہاں سے مال غنیمت سمیٹ کر واپس چلا گیا۔ فرات اور قادسیہ کے قریب مصریوں کے ازلی دشمن حثیین رہتے تھے۔ انہیں مصریوں کی بار بار شام پر چڑھائی سخت ناگوار تھی۔ انہوں نے رعمسیس ثانی کو سبق سکھانے کے لیے حیلہ کیا۔ اسے خط لکھا کہ قادسیہ کے پاس کے عوام فرعون کی زیارت اور اس کی بیعت کے لیے بے تاب ہیں۔ رعمسیس ثانی نے اس بات کو سچ سمجھا اور ایک کم تعداد کے لشکر کے ساتھ شام کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب وہ قادسیہ کے قریب پہنچا تو اسے حثیین کے عظیم لشکر کا سامنا ہوا۔ جنگ ہوئی تو ابتداء رعمسیس کے لشکر کو خسارہ اٹھانا پڑا مگر فرعون کی بہادری اور جرأت کی وجہ سے اس کے لشکر میں جان آئی۔ شام تک رعمسیس کا لشکر قدرے سنبھل گیا اور ہزیمت سے دوچار ہونے سے بچ گیا۔ اگلے دن جب لڑائی شروع ہوئی تو کم تعداد ہونے کے باوجود مصری لشکر نے حثیین کے جم غفیر پر

---

[1] عبد الدائم جلالی۔ لغات القرآن

[2] سمیر قصیر، دیموقراطیۃ سوریا(القاہرہ، دارالنہار، 2018ء)77

ایسا دھاوا بولا کہ وہ بوکھلا گئے اور سینکڑوں کی تعداد میں مارے گئے۔ اس منظر کو دیکھ کر حثیین کے بادشاہ نے رعمسیس سے معافی مانگی اور صلح کی درخواست کی۔ اسے فرعون نے قبول کرلیا۔ وہاں سے مال غنیمت سمیٹا اور مصر کی جانب فاتح لوٹ گیا۔ [1]

سرزمین شام کی تاریخ میں جن واقعات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے ان میں سے ایک سکندر مقدونی کی یہاں آمد اور اس کا اثر ورسوخ بھی شامل ہیں۔ سکندر مقدونی [2] نے جب بادشاہت کا حلف اٹھایا تب اس کی عمر 20 سال تھی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد اس نے پہلے یونان کے آس پاس کے علاقوں کو زیر نگین کیا۔ اس کے بعد وہ فارس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت فارس کی تہذیب عظیم الشان اور طاقتور متصور کی جاتی تھی۔ دارا فارس کی عظیم فوج کا سپہ سالار تھا۔ سکندر مقدونی جب فارس کی افواج سے جنگ کے لیے میدان میں اترا تو اس کے سامنے تاحد نگاہ لشکری تھے۔ مگر جب جنگ ہوئی تو نتیجہ میں دارا میدان سے بھاگ گیا۔ اس کی فوج کے ایک لاکھ لوگ مارے گئے جبکہ مقابلے میں سکندر کے پانچ سو کے لگ بھگ فوجی ہلاک ہوئے تھے۔

فارس کی فوج سے لڑائی کے بعد سکندر سرزمین شام کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسے شام کی ولایتوں میں سے کسی کی جانب سے بھی مزاحمت کا سامنا نہیں ہوا۔ فارس کی افواج کو شکست دینے کے بعد سکندر کی ہیبت اس قدر لوگوں کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی کہ اس سے دوبدو ہونے کے لے کوئی تیار نہیں تھا۔ پہلے وہ شام کی ولایت جبیل پہنچا جہاں لوگوں نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ اس کے بعد ایسا ہی صیدا کی ولایت میں ہوا۔ اُس وقت شام کی سرزمین پر فارس کا اثر ورسوخ قائم تھا اور دمشق میں وہ اموال جمع ہوتے تھے جو مختلف ولایتوں سے جمع کر کے فارس کے بادشاہ کو بھیجے جاتے تھے۔ جب سکندر صیدا پہنچا تو اس نے اپنا وفد بھیج کر دمشق سے وہ اموال ودولت اٹھوا لیے۔ بعد ازاں وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ یروشلم کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس وقت وہاں یہودی آباد تھے۔ انہوں نے جب سکندر مقدونی کی آمد کی خبر سنی تو اس کے استقبال کے لیے گلیاں سجا دیں۔ ان کے مذہبی رہنما اور عوام اس کے استقبال کے لیے یروشلم سے باہر تک آئے۔ سکندر نے یہ منظر دیکھا تو اپنے گھوڑے سے اتر کر بڑے راہب کو سلام کیا اور اس کے تاج کو بوسہ دیا۔ سکندر یروشلم پہنچتے ہی سیدھا ہیکل میں گیا اور وہاں قربانی پیش کی۔ یہودی راہبوں نے اسے بتایا کہ ان کی مقدس کتاب میں پیشین گوئی درج ہے کہ ایک فاتح آئے گا جو فارس والوں کو شکست دے گا۔ سکندر اس استقبال و

---

[1] ایضاً 87

[2] Rice, Michael. Who's who in Ancient Egypt. Routledge. 165

احترام سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے یہودیوں کو اپنے مذہب کے مطابق عبادات کرنے رہن سہن اپنانے کی آزادی دیدی اور انہیں ہر سات سال بعد ایک سال کا جزیہ بھی معاف کر دیا۔[1]

یروشلم کی فتح کے بعد سکندر مقدونی نے غزہ کا رخ کیا تو وہاں کے لوگوں نے اس کا راستہ روک دیا۔ اس نے غزہ کا محاصرہ کر لیا جو دو ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران سکندر دو مرتبہ زخمی بھی ہوا۔ سرزمین شام کو مکمل طور پہ فتح کرنے اور وہاں اپنے گورنر متعین کرنے کے بعد سکندر مصر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس دوران اس کی فوج میں بہت سے یہودی لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جو یروشلم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سکندر ایک ایسی ہستی ہے جو من جانب اللہ متعین ہے۔ اس کی اعانت ثواب ہے اور اس کی فوج میں خدمت گزاری ایک مقدس فریضہ ہے۔ سکندر کی وفات کے بعد سرزمینِ شام آہستہ آہستہ یونانی اثر ورسوخ سے باہر آگئی اور یہاں کے لوگوں نے کچھ وقت کے بعد جزیہ دینا بند کر دیا۔

مسلمانوں کا سرزمین شام سے ربط

مسلمانوں کا سرزمینِ شام سے والہانہ تعلق بہت پہلے سے ہے۔ اس کی وجہ انبیاء کرام کا وہاں مبعوث ہونا ہے۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر موجود ہے اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ صحابہ کرام کو سرزمینِ شام کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کا اس سرزمین سے متعلق ایک جذباتی تعلق اسلام کی آمد کے وقت سے ہی قائم ہو گیا تھا۔ لیکن سات ہجری کا سال ایسا موقع ہے جب مدینہ کی ریاست کا ملک شام کے ساتھ پہلا حقیقی ربط قائم ہوتا ہے۔[2] یہ غزوہ موتہ کے وقت قائم ہوا تھا۔

ہجرتِ رسول ﷺ کے ساتویں برس میں مدینہ ایک ایسی ریاست کے طور پہ سامنے آچکا تھا کہ جو جزیرہ عرب میں ایک خودمختار اور طاقتور ریاست سمجھی جاتی تھی۔ مکہ کے قریش کی جانب سے ماضی میں پے درپے کی جانی والی سازشیں بے وقعت ہو چکی تھیں۔ وہ یہ جان چکے تھے کہ اب مدینہ منورہ کی نومولود ریاست کو ختم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی جنگوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو زیرِ نگیں کرنا ممکن رہا ہے۔ اسی طرح تجارتی لحاظ سے بھی مسلمان کافی مضبوط ہو چکے تھے۔ مدینہ کے یہود کا قضیہ بھی نمٹایا جا چکا تھا اور منافقین بھی طشت از بام ہو چکے تھے۔[3] ایسے میں رسول ﷺ نے یہ ضروری خیال فرمایا کہ اب حجاز کے ایک مخصوص جغرافیہ سے نکل کر مدینہ منورہ کی ریاست کو متعارف کرایا جائے اور وہ وقت اب آن پہنچا ہے کہ مسلمان روایتی حریفوں سے مقابلے کی کیفیت سے باہر نکلیں اور

---

[1] سمیر قصیر، دیموقراطیة سوریا (القاہرہ، دارالنہار، 2018ء) 98

[2] حسام ہرہوری، تصورات الاحزاب المغربیہ للاصلاح السوری (بیروت، مکتبہ الحیاۃ، 2019ء) 38

[3] یوسف سیوفی، ذکری استقلال سوریا (بیروت، دارالامان الجدیدہ، 2017ء) 185

دین اسلام کو اس سے باہر علاقوں تک متعارف کرائیں۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملک شام کی طرف ایک لشکر بھیجا جائے۔

غزوہ موتہ کی تیاری کب شروع کی گئی تھی اس کے بارے میں دو روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت میں یہ آتا ہے رسول ﷺ نے جب خیبر میں یہود کو شکست دیدی تھی تو اس کے بعد موتہ کے لیے تیاری شروع کر دی گئی تھی جبکہ دوسری روایت کے مطابق اس جنگ کا فیصلہ عمرہ قضاء کے بعد کیا گیا تھا۔ بہر طور یہ جنگ موتہ کے لیے تیاری کا فیصلہ ایسے وقت میں ہوا جب مسلمان اپنی طاقت کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ پہلی روایت کے حسبِ حال یہود کو شکست دینا ایک بڑی کامیابی تھی جبکہ دوسری روایت کے حسبِ حال قریش کو زیر کرنے کا مطلب اپنے بڑے اور خطرناک حریف کو ہزیمت سے دوچار کرنا تھا جس سے مسلمانوں کے اندر حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ اب وہ حجاز سے باہر قدم رکھ سکتے ہیں۔

جب مسلمانوں نے سرزمین شام کی طرف دین اسلام کی شوکت کو بڑھانے کا ارادہ کیا تو اس وقت دو مزید ایسے واقعات بھی سامنے آ چکے تھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ سے باہر مسلمان کس طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ ایک تو یہ آپ ﷺ بازنطینی بادشاہت کے سربراہ ہرقل کو ایک خط لکھ چکے تھے جس میں اسے دین اسلام کی جانب دعوت دی گئی تھی۔ روایات کے مطابق جس قاصد کو پیغام دے کر بھیجا گیا تھا اسے ہرقل نے قتل کرا دیا تھا۔ ہرقل کی اس حرکت کے بعد یہ مسلمانوں میں ملک شام کے بارے میں کوئی اچھے جذبات نہیں پائے جاتے تھے اور قاصد کا قتل ایک ایسا اقدام تھا جو کسی تہذیب میں بھی ناقابل قبول تھا۔ دوسرا یہ اس وقت بازنطینی بادشاہت تازہ تازہ فارس کے ساتھ جنگ سے فارغ ہوئی تھی جس سے ان کے اندر یہ زعم قوی ہو گیا تھا کہ وہ کسی بھی مدمقابل کو شکست دیدیں گے۔ تب مسلمان حجاز میں اپنی دھاک بٹھا چکے تھے اور اطراف کے سلطنتوں میں یہ باتیں ہونے لگی تھی کہ اس نئے دین کا راستہ کیسے روکا جائے۔ یوں مدینہ منورہ سے مسلمانوں کی مڈبھیڑ یقینی ہو چکی تھی جس سے اعراض ممکن نہیں تھا۔[1] بالخصوص ان سلطنتوں کے بادشاہوں کو خط لکھنے کا واضح مطلب یہ بھی تھا کہ مسلمان ان میں دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ اس طرف نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان خطوط میں آپ ﷺ نے انہیں کوئی دھمکی نہیں دی تھی لیکن یہ ایک واضح اشارہ ضرور تھا کہ مسلمان ان سے غافل نہیں ہیں۔

غزوہ موتہ میں مسلمان لشکر کی تعداد شامی لشکر کے مقابلے میں انتہائی کم تھی۔ مگر مسلمان جانبازی سے لڑے اور اس معرکے میں تین قائدین شہید ہو گئے۔ حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اس معرکے میں یکے بعد دیگرے سپہ سالار کے طور پہ سامنے آئے اور شہید ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے جھنڈے کو گرنے نہیں دیا۔ روایات کے مطابق اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی لیکن بہت

---

[1] ابن خلکان، وفیات الاعیان (بیروت، المکتبہ العلمیہ، 2001ء) 3/222

سارے صحابہ کرام شہید ہوئے۔اس جنگ کے بعد مسلمانوں کی سیاسی اور جنگی قوت ایک ایسی شکل میں ابھر کر سامنے آئی جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بازنطینی اور فارسی سلطنتیں یہ جان گئیں کہ مسلمان اب ان کے مقابل طاقت بن چکے ہیں جو اس وقت سب سے بڑا خطرہ ہیں۔اس کے بعد غزوہ تبوک بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور یہ وہ موقع تھا جب حجاز سے باہر مسلمانوں کی دھاک قائم ہو گئی تھی اور بازنطینی بادشاہت سکڑنے لگی تھی۔ بعد میں حضرت عمرؓ کے عہد تک سرزمین شام مکمل طور پہ مسلمانوں کے زیر نگین آگئی تھی۔ خلافت راشدہ کے بعد جب اموی دور شروع ہوا تو شام کو دارالحکومت بنایا گیا۔ حضرت معاویہؓ نے ملک شام کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ سرزمین شام جو ایک عرصے تک بازنطینی تہذیب کا گڑھ رہی تھی اور یہاں کئی دیگر سلطنتیں قائم رہ چکی تھیں اب مسلمانوں کے زیرِ تسلط آگئی تھی۔[1] یہ چیز مسلمانوں کے لیے بہت بڑی کامیابی اور شان شوکت کی علامت بن گئی تھی۔

موجودہ شام کی حالت

اس سرزمین کی خاص فضیلت قرآن وحدیث میں مذکور ہے۔ اسی مبارک سرزمین کی طرف حضرت امام مہدی حجاز مقدس سے ہجرت فرماکر قیام فرمائیں گے اور مسلمانوں کی قیادت فرمائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی اسی علاقہ یعنی دمشق کے مشرق میں سفید مینار پر ہو گا۔ غرضیکہ یہ علاقہ قیامت سے قبل اسلام کا مضبوط قلعہ ومرکز بنے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے جزیرۂ عرب کے باہر اگر کسی ملک کا سفر کیا ہے تو وہ صرف ملک شام ہے۔ فرمان رسول ﷺ کے مطابق شام کی سرزمین سے ہی حشر قائم ہو گا۔[2]

قرآن وسنت میں جہاں بھی ملک شام کا تذکرہ وارد ہوا ہے اس سے یہ پورا خطہ مراد ہے جو عصر حاضر کے چار ملکوں (سوریا، لبنان، فلسطین اور اردن) پر مشتمل ہے۔ موجودہ دور کے ملک شام (عربی میں سوریہ یا سوریا، انگریزی میں Syria)کا مکمل نام جمہوریہ عربیہ سوریہ ہے۔ اس کے مغرب میں لبنان، جنوب مغرب میں فلسطین اور اسرائیل، جنوب میں اردن، مشرق میں عراق اور شمال میں ترکی ہے۔ موجودہ دور کا ملک شام یعنی سوریا 1946 میں فرانس کے قبضہ سے آزاد ہوا تھا، جن میں اکثریت سنی عربوں کی ہے۔ سیریائی، کرد، ترک اور دروز بھی تھوڑی تعداد میں موجود ہیں۔ دارالسلطنت دمشق اس خطہ کا قدیم ترین شہر ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسلمانوں نے اس علاقہ کو فتح کیا۔ دمشق کے فتح ہونے کے صرف 26 سال بعد دمشق اسلامی حکومت کا دارالسلطنت بن گیا۔ بنو امیہ کی حکومت کے خاتمہ یعنی 132ھ تک دمشق ہی اسلامی حکومت کا مرکز بنا رہا۔ 132ھ

---

[1] طالب الدغیم، النہضہ فی سوریا،144، مکتبۃ العرب، بیروت، 2018ء

[2] ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، سنن ترمذی، حدیث نمبر 2424، بیروت، دار صادر، 2004ء

میں بنوعباسیہ کی حکومت کے قیام کے بعد بغداد (عراق) مسلمانوں کی حکومت کا مرکز بن گیا۔ ملک شام میں دین اسلام پہونچنے تک تقریباً 1500 سال سے سریانی زبان ہی بولی جاتی تھی، لیکن ملک شام کے باشندوں نے انتہائی خلوص ومحبت کے ساتھ دین اسلام کا استقبال کیا اور بہت کم عرصہ میں عربی زبان ان کی مادری واہم زبان بن گئی، بڑے بڑے جید محدثین، فقہاء وعلماء کرام اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔ سوریا میں 92 فیصد سے زیادہ مسلمان اور تقریباً 8 فیصد عیسائی اور دروز ہیں۔ زبان کے اعتبار سے 85 فیصد لوگ عربی النسل ہیں، جبکہ کرد لوگ 10 فیصد اور دیگر لوگ 5 فیصد ہیں۔[1]

19ویں صدی عیسوی کے شروع تک ملک شام عثمانی حکومت کے تحت رہا مگر جلد ہی شام کا زیادہ تر علاقہ فرانسیسیوں نے قبضہ کرلیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد فرانس اور برطانیہ کافی کمزور ہوگئے تھے، چنانچہ انہوں نے عالمی پیمانہ پر اپنی کمزور پوزیشن دیکھ کر اپنی فوج کو ملک شام سے واپس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح 17 اپریل 1946ء کو سوریا آزاد ہوگیا۔ 1946ء سے 2011 تک یہ ملک مختلف عروج وزوال سے گزرا۔ 1948 اور 1967ء میں سوریا نے عربوں کے ساتھ مل کر اسرائیل سے ہوئی جنگ میں حصہ لیا۔ 1973ء میں سوریا نے مصر کے ساتھ مل کر اسرائیل سے جنگ لڑی۔ 13 نومبر 1970ء کو اُس وقت کے وزیر دفاع حافظ الاسد نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ 20 جون 2000 کو حافظ الاسد کے اچانک انتقال پر 30 سالہ ان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔[2] اس کے بعد ان کے بیٹے بشار الاسد نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، حالانکہ آئین کے مطابق وہ ملک کے صدر نہیں بن سکتے تھے کیونکہ اُن کی عمر کم تھی، چنانچہ بیٹے کو باپ کی جگہ تخت نشین کرنے کے لیے آئین میں ترمیم کی گئی اور اتنی عمر لکھی گئی جتنی عمر میں بشار الاسد اُس وقت موجود تھے۔ غرضیکہ صرف 34 سال کی عمر میں ملک کے سب سے بڑے عہدہ پر معیّن کردیا گیا۔

---

[1] ایلیاد سوقی، المقاومہ الاھلیہ فی سوریا،96

[2] تامر الصیام، الہلال الخضیب،65

فصل دوم

ملکِ شام کی اہمیت و فضیلت

بلادِ شام تاریخ انسانی میں قدیم سلسلہ ہائے نبوت و رسالت اور مصاحفِ آسمانی کے حوالے سے فضیلت رکھنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے قرآن وحدیث کی رو سے بھی انتہائی قابلِ تعظیم اور اہم خطہ ہے۔

تاریخ میں جس خطے کو "بلادِ شام" کہا گیا ہے۔ اس میں حالیہ ملک شام، فلسطین، لبنان اور اردن کے بعض حصے شامل ہیں۔ انگریز مورخ اس خطے کوThe Levant کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔[1] موجودہ ملک شام 1946 میں فرانس کے قبضے سے آزاد ہونے کے بعدSyria یاشام کے نام سے معروف ہوا۔

اس سرزمین شام یعنیThe Levant پر قدیم انبیائے کرام علیھم السلام کے علاوہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد عظیم صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کے قدم پڑے ہیں۔

اسلامی روایت و تاریخ میں فلسطین بھی شام کا حصہ شمار ہوتا رہاہے۔ فلسطین کی مسجد اقصی کے بے شمار فضائل ہیں، یہ مسلمانوں کا قبلہ اول ہے اور دنیا کی دوسری مسجد ہے جو کعبہ کے بعد بنائی گئی اس کے بنانے والے انبیاء ہیں۔ نبی ﷺ نے معراج میں اس کا سفر کیا اور زیارت کے طور پر یہاں پر سفر کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ یہاں پر ایک وقت کی نماز ڈھائی سو نماز کے برابر ہے۔ یہاں پر اللہ تعالی نے بے پناہ برکت رکھی ہے اور یہ مقدس سرزمین ہے۔

نبی ﷺ نے نبوت سے پہلے دومرتبہ ملک شام کا سفر کیا۔ ایک مرتبہ اپنے چچاکے ساتھ جو بحیرہ راہب کے واقعہ کے ساتھ معروف ہے۔ دوسری مرتبہ حضرت خدیجہ کا مال لیکر تجارت کی غرض سے۔

شام ہمیشہ علم وفن اور نور نبوت سے منور رہاہے ۔ یہاں بہت سارے انبیاء آئے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے ساتھ عراق سے شام کا سفر کیااور یہیں سے اللہ کے حکم پر سیدہ ہاجرہ اوراسماعیل علیہ السلام کو لق ودق صحرا میں چھوڑنے کے لئے سفر کیا تھا۔ آپ کے بعد اسحاق علیہ السلام ،یعقوب علیہ السلام ، ایوب علیہ السلام ، داوٗد علیہ السلام ، سلیمان علیہ السلام ، الیاس علیہ السلام ، الیسع علیہ السلام ، زکریاعلیہ السلام ، یحی علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام آئے۔

[1] ذکری استقلال سوریا،184

نبی ﷺ نے اسامہ بن زید کو ایک لشکر دے کر اس کی طرف روانگی کا حکم دیا تھا مگر عین وقت پر آپ کی بیماری کی وجہ سے یہ لشکر روانہ نہ ہو سکا۔ آپ کی وفات کے بعد بغیر تاخیر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ کو لشکر کے ساتھ روانہ کیا اور فتح یابی سے ہمکنار ہوا۔ عہد فاروقی میں بیت المقدس فتح ہو گیا۔[1]

مسلم مفکرین کی سرزمین

اسی سرزمین میں امام نووی شارح صحیح مسلم[2]، شیخ الاسلام ابن تیمیہ[3]، علامہ ابن القیم[4]، حافظ ابن عساکر[5] اور حافظ ابن حجر عسقلانی[6] وغیرہ جیسے علماء وفضلاء پیدا ہوئے۔ یہاں بہت سارے انبیاء، بہت سارے علماء و محدثین اور بہت سارے صحابہ کرام مدفون ہیں۔

اسلامی فتوحات سے پہلے دراصل شام ہی دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور کا پایۂ تخت رہا ہے۔ یہیں سے رومن شہنشاہ ایشیا، یورپ اور افریقہ کے ایک بڑے خطے پر قائم اپنی ایمپائر کا انتظام و انصرام کرتا تھا، جو کہ اس جگہ کی جغرافیائی اہمیت کی ایک واضح دلیل ہے۔ بیرونی فتوحات میں انبیاء کی یہ سرزمین اہل اسلام کے لیے پہلا خدائی تحفہ تھا۔

اس کے بعد تین صدی تک رومنوں کی بازنطینی ایمپائر کے ساتھ عباسی خلفاء اور بعد ازاں کچھ علاقائی امارتوں کی مسلسل جنگ رہی تو اس کا بیس کیمپ بڑی حد تک شام ہی رہا۔ اس لحاظ سے، شام مجاہدین سے کبھی خالی نہ رہا۔ اسلام کے دور عروج میں بھی شہادت کے متلاشی صدیوں تک اسی جگہ کو اپنا مستقر بناتے رہے۔ پھر جب مسلم قوت کے کمزور پڑ جانے کے بعد صلیبی یلغاریں شروع ہوئیں تو یہی خطہ اب ان کی دست درازی کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا ہدف تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں بیت المقدس اور فلسطین کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا اور بقیہ شام لینے کے لیے صلیبی افواج بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔

حطین[7] درحقیقت سات عشرے سے مسلسل جاری جہادی عمل کا نقطۂ عروج تھا۔ مگر اس کے بعد بھی کوئی دو سو سال تک ایوبی سلاطین اور پھر ممالیک، صلیبی حملوں کے مدمقابل یہیں پر معرکہ آرا رہے اور امت کے لیے خدائی نصرت کا ذریعہ بنتے رہے۔

---

[1] دکتور محمد ذکان، ذکری استقلال سوریا، (بیروت المکتبۃ العلمیہ، 2014ء)، 155

[2] Encyclopedia of Islam

[3] Ibn Taymiyya and histimes, oxford unis press, p121

[4] Lirnat Holtman. Ibn Qayyim al Jawziyyah Barllan university:219

[5] Encyclopedia of Islam

[6] ایضاً

[7] Palmer, 1881, P.126

چنانچہ شام خصوصاً فلسطین کے علاوہ شاید ہی کوئی خطہ ہو جس کو اتنی صدیاں اس تسلسل اور اس شدت کے ساتھ 'ارضِ رِباط' بنا رہنے کا شرف حاصل رہا ہو، اور وہ بھی امت کے ایک نہایت فیصلہ کن محاذ کے طور پر۔ [1]

یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری میں جب تاتاریوں کا سیلاب قریب قریب پورے عالم اسلام کو غرقاب کر چکا تھا، اور بغداد کے دارِ خلافت کو تہس نہس کر چکا تھا تو صرف شام کا کچھ خطہ اور مصر باقی رہ گیا تھا جو ابھی تک مسلم حکمرانی کا حصہ تھے۔ تاتاریوں کی یلغار کے سامنے 'مصر' اب عالم اسلام کی آخری امید رہ گئے تھے۔ تب سلطان العلماء عز الدین بن عبد السلامؒ کے زیر تحریک، مملوک سلطان سیف الدین مظفر کی قیادت میں مصر سے اسلام کا ایک لشکر اٹھا اور ہلاکو کے نائب کتبغا کے زیر قیادت شام میں پیش قدمی کرتی ہوئی تاتاری افواج سے مقابلہ کے لیے فلسطین کے تاریخی مقام 'عین جالوت' [2] کا انتخاب کیا۔ معرکۂ عین جالوت کے نتیجہ میں پہلی بار مسلم دنیا 'اہل اسلام کے ہاتھوں تاتاریوں کو شکست فاش' ہونے کی خبر سنتی ہے۔ معرکۂ عین جالوت کی بابت ہی سلطان قطز کا یہ تاریخی نعرہ مشہور ہے 'وا اسلاماہ' کہ 'ہائے، اسلام گیا!'۔

قرآن کریم میں ارضِ شام کی اہمیت وفضیلت

سرزمین شام قرآن میں بطور ارضِ مقدس اور بابرکت زمین شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اپنی کتاب "مناقب الشام واھلہ" کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

کتاب وسنت اور آثار علماء سے شام اور اس کے باشندوں کے فضائل ومناقب ثابت ہیں، یہ وہ ملک ہے، جو تاتاریوں کے حملے میں مسلمانوں کی ترغیب کا باعث بنا، اور مسلمانوں نے مصر کی جانب راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے دمشق میں ہی پناہ لی۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

(وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ) [3]

ترجمہ: اور ہم ابراہیم اور لوط کو بچا کر اس زمین کی طرف لے چلے جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لئے برکت رکھی تھی۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: آیت میں برکت والی سرزمین سے مراد ارض شام ہے، یہی روایت مجاہد، ابن زید اور ابن جریج سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کے لیے ارض مبارکہ کو نجات گاہ بنایا تھا، اور

---

[1] یوسف سیوفی، تطور الحرکۃ الباطنیہ فی سوریا، 36

[2] ابو شامل، جنگ عین جالوت، تاریخ ساز معرکہ۔ آزاد دائرہ معارف۔ ویکیپیڈیا

[3] الانبیاء: 71

بلاد شام سے سرزمین فلسطین کا انتخاب فرمایا، شیخ سعدیؒ آیت بالا کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "آیت میں برکت والی زمین سے مراد شام ہے، کیونکہ اکثر انبیاء کا تعلق اسی سرزمین سے تھا،اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کے لیے مقام ہجرت بنایا،اور اسی سرزمین میں اس کے گھروں میں سے ایک گھر بیت المقدس ہے"۔ مسجد اقصی اُسی سرزمین میں واقع ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بابرکت بنایا: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَاۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ)[1]

ترجمہ: پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے، اس لئے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں، یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی کو اپنی قوم کے ساتھ سرزمین شام کی جانب جانے کا حکم دیا تھا، لیکن قوم نے داخل ہونے سے انکار کیا: ارشاد ہے:

(يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّـهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ)[2]

ترجمہ: اے میری قوم والو! اس مقدس زمین میں داخل ہوجاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے نام لکھ دی ہے اور اپنی پشت کے بل روگردانی نہ کرو کہ پھر نقصان میں جا پڑو بلاد شام اللہ کے نیک بندوں کی میراث ہے، ارشاد باری ہے:

(وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا)[3]

ترجمہ: اور ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے۔ اس سرزمین کے پورب پچھم کا مالک بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو حکم دیا تھا کہ وہ ہواؤں کو ارض مبارک یعنی شام کی جانب رخ کرنے کا حکم دیں:

(وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَاۚ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِينَ)[4]

ترجمہ: ہم نے تند و تیز ہوا کو سلیمان (علیہ السلام) کے تابع کر دیا جو اس کے فرمان کے مطابق اس زمین کی طرف چلتی تھی جہاں ہم نے برکت دے رکھی تھی، اور ہم ہر چیز سے باخبر اور دانا ہیں۔

---

[1] الاسراء:1

[2] المائدہ:21

[3] الاعراف:137

[4] الانبیاء:81

ابن جریر طبری کہتے ہیں: سلیمان علیہ السلام کے حکم سے ارض مبارک کی ہوائیں چلتی تھیں، اورارض مبارک سے مراد ملک شام ہے۔

احادیث مبارکہ میں ارضِ شام کی اہمیت وفضیلت

شام میں سکونت اختیار کرنے کی وصیت:

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے: فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سَتَخْرُجُ نَارٌ مِنْ حَضْرَ مَوْتَ أَوْ مِنْ نَحْوِ حَضْرَ مَوْتَ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ تَحْشُرُ النَّاسَ، قَالُوا: يَا رَسُوْلَ اللهِ فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: "عَلَيْكُمْ بِالشَّامِ"[1]
اخیر زمانے میں حضر موت سے تم پر ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو اکھٹا کرے گی، صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ایسے وقت آپ کا ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: شام کا رخ کرنا۔

حضرت عبد اللہ بن حوالہؓ سے مروی ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سَيَصِيْرُ الْاَمْرُ إِلٰى أَنْ تَكُوْنُوا جُنُوْدًا مُجَنَّدَةً جُنْدٌ بِالشَّامِ وَ جُنْدٌ بِالْيَمَنِ وَ جُنْدٌ بِالْعِرَاقِ' قَالَ ابْنُ حَوَالَةَ خِرْ لِيْ يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنْ أَدْرَكْتُ ذٰلِكَ، فَقَالَ: عَلَيْكَ بِالشَّامِ فَإِنَّهَا خِيَرَةُ اللهِ مِنْ أَرْضِهِ يَجْتَبِيْ إِلَيْهَا خِيَرَتَهُ مِنْ عِبَادِهِ، فَأَمَّا إِنْ أَبَيْتُمْ فَعَلَيْكُمْ بِيَمَنِكُمْ، وَ اسْقُوْا مِنْ غُدُرِكُمْ، فَإِنَّ اللهَ تَوَكَّلَ لِيْ بِالشَّامِ وَ أَهْلِهِ"۔[2] "عنقریب ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب تمہارے لشکر الگ الگ ہو جائیں گے۔ ایک لشکر شام میں ہوگا تو ایک یمن میں اور ایک عراق میں۔ ابن حوالہ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ اگر میں اس وقت کو پاؤں تو فرمایئے میں کس لشکر میں جاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم سرزمین شام کو (سکونت کے لئے) اختیار کرنا کیونکہ سرزمین شام اللہ تعالیٰ کی زمین میں بہترین زمین ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قطعہ ارضی میں اپنے بہترین بندوں کو چن کر اکٹھا فرمائے گا" اگر تجھے یہ منظور نہ ہو تو پھر یمن کو اختیار کرنا اور اپنے حوضوں سے پانی پلاتے رہنا۔ اللہ تعالیٰ نے میری خاطر ملک شام کی اور اہل شام کی کفالت فرمائی ہے۔"

نیز نبی کریم ﷺ نے اہل شام سے متعلق وصیت فرماتے ہوئے فرمایا: تم سرزمین شام کو (سکونت کے لئے) اختیار کرنا کیونکہ سرزمین شام اللہ تعالیٰ کی زمین میں بہترین زمین ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قطعہ ارضی میں اپنے بہترین بندوں کو چن کر اکٹھا فرمائے گا۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے اہل شام کو قیامت تک اللہ کے حکم کے قائم کرنے اور قیامت تک ان میں طائفہ منصورہ کے وجود کی وجہ سے امتیازی طور پر ذکر فرمایا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اہل شام سے متعلق اس

---

[1] صحیح البانی، رقم الحدیث: 4285

[2] صحیح المسلم، رقم الحدیث: 5067

طرح فرمانا ان میں دائمی کثرت و قوت کے ہونے کی دلیل ہے، اہل شام کے علاوہ اسلام کی کسی زمین کے باشندوں میں یہ وصف بیان نہیں کیا گیا، حالانکہ سرزمین حجاز ایمان کا اصل مرکز ہے، لیکن آخری زمانے میں وہاں بھی علم، ایمان، نصرت اور جہاد کم ہو جائے گا، یمن، عراق اور مشرق میں بھی یہی صورتحال ہو گی، لیکن شام میں علم و ایمان باقی رہے گا اور اس کے لیے لڑنے والوں کو ہر وقت تائید و نصرت حاصل رہے گی۔[1]

ملک شام پر فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں:

صحابیِ رسول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: آپ ﷺ نے فرمایا: "طُوبٰى لِلشَّامِ، فَقُلْنَا: لِأَيٍّ ذٰلِكَ يَارَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ لِأَنَّ مَلَاءِكَةَ الرَّحْمٰنِ بَاسِطَةٌ اَجْنِحَتَهَا عَلَيْهَا"۔[2] "شام کیلئے بھلائی ہے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس وجہ سے۔ آپ نے فرمایا: اس لئے کہ رحمن کے فرشتے ان پر اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں"۔

فتنوں کے دور میں ایمان شام میں ہو گا:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "بَيْنَا اَنَا نَائِمٌ إِذَا رَأَيْتُ عُمُوْدَ الْكِتَابِ احْتَمِلَ مِنْ تَحْتِ رَأْسِيْ فَظَنَنْتُ أَنَّهُ مَذْهُوْبٌ بِهِ فَاَتْبَعْتُهُ بَصَرِيْ فَعُمِدَ بِهِ إِلَى الشَّامِ أَلَا وَإِنَّ الْإِيْمَانَ حِيْنَ تَقَعُ الْفِتَنُ بِالشَّامِ"۔[3] "میں نے دیکھا کہ میرے تکیے کے نیچے سے کتاب کا ایک بنیادی حصہ مجھ سے واپس لیا جا رہا ہے۔ میری نظروں نے اس کا تعاقب کیا، ادھر سے بہت نور پھوٹ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شام میں رکھ دی گئی ہے۔ پس جب فتنے رونما ہوں تو ایمان شام میں ہو گا"۔

جب اہل شام فساد کا شکار ہو جائیں تو پھر مسلمانوں میں کوئی خیر نہیں:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إِذَا فَسَدَ أَهْلُ الشَّامِ فَلَا خَيْرَ فِيْكُمْ، لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِيْ مَنْصُوْرِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ"۔[4] "جب اہل شام فساد کا شکار ہو جائیں تو پھر تم میں کوئی خیر نہیں۔ میری امت میں سے ایک طبقہ نصرت مند رہے گا، جو لوگ ان کو بے یار و مددگار چھوڑیں گے وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ پائیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے"۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارض مقدس کے رہنے والوں کے فساد کا شکار ہونے پر امت کے خیر کی نفی فرمائی۔

اہل شام کے لیے رسول کریم ﷺ کی برکت کی دعا:

---

[1] امام ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی (بیروت، المکتبہ العلمیہ، 2001ء) 4/449

[2] سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 2483

[3] مسند احمد، رقم الحدیث: 1827

[4] صحیح المسلم، رقم الحدیث: 5067

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْ شَامِنَا وَفِیْ یَمَنِنَا، قَالُوْا: یَارسُوْلَ اللہِ وَفي نَجْدِنَا؟ قَالَ: اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْ شَامِنَا وَفِیْ یَمَنِنَا، قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللہِ وَفِیْ نَجْدِنَا؟فَاَظُنَّہٗ قَالَ فِی الثَّالِثَۃِ: ھُنَاکَ الزَّلَازِلُ وَالْفِتَنُ وَبِھَا یَطْلُعُ قَرْنُ الشَّیْطَانِ"۔ [1]

اے اللہ ہمارے (ملک) شام میں برکت عطا فرما! اے اللہ ہمارے یمن میں برکت عطا فرما! صحابہ نے کہا: اور ہمارے نجد میں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ ہمارے (ملک) شام میں برکت عطا فرما! اے اللہ ہمارے یمن میں برکت عطا فرما! صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! اور ہمارے نجد میں؟ صحابہ کا ارادہ تھا کہ آپ اہل نجد کے لیے بھی دعا کریں، لیکن آپ نے ان کے لیے دعا نہیں فرمائی، البتہ یہ فرمایا: یہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور یہیں سے شیطان کی سینگ طلوع ہوگی"۔

شام سرزمین ہے حشر کی اور نشر کی:

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الشام أرض المحشر و المنشر."

شام حشر اور نشر کی سرزمین ہے۔ [2]

آخری زمانے میں بلاد شام خلافت اسلامیہ کا مرکز ہوگا:

ابو حوالہ ازدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے میرے سر پر یا میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا پھر فرمایا: یا ابنَ حوالۃَ، إذا رأیتَ الخلافۃَ قد نزَلَت أرضَ المقدَّسۃِ فقد دنَتِ الزَّلازِلُ والبَلابلُ والأمُورُ العِظامُ، والسَّاعۃُ یومَئذٍ أقرَبُ منَ النَّاسِ من یدي ھذِہِ من رأسِکَ۔ [3]

اے ابن حوالہ! جب دیکھو کہ ارض مقدسہ میں خلافت قائم ہو چکی تو اس دن زلزلے، بلائیں، مصیبتیں، بڑے بڑے حادثات، اور قیامت لوگوں سے اس سے زیادہ قریب ہونگے جتنا میرا ہاتھ تمہارے سر سے قریب ہے۔

عسقلان شام کی سرحدوں میں سے ایک سرحد ہے:

---

[1] صحیح بخاری، حدیث نمبر: 1037

[2] مسند بزار، رقم الحدیث: 3965

[3] ابو داؤد، رقم الحدیث: 2535

حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**أول هذا الأمر نبوة ورحمة، ثم يكون خلافة ورحمة، ثم يكون ملكا ورحمة، ثم يكون إمارة ورحمة، ثم يتكادمون عليه تكادم الحمر فعليكم بالجهاد، وإن أفضل جهادكم الرباط، وإن أفضل رباطكم عسقلان**"۔[1]

سب سے پہلے نبوت ور حمت ہو گی، پھر خلافت اور رحمت ہو گی، پھر ملوکیت اور رحمت ہو گی، پھر لوگ اس پر گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے، لہذا (اس وقت) تم پر جہاد لازمی ہو گا، اور تمہارا رباط میں جہاد کرنا افضل ہو گا، اور تمہارا افضل رباط عسقلان ہو گا۔

'رباط' کا مطلب ہے آدمی کا حالتِ جنگ کیلئے کسی جگہ پر تیار اور حاضر پایا جانا۔ اس کیفیت میں ہونا کہ جنگ اب چھڑ سکتی۔ یا یہ کہ آدمی کو کسی جھڑپ کیلئے ابھی طلب کر لیا جائے گا یا ذرا ٹھہر کر۔ جنگ کے لئے آدمی کا محاذ پر ہونا اور مورچہ زن ہو رہنا۔

ایک حدیث میں ہے: **رِبَاطُ يَوْمٍ في سبيل الله خيرٌ مِّنَ الدُّنيَا وَمَا عَلَيهَا** (متفق علیہ) "اللہ کے راستے میں ایک دن کا رباط دنیا ومافیہا سے بہتر ہے"۔[2]

عسقلان ایک مشہور جگہ ہے، تاریخ میں اسے عروس الشام کہا گیا ہے، اور فلسطین کے شہروں سے متعلق انسائیکلوپیڈیا میں تحریر ہے: عسقلان اپنی طویل تاریخ میں معیشت کا حامل ایک ساحلی شہر شمار کیا جاتا رہا، اس کی سمندری بندر گاہ اور فلسطین و مصر کی سرحدوں سے قریب اس کے اسٹر ٹیجک جائے وقوع کی وجہ سے اس شہر کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے، سمندر سے گذرنے والے تمام تجارتی اور جنگی قافلوں کو اسی شہر سے گذرنا پڑتا ہے۔ تاریخ میں کوئی بھی لشکر عسقلان پر کنٹرول حاصل کیئے بغیر فلسطین کو فتح نہیں کر سکا، اسی طرح اسلامی ادوار میں بھی عسقلان کی اہمیت میں کمی نہیں آئی۔

اوپر بیان کردہ احادیث مبارکہ سے حضور نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالی کے عطا کردہ علمِ غیب سے مسلمانوں کی بھرپور رہنمائی فرمادی ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ صورتحال کی جانب یہ آپ کا اشارہ تھا کہ مسلمان اختلاف اور آپسی خلفشار کی وجہ سے اقتدار کے لیے لڑیں گے۔

بلاد شام کی قدیم تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سرزمین ہر زمانے میں اسٹر ٹیجک اہمیت کی حامل رہی، اور اس پر کنٹرول حاصل کرنے سے مراد فلسطین کے شمالی و جنوبی اور مشرقی تمام علاقوں تک اپنا کنٹرول آسان کرنا ہے۔

---

[1] المعجم الكبير الطبرانی، رقم الحدیث: 3270

[2] سنن نسائی، حدیث نمبر: 2377

مذکورہ بالا ساری تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارض شام کو اللہ تعالی نے خاص فضیلت سے نوازا ہے۔ لہذا اس کا بحران صرف ملک شام کا بحران نہیں ہے بلکہ امت مسلمہ کا بحران ہے جس کو حل کرنے کے لیے تمام مسلم قیادت کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

باب دوم

شام کے موجودہ بحران کی نوعیت / وسعت

فصلِ اول

سیاسی بحران

موجودہ بحران پر ایک طائرانہ نظر

2011 سے شروع ہوئی اس جنگ میں اب تک پانچ لاکھ سے زیادہ افراد قتل کر دئے گئے ہیں، جبکہ پانچ لاکھ افراد زخمی یا گمشدہ ہیں۔ صرف دو کروڑ آبادی والے اس ملک کے 70 لاکھ افراد بے گھر ہیں، یعنی ملک کی آبادی کا 35 فیصد دربدر ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے، ان میں سے پندرہ لاکھ لبنان میں، دس لاکھ اردن میں، پانچ لاکھ مصر اور پانچ لاکھ ترکی میں پناہ گزینوں کے لیے تیار کردہ کیمپوں میں ہیں۔ اچھی خاصی تعداد مغربی ممالک میں بھی ہے۔ کچھ لوگ اپنے آباواجداد کے علاقہ کو چھوڑ کر ملک کے دوسرے علاقے میں رہائش پذیر ہیں۔ ملک میں تباہی کے ساتھ بے شمار اقتصادی، تعلیمی اور سماجی مسائل درپیش ہیں، جن کی اصلاح کے لیے جنگ بندی کے بعد پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ درکار ہوگا۔ درمیانی طبقہ سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ آج ایک وقت کی روٹی کے لیے پناہ گزینوں کے کیمپ کے اندر لمبی صف میں کھڑے نظر آرہے ہیں۔ دوسروں کے بچوں کی کفالت کرنے والے آج اپنے بچوں کی کفالت کے لیے بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہزاروں ٹن زیتون کی کھیتی کرنے والے کسان زیتون کھانے کے لیے دوسروں کے محتاج بن گئے ہیں۔ پستہ جیسی طاقت ور چیز کی پیداوار کرنے والوں کو آج پیٹ بھر کر کھانا نہ ملنے کی وجہ سے کمزوری کی شکایت ہے۔ جن علاقوں سے دین اسلام کی خدمت کرنے والے پیدا ہوئے، آج وہاں کے رہنے والے غیروں کی تربیت گاہوں میں دنیاوی زندگی کے قیمتی اوقات گزار رہے ہیں، جس کا نتیجہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ 80 فیصد تعلیم یافتہ ملک کے افراد اِن دِنوں اپنے بچوں کو بنیادی تعلیم دینے کے لیے دوسروں کے رحم وکرم پر منحصر ہوگئے ہیں۔ پردہ میں رہنے والی بے شمار خواتین آج غیر محفوظ مقامات پر رات گزارنے پر مجبور ہیں۔ [1]

2011 میں تونس، مصر، لیبیا اور سوریا میں موجود حکومتوں کے خلاف انقلاب آئے، لیکن تونس کے صدر زین العابدین نے 24 سالہ اقتدار کو چھوڑ کر ملک کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ مصر کے صدر حسنی مبارک نے عوامی مظاہروں کے بعد فوج کی دخل اندازی پر 30 سالہ اقتدار سے تنازل لے کر ملک کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ لیبیاکے صدر معمر القذافی کے خلاف انقلاب آنے پر اس کا 42 سالہ طویل دور ختم ہوگیا مگر ملک مزید تباہی سے بچ گیا۔ تونس اور مصر جیسی مثال پیش کرکے بشار الاسد اقتدار چھوڑ کر ملک کو تباہ ہونے سے بچاسکتے تھے۔ مگر بشار الاسد نے اپنے معاونین

---

[1] محمد بوعزہ، الانقلابات العسکریہ فی سوریا، 73۔

کے ساتھ مل کر عوام پر بمباری کی، گولیاں برسائیں، معصوم لوگوں کو قتل کیا گیا، انہیں اپنے ملک کو خیر آباد کہنے پر مجبور کیا گیا، جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ اس وقت روس کی مدد سے بشار الاسد کی حکومت انسانوں پر نہیں بلکہ تباہ شدہ عمارتوں اور کھنڈرات پر ہے۔ دوسری طرف باغی بھی حکومت اور سرکاری اہلکاروں کو نشانہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے۔ باغی اور حکومت کی جنگ میں عام عوام کو بہت نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ عوام کو کوئی خیر خواہ نہیں، بھوک اور افلاس کے مارے عوام کوئی پرسان حال نہیں۔

اس سرزمین کی خاص فضیلت قرآن وحدیث میں مذکور ہے۔ اسی مبارک سرزمین کی طرف حضرت امام مہدی حجاز مقدس سے ہجرت فرما کر قیام فرمائیں گے اور مسلمانوں کی قیادت فرمائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی اسی علاقہ یعنی دمشق کے مشرق میں سفید مینار پر ہوگا۔ غرضیکہ یہ علاقہ قیامت سے قبل اسلام کا مضبوط قلعہ ومرکز بنے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے جزیرۂ عرب کے باہر اگر کسی ملک کا سفر کیا ہے تو وہ صرف ملک شام ہے۔ فرمان رسول ﷺ کے مطابق شام کی سرزمین سے ہی حشر قائم ہوگا۔[1]

قرآن وسنت میں جہاں بھی ملک شام کا تذکرہ وارد ہوا ہے اس سے یہ پورا خطہ مراد ہے جو عصر حاضر کے چار ملکوں (سوریا، لبنان، فلسطین اور اردن) پر مشتمل ہے۔ موجودہ دور کے ملک شام (عربی میں سوریہ یا سوریا، انگریزی میں Syria) کا مکمل نام جمہوریہ عربیہ سوریہ ہے۔ اس کے مغرب میں لبنان، جنوب مغرب میں فلسطین اور اسرائیل، جنوب میں اردن، مشرق میں عراق اور شمال میں ترکی ہے۔ موجودہ دور کا ملک شام یعنی سوریا 1946 میں فرانس کے قبضہ سے آزاد ہوا تھا، جن میں اکثریت سنی عربوں کی ہے۔ سیریائی، کرد، ترک اور دروز بھی تھوڑی تعداد میں موجود ہیں۔ دارالسلطنت دمشق اس خطہ کا قدیم ترین شہر ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسلمانوں نے اس علاقہ کو فتح کیا۔ دمشق کے فتح ہونے کے صرف 26 سال بعد دمشق اسلامی حکومت کا دارالسلطنت بن گیا۔ بنوامیہ کی حکومت کے خاتمہ یعنی 132ھ تک دمشق ہی اسلامی حکومت کا مرکز بنا رہا۔ 132ھ میں بنوعباسیہ کی حکومت کے قیام کے بعد بغداد (عراق) مسلمانوں کی حکومت کا مرکز بن گیا۔ ملک شام میں دین اسلام پہونچنے تک تقریباً 1500 سال سے سریانی زبان ہی بولی جاتی تھی، لیکن ملک شام کے باشندوں نے انتہائی خلوص ومحبت کے ساتھ دین اسلام کا استقبال کیا اور بہت کم عرصہ میں عربی زبان ان کی مادری واہم زبان بن گئی، بڑے بڑے جید محدثین، فقہاء وعلماء کرام اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔ سوریا میں 92 فیصد سے زیادہ مسلمان اور

---

[1] سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2424

تقریباً 8 فیصد عیسائی، علوی اور دروز ہیں۔ زبان کے اعتبار سے 85 فیصد لوگ عربی النسل ہیں، جبکہ کرد لوگ 10 فیصد اور دیگر لوگ 5 فیصد ہیں۔[1]

19ویں صدی عیسوی کے شروع تک ملک شام عثمانی حکومت کے تحت رہا مگر جلدی ہی شام کا زیادہ تر علاقہ فرانسیسیوں نے قبضہ کرلیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد فرانس اور برطانیہ کافی کمزور ہوگئے تھے، چنانچہ انہوں نے عالمی پیمانہ پر اپنی کمزور پوزیشن دیکھ کر اپنی فوج کو ملک شام سے واپس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح 17 اپریل 1946ء کو سوریا آزاد ہوگیا۔ 1946ء سے 2011 تک یہ ملک مختلف عروج وزوال سے گزرا۔ 1948 اور 1967ء میں سوریا نے عربوں کے ساتھ مل کر اسرائیل سے ہوئی جنگ میں حصہ لیا۔ 1973ء میں سوریا نے مصر کے ساتھ مل کر اسرائیل سے جنگ لڑی۔ 13 نومبر 1970ء کو اُس وقت کے وزیر دفاع حافظ الاسد نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ 20 جون 2000 کو حافظ الاسد کے اچانک انتقال پر 30 سالہ ان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد ان کے بیٹے بشار الاسد نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، حالانکہ آئین کے مطابق وہ ملک کے صدر نہیں بن سکتے تھے کیونکہ اُن کی عمر کم تھی، چنانچہ بیٹے کو باپ کی جگہ تخت نشین کرنے کے لیے آئین میں ترمیم کی گئی اور اتنی عمر لکھی گئی جتنی عمر میں بشار الاسد اُس وقت موجود تھے۔ غرضیکہ صرف 34 سال کی عمر میں ملک کے سب سے بڑے عہدہ پر معیّن کردیا گیا۔

چودہ صوبوں پر مشتمل سوریا کے دمشق، حلب[2] اور اِدلب[3] صوبے اِن دنوں سرخیوں میں ہیں۔ دمشق دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے تمام سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہے، حلب (Aleppo) میں چندماہ قبل حکومت نے ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا تھا، حلب قدیم شہر ہونے کے ساتھ ایک بہت بڑا تجارتی مرکز بھی تھا لیکن آج ہر طرف ویرانی نظر آرہی ہے۔ چند ایام قبل صوبہ اِدلب (Idlib) کے خان شیخون[4] (Khan Shaykhun) علاقہ میں الشعیرات (Al-Shayrat) کے فوجی ہوائی اڈہ سے پرواز کرکے فوج کے ہوائی جہازوں نے زہریلی گیس پر مشتمل بمباری عام لوگوں پر کی گئی، جس کے نتیجہ میں پورے علاقہ میں عام لوگوں کی زندگی دوبھر ہوکر رہ گئی ہے۔ الشعیرات کا فوجی اڈہ بشار الاسد کی حکومت کے مکمل کنٹرول میں ہے۔ حلب اور اِدلب دونوں علاقوں میں 100 فیصد سنی مسلم رہتے ہیں، یہ دونوں علاقے کسی دوسری طاقت کے قبضہ میں نہیں بلکہ بشار الاسد کی حکومت

[1] ایلیادسوقی، المقاومہ الاھلیہ فی سوریا، 96۔

[2] "Aleppine", Lexico. Oxford uni

[3] مدینۃ ادلب السوریہ" aljazeera.net

[4] Khan Shikhon-wikipedia-org

کے مکمل طور پر قبضہ میں ہیں۔ ہر طرف ہریالی اور کھیتی والے صوبہ ادلب میں زیتون اور پستہ کی بہت بڑے پیمانہ پر کھیتی ہوتی ہے۔[1]

چونکہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اور حکومتیں بلاواسطہ یابالواسطہ سوریا کی اِس جنگ میں ملوث ہیں، اس لئے بظاہر اِس جنگ کا حل آسان نہیں ہے۔ اس جنگ کو شروع ہوئے دس سال گزر گئے، عراق وایران کی جنگ کی طرح اس جنگ میں متعدد ملکوں کی بے تحاشہ رقم خرچ ہو رہی ہے، حالانکہ ہمیشہ کی طرح جنگ کے ہر فریق کو خسارہ اور نقصان کے سوا کچھ ملتا نظر نہیں آرہا۔

حکومت کو چاہیے کہ وہ عام عوام کی زندگی کو بہتر بنانے کیلئے فوری اقدامات اٹھائے اور خاص طور پر مہاجرین کی حالت زار کو بہتر بنانے پر توجہ دے۔ خانہ جنگی کسی بھی صورت میں شامی عوام کے حق میں نہیں ہے۔ ملک دشمن عناصر کو تو فائدہ ہو سکتا ہے لیکن شامی ریاست اور عوام کے مفاد میں نہیں۔ حکومتیں بدلنے سے بہتر ہے کہ ریفامز کئے جائیں۔ جس سے نچلے طبقے کو فائدہ ہو۔ حکومت اور اپوزیشن کو سیاسی وابستگی سے بالاتر ہو کر ملک اور عوام کے فلاح و بہبود کیلئے کوئی قابل قبول حل تلاش کرنا ہو گا۔

شامی بحران کی نوعیت

شام کا بحران اگرچہ بادی النظر میں عسکری نوعیت کا ہے، لیکن حقیقت میں اور اساسی طور پہ یہ ایک سیاسی بحران ہے جس نے خانہ جنگی اور تباہی کو جنم دیا ہے۔ اس سیاسی بحران کی کئی متنوع جہات ہیں جنہیں طاقت کی حرکیات کے زیر اثر مختلف غیر حقیقی رخ اور نام دے دیئے گئے ہیں۔ یوں ایک سیاسی بحران فرقہ وارانہ بھی نظر آتا ہے، اس میں سازشی عناصر کی ریشہ دوانیاں بھی محسوس کی جاسکتی ہیں اور بیرونی کے علاوہ خطے کی روایتی حریفانہ کشمکش کا حصہ بھی محسوس ہوتا ہے۔[2] ایک بحران جو ابتدائی حیثیت میں سیاسی تھا اسے جب حل نہیں کیا گیا تو وہ رفتہ رفتہ کئی دیگر بحرانوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا جنھوں نے ملک کو تباہی کے غار میں دھکیل دیا ہے۔

سیاسی بحران کے اثرات ونتائج

ملک میں ابتدائی طور پہ جو احتجاج شروع ہوئے ان میں صدر بشار الاسد کی معزولی کا مطالبہ نہیں کیا گیا اور یہ مظاہرے پر امن تھے۔ ان میں شہری حقوق اور بعض سیاسی آزادیوں کا مطالبہ کیا گیا۔ عوام نے یہ مطالبہ کیا کہ سماجی وجمہوری اقدار کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ تب ملک کے اندر اور باہر کے دانشور طبقے کا خیال تھا کہ پہلے سے موجود چنگاری

---

[1] محمد المبارک، ترکیب المجتمع السوری، 123۔

[2] تطور الحرکۃ الباطنیۃ فی سوریا، 55

کے ہوتے ہوئے اور اب پوری عرب دنیا میں انسانی حقوق کی بحالی کے لیے جاری مظاہروں کے بعد شام کی اشرافیہ اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرے گی اور عوام کے حق میں لچک دکھائے گی۔ مگر حقیقت میں اس کے بالکل برعکس ہوا۔ اب صورتحال یہ بن گئی ہے کہ شام میں امن وسکون اور انسانیت کا تحفظ محض ایک خواب بن کر رہ گیا ہے-شام نے جہاں ایک طرف خانہ جنگی اور پراکسی وار کا سامنا کیا ہے وہیں ابتر سیاسی بحران کا سامنا بھی کر رہا ہے-اس وقت شامی مسلمان ناگفتہ بہ حالات سے گزر رہے ہیں اور شام کے کئی علاقے زمینی اور فضائی حملوں کی وجہ سے کھنڈرات کے مناظر پیش کر رہے ہیں-یونائیٹڈ سٹیٹس انسٹیٹیوٹ آف پیس (USIP) کی حالیہ رپورٹ کے مطابق گزشتہ 10 سالوں میں تنازعہ شام کے نتیجے میں 5 لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً 13 ملین افراد بے گھر ہوئے جن میں سے 6.2 ملین شامی افراد داخلی طور پر بے گھر ہوئے ہیں جبکہ 5.6 ملین شامی مہاجرین ہیں جن کی زیادہ تر تعداد لبنان، اردن اور ترکی میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی[1]

لاکھوں شہری اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچانے کی غرض سے اپنا گھر بار اور وطن چھوڑ کر دیگر ممالک کا رخ کر چکے ہیں۔ ہزاروں شامی اس وقت ترکی بارڈر پر لگے گئے اقوام متحدہ کے خیموں میں پناہ گزین ہیں، ہزاروں ترکی کے اندر موجود ہیں، جبکہ سینکڑوں لوگ یورپ کی طرف ہجرت کر کے جا چکے ہیں۔ ابھی لڑائی جاری ہے اور خانہ جنگی کا شکار لاکھوں لوگ شام سے باہر نکلنے کے لیے بے تاب ہیں۔

سیاسی جماعتوں کا کردار

سرزمینِ شام میں کئی بڑی سیاسی جماعتیں وجود رکھتی تھیں مگر وہ اپنا اثرورسوخ استعمال کرنے اور کوئی بڑی کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ بعض ماہرین سیاسی جماعتوں کی ناکامی اور مؤثر کردار ادا نہ کر سکنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ شام کی جماعتوں نے آپس میں اتحاد نہیں کیا۔ اس طبقے کا حال بھی وہی رہا جو مذہبی اپوزیشن اور مسلح اپوزیشن کا رہا ہے۔ یعنی بظاہر ایک مقصد کے ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب نہ رہنا۔ شام میں پہلے سے ایسی جماعتیں اپنا رسوخ رکھتی تھیں جنہیں دیس سے نکال دیا گیا تھا مگر وہ عوام میں مقبول تھیں۔ اگر انہی جماعتوں کو استعمال کیا جاتا اور وہی مذہبی دانشور سامنے آتے تو زیادہ ثمر آور نتائج نکل سکتے تھے۔ لیکن انہی جماعتوں کی کئی شاخیں بن گئیں اور مختلف ناموں اور شخصیات کے ساتھ سامنے آئیں۔ اس سے مقصد اور کوششیں تقسیم ہو گئیں اور بحران میں ان کا کوئی کردار نہیں بچ سکا جو عالمی سطح پر قابل قبول سمجھا گیا ہو۔[2]

---

[1] Nikoloas Van Dam, Destroying A Nation (USIP, 2019-20)

[2] سابقہ مرجع، 236۔

شام میں مذہبی سیاسی جماعتیں بھی موجود تھیں۔ایسا نہیں ہے کہ شام میں عرب بہار کے بعد کوئی ایسا فورم تشکیل نہیں دیا گیا جو معتدل مذہبی فکر کی بنیاد پہ اس مسئلے کا حل چاہتا ہو، بلکہ وہاں متعدد ایسے فورم سامنے آئے لیکن انہیں یا تو معاونت نہیں ملی اور میڈیا کوریج نہیں فراہم کی گئی، یا پھر یہ انہوں نے خود کو اس طرح پیش نہیں کیا جیسے کہ ضرورت تھی۔ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شام سے باہر کی بڑی مذہبی جماعتوں نے اس مسئلے کو انسانی بنیادوں پر نہیں اٹھایا۔ اس دنیا میں کئی ایسی مذہبی تنظیمیں کام کر رہی ہیں جنہیں عالمی سطح کی پذیرائی حاصل ہے لیکن ان کی فکر کا زاویہ مسلکی اختلاف کی اساس پر استوار ہونے کی وجہ سے شام کے بحران میں ان کی رائے زیادہ وزنی ثابت نہیں ہو سکی۔

شام میں لڑنے والی اپوزیشن جماعتوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ صرف بشار حکومت کو ہی نہیں ہٹانا چاہتیں بلکہ اس کے بعد کے نظام کی تشکیل بھی ان کے منصوبے میں شامل ہے۔ یہ بھی ان کے آپس کے ایک اختلاف کی ایک بڑی وجہ ہے۔مثال کے طور جہادی جماعتوں میں کچھ القاعدہ سے تعلق رکھتی ہیں، کچھ سلفی ذہنیت کی ترجمانی کرتی ہیں اور بعض تکفیری ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی طرح کی جہادی جماعتیں جو اپنے فرقی پس منظر کے ساتھ میدان میں جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش ہے کہ ملک میں اس کی فکر کو بالادستی بھی حاصل ہو۔ اس تناظر میں ان جماعتوں کا اتحاد ممکن نہیں رہتا۔[1] کچھ وقت کے لیے یہ جماعتیں متحد ہوئی تھی اور انہوں نے اسلامی اتحاد تشکیل دیا جس کا نام جبہۃ تحریر سوریا رکھا گیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ اتحاد ختم ہو گیا۔ ان میں سے کچھ جماعتیں اب بھی اپنی فکر کے ساتھ کام کر رہی ہیں جبکہ بعض پراکسی میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ جن میں سے بعض کو خلیجی ممالک کی سرپرستی حاصل ہے، کچھ کو ترکی اور قطر کی تو کئی دیگر کو مغربی ممالک کا تعاون حاصل ہے۔[2] ایسے میں یہ امید رکھنا کہ یہ جماعتیں کامیاب ہوں گی اور انار کی کا خاتمہ ہو گا ایک خواب جیسا ہے۔

شام میں مسلح جماعتوں کی بھی ایک خاص اہمیت ہے۔ ان جماعتوں اور تحریکوں کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر عمومی طور پہ منظر نامہ ایسا تشکیل پایا ہے کہ زمینی قضیے سے غیر متعلق چند پراکسی تنظیموں کی وجہ سے شام کی ساری مسلح جدوجہد کو مشکوک بنا دیا گیا ہے۔

شام کے مسئلہ کا حل صرف جمہوریت کی صورت میں ہے۔ یہ خوبی صرف جمہوریت میں ہے کہ وہ اقتدار کی تبدیلی کا ایک پرامن طریقہ بتاتی ہے۔ جمہوریت کسی بھی معاشرے کے لیے نعمت سے کم نہیں۔ شام میں امن کی صرف ایک صورت ہے کہ وہاں ایک جمہوری حل پر اتفاق کر لیا جائے۔ اس کے لیے بشار الاسد کا معزول ہونا اور دوسرے

---

[1] Anthony H. Cordeman, Losing on all fronts, 49. 20 December 2018

[2] Nikoloas Van Dam, Destroying A Nation ,144

گروہوں کا غیر مسلح ہونا لازم ہے۔ یہ صدر بشار الاسد کے لیے ایک محفوظ راستہ ہے۔ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی فریقین پر مبنی ایک نگران عارضی حکومت کا قیام اور آزادانہ انتخابات کے ذریعے اپنے نمائندے چننے کا اختیار ہی شام کے مسئلے کا حل ہے۔[1]

سیاسی المیہ

شام کا مسئلہ، مسئلہ نہیں بلکہ ایک بہت پیچیدہ اور گھمبیر المیہ ہے۔ بعض ذرائع کا یہ کہنا ہے کہ 2011 سے لے کر اب تک شام کی خانہ جنگی میں تقریباً چار لاکھ ستر ہزار افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شام کی نصف آبادی مختلف ملکوں میں پناہ گزین ہو چکی ہے۔ ان پناہ گزینوں پر آئے روز گزرنے والی قیامت کی خبریں دنیا میں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ شام کے قضیے کو امن و سلامتی کے ساتھ حل کرنے کے لیے اس میں شریک تمام قوتوں کو انسانیت پر رحم کھانا ہو گا اور اپنے مفادات کے بجائے انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھانا ہو گا۔ وہ تمام ممالک یا قوتیں جنھوں نے شامی عوام کے خون میں ہاتھ رنگے ہیں اب انھیں غیر جانبداری سے شامی عوام کی آرا اور خواہشوں کے مطابق ایک آزاد و خود مختار حکومت کے چناؤ میں مدد دینا ہو گی۔ مفادات کا کھیل ختم کرنا ہو گا۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی مرضی شامی عوام پر مسلط کرے۔ یہ شامی عوام ہیں جنھیں حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی حکومت منتخب کریں۔ اگر اس اصول کو خلوص دل سے اختیار کر لیا گیا تو پھر اگلا مرحلہ دربدر بھٹکنے والے شامیوں کی واپسی اور شام کی تعمیر نو کا ہو گا۔

شام کی صورتحال اس لیے پیچیدہ ہے کہ اس کی سرزمین پر مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ سنی، کرد، اپنی ریاست بنانے کے لئے طویل جدوجہد کر رہے ہیں، علیحدگی پسندوں کے جذبات اور اقدامات کا شکار ہیں۔ مزید یہ کہ بیرون ملک سے ان کے خیالات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ درحقیقت، اس وقت شام دشمنوں سے گھرا ہوا ہے۔ ترکی کردوں کی حمایت کرتا ہے۔ عراق میں کوئی مضبوط طاقت نہیں ہے۔ اسرائیل عسکریت پسندوں سے خوفزدہ ہے، اور اسے اپنی سرحدوں سے دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔[2]

شام میں شروع ہونے والے انقلاب کو ابتداء میں جہاد کا عنوان دیا گیا۔ لیکن اس کے لیے برسرپیکار جماعتیں تقسیم ہو گئیں اور مختلف ایجنڈوں کے تحت کام کرتے ہوئے آپس میں لڑائی پر اتر آئیں۔ اس کا نقصان اس اکثریت آبادی کو ہوا جو عام شہری تھے اور جو محض پرامن طریقے سے نظام کی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ کس امیر کی اطاعت کی جائے

---

[1]Muhammad Abu Rumman, Islamists religion and revolution in Syria,44 , Friedrich-Ebert.stigung FES Jordan and Iraq, 2013

[2]الحرب السریہ فی الشرق الاوسط، 122

اور کسے مسترد کر دیا جائے یہ ایک معمہ بن گیا جو عام لوگوں کے لیے آج تک قابل حل نہیں بن سکا۔ حکومت اور اپوزیشن کو چاہیے کہ ذاتی مفادات کو ترک کر کے مشترکہ قومی مفاد کی جائیں۔ جس سے عام عوام اور ریاست کو فائدہ پہنچے۔ حکومت اور اپوزیشن پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مسلح تنظیموں کی حوصلہ شکنی کریں اور کسی بھی صورت میں خون ریزی کی اجازت نہ دی جائے اور یہ کہ بیرونی مداخلت کو بہر صورت روکنا ہو گا ورنہ یہ جنگ نہیں رُک سکتی۔

فصل دوم

معاشی مسائل

معاشیات

ایڈم سمتھ کے مطابق ''معاشیات معاشرتی سائنس ہے جو سامان اور خدمات کی پیداوار، تقسیم اور کیفیت سے وابستہ ہے۔ عام طور پر معاشیات کو مائکرو اکنامکس میں توڑا جا سکتا ہے جو مجموعی معیشت کی نمو اور اس کی بڑھوتری کے طرز عمل پر مرکوز ہوتی ہے''۔[1]

معاشیات آج ایک جدید معاشرتی علم بن چکا ہے جس میں نہ صرف انسانی معاشی رویہ بلکہ مجموعی طور پر معاشرہ اور ممالک کے معاشی رویہ اور انسانی زندگی اور اس کی معاشی ترقی سے متعلق تمام امور کا احاطہ کیا جاتا ہے اور اس میں مستقبل کی منصوبہ بندی اور انسانی فلاح جیسے مضامین بھی شامل ہیں۔

معاشیات سے مراد وہ سائنس ہے جو تبادلہ سے متعلق قوانین کو کنٹرول کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ قوانین بنانے والے لین دین اور دولت کی منتقلی پر کنٹرول رکھتے ہیں۔

شامی زراعت وصنعت کا پس منظر

شام کے زرعی امکانات بہت بڑے ہیں۔ مصر کے بر خلاف جہاں زمین کی کمی ایک اہم مسئلہ بھی ہوئی ہے۔ شام کی یہ حالت ہے کہ زمین کو کام میں لانے کے لیے کافی مزدور نہیں ملتے۔ وہاں صرف حال ہی میں کاشتکاری کے لیے مشینوں کو رائج کیا گیا ہے۔ چونکہ بیشتر زرعی کام آدمیوں اور مویشیوں کے ذریعہ سر انجام پاتے ہیں۔ اس لیے وہاں فی کسان فی اکائی زیر کاشت زمین سے پیداوار کی مقدار بہت کم رہتی ہے۔ پیداوار میں کمی کا ایک سبب زمین کی ملکیت کا طریقہ ہے جس کے ماتحت تقریباً نصف زمین کی کاشت شکمی لگان دار کرتے ہیں اور مالکان آراضی کھیتوں سے دور شہروں میں رہتے ہیں اور انہیں زراعت کے متعلق کچھ معلومات ہوتی ہیں اور نہ اس سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اکثر قابل اشاعت زمین وسیع پیمانے پر کھیتی باڑی میں کام آرہی ہے۔ اناج جس میں بڑی پیداوار گیہوں ہے مزروعہ زمین کے پچھتر فیصدی حصہ پر بویا جاتا ہے، اور اس کے بدولت شام گیہوں پیدا کرنے والا ایک اہم علاقہ بن

---

[1] ڈاکٹر ظل ہما، معاشی مسائل لاہور، عکس پبیلی کیشنز، 2010ء(25

گیا ہے۔ شام کے لیے قابل کاشت زمین اتنی زیادہ ضروری نہیں ہے جتنی ضروری چیز زرعی پیداوار کا اضافہ ہے جو خشک کھیتوں میں آبپاشی کی توسیع سے ہو سکتا ہے۔ پانی حاصل ہونے کے وسائل میں معتدبہ ترقی ممکن ہے۔

وسعت پذیر فصلوں میں ایک اور پیداوار چاول ہے جس کی کاشت زیادہ تر جزیرے میں کی جارہی ہے۔ مونگ پھلی کی کاشت بھی بہت امید افزا ہے۔ کیونکہ دنیا کی منڈیوں میں مونگ پھلی کے تیل کی بڑی مانگ ہے۔ زیتون کے درخت شام میں تیل کا خاص ذریعہ ہیں۔ جہاں ان کی کاشت باشندوں کی بڑی زرعی سرگرمیوں میں داخل ہے۔ تمباکو بھی ایک اور اہم فصل ہے جو اتاکیا کی نشیبی زمینوں میں اگائی جاتی ہے۔ پھلوں کے اگانے کا کام جواب زیادہ تر دمشق کے علاقے میں مرکوز ہو گیا ہے آبپاشی کی توسیع کے ساتھ بڑھایا جاسکتا ہے، وہاں پھلوں کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔[1]

صنعت ابھی تک مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہوئی ہے۔ جنگ کے زمانے میں جب سامان درآمد کرنے کی مقدار بہت ہی کم ہو گئی تھی۔ صنعت کی رفتار کچھ بڑھی۔ دورانِ جنگ میں جو سرمایہ جمع ہوا متعدد صنعتی کارخانوں کی تعمیر اور ان کو سازوسامان سے لیس کرنے میں لگا دیا گیا۔ دمشق کے باہر ایک شیشہ کا سامان بنانے والا بہت بڑا کارخانہ منڈیوں کی کمی کی وجہ سے صرف جزوی گنجائش کے مطابق سامان تیار کرتا ہے۔ چینی اور انگور کی شکر کا ایک بہت بڑا کارخانہ حمص میں قائم کیا گیا ہے۔ چقندر کی کاشت کے امکانات پر اس کارخانہ کے قیام سے پہلے مکمل قسم کے تجربات ہونے چاہئیں تھے۔ اس لیے کہ اس فیکٹری کا انحصار سرِدست بڑی حد تک درآمد کی ہوئی خام شکر پر ہے۔ دباغت چرم کی صنعت میں اس سے زیادہ وسیع پیداوار کی قابلیت ہے جتنی فی الحال منڈی میں کھپ سکتی ہے۔ یہ شامی صنعت کی ایک کمزوری ہے کہ بازار مہیا کرنے کی سہولتوں کا پورا مطالبہ کرنے سے پہلے بڑے بڑے کارخانے بنا دیئے گئے۔ ایک دوسری کمزوری ناتجربہ کار لوگوں کی جسارت ہے جو زمانہ جنگ میں سہولت سے روپیہ پیدا کرنے کی بناء پر جرات کر کے صنعتی میدان میں اتر پڑے اور اس طرح ایک ناخوش گوار مقابلے میں اضافہ کر دیا جو اٹھتی ہوئی صنعتوں کے حق میں تباہ کن ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت نہایت اہم ہے اور وہ بہت مضبوطی کے ساتھ قدم جما چکی ہے۔ حلب اور دمشق اس کے مرکز بن گئے ہیں۔ پھلوں اور سبزیوں کو ڈبوں میں بند کرنے کی صنعت ملکی بازاروں کو سامان مہیا کرتی ہے اور

[1] اسلامی دنیا، سید قاسم محمود، ص320

اتنا مال تیار کرتی ہے کہ بر آمد کے لیے بھی بچ رہتا ہے۔ نباتی تیلوں، صابن، سگریٹ اور سیمنٹ کی پیداوار مقامی ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ روئی اوٹنے اور اس کو صاف کرنے کا کام وسعت پا رہا ہے۔[1]

دستکاریوں جن میں شام مدتوں سے مشہور ہے اب بھی صنعتی پیداوار کا ایک اہم حصہ بنی ہوئی ہیں۔ حامہ، حمص اور دمشق ہاتھ سے کپڑا بننے کی صنعت کے مرکز ہیں جو کپڑے کی مجموعی پیداوار کا ایک بڑا حصہ ہوتا ہے۔ ہاتھ سے بنا ہوا کپڑا مشین کے کپڑے سے بہتر قسم کا ہوتا ہے مگر زیادہ قیمتی بھی ہوتا ہے۔ چند نفیس صنعتیں دمشق میں باقی رہ گئی ہیں جن میں سے چوبی و معدنی صنعت کاری اور جڑاؤ کام، نیز خوبصورت ریشم اور زر بفتی کپڑے کی بنائی قابل ذکر ہیں۔ شام میں دست کاروں اور ہنر مندوں کا ایک بڑا طبقہ موجود ہے۔ جنہیں مہارت ورثے میں ملی ہے۔ شام میں اچھی معیشت اس پر منحصر ہے کہ زرعی پیداوار زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہو اور زرعی صنعتیں خوب نشوونما پائیں۔[2]

لیکن اس سب کے لیے ملک میں امن عامہ کا ہونا ضروری ہے کیونکہ حالیہ تحریکوں کے بعد شامی معیشت تباہ ہو چکی ہے جس کو بحال کرنا ناگزیر ہے ورنہ صورتحال مزید ابتر سے ابتر ہوتی جائے گی۔

شام کا معاشی بحران:

شام اس وقت شدید معاشی بحران کا سامنا کر رہا ہے ملکی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ شام کی انڈسٹری مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہے۔ انفراسٹریکچر مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ سیاسی عدم استحکام اپنے عروج کو پہنچ چکا ہے۔ ایسے حالات میں شام میں بیرونی سرمایہ کاری تاریخ کی بدترین دور سے گزر رہی ہے۔ جی ڈی پی گر رہا ہے اور افراطِ زر کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے مزید بر آں بین الاقوامی سطح پر معاشی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے شامی معیشت مکمل طور پر Collapse ہو رہی ہے۔ بیرونی قرضے تاریخ کے سب سے بلندی پر ہیں۔ اگر جلد از جلد شامی خانہ جنگی کے بحران پر قابو نہیں پایا گیا تو پھر معاملات کسی کے کنٹرول میں نہیں آئیں گے۔ اقوام متحدہ کو جلد از جلد شام کی خانہ جنگی میں مؤثر کردار ادا کرنا چاہیے تاکہ عام عوام کو سہولیات زندگی کی فراہمی ممکن بنایا جاسکے۔ شامی معاشی بحران کے چند اہم اسباب درج ذیل ہیں۔

---

[1] Sir Alexander Gibb: The economic development of syria, Report of the United states-syria agriculture mission, washington, 1947, The economic development of Syria".

[2] ایضاً

خانہ جنگی کی وجہ سے معیشت کو نقصان

شامی خانہ جنگی وہ خانہ جنگی ہے جو اس وقت شام میں بشارالاسد کی حکومت کے خلاف جاری ہے۔ اسے لوگ عام طور پر شامی انقلاب کا نام بھی دے رہے ہیں۔ 15 مارچ 2011ء شام کے مختلف شہروں میں شام کی حکومت مخالف مظاہرے شروع ہوئے عرب سپرنگ کے دوران جہاں کئی عرب ممالک میں عوام نے حکومتوں کے تختے الٹ دیئے وہیں شامی مظاہرین بھی اپنے مطالبات لیے سڑکوں پر نکلے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ حکومت سیاسی اصلاحات کرے لیکن 15 مارچ کو حکومتی فورسز نے درعا میں نہتے عوام پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں 4 شہری مارے گئے۔ وہاں سے عوام میں اشتعال کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی۔ حکومت کا خیال تھا کہ طاقت کے استعمال سے عوامی مظاہروں کو کچل دیا جائے گا جس کے لیے انہوں نے کریک ڈاؤن کا فیصلہ کیا اور چند دن میں درجنوں مظاہرین کو ہلاک کر دیا گیا۔ حکومتی کریک ڈاؤن کی شدت کے ساتھ ہی یہ مظاہرے شام بھر میں پھیلنے لگے۔

اس خانہ جنگی کی وجہ سے شام کی معیشت نیست و نابود ہو کر رہ گئی ہے۔ اقوام متحدہ کے 2018ء اعداد و شمار کے مطابق شام میں خانہ جنگی کے دوران 400 ارب ڈالر کا معاشی نقصان ہوا ہے۔ [(1)]

عالمی بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق شامی معیشت کو اس خانہ جنگی کی وجہ سے ہونے والا مجموعی نقصان اس ملک کی مجموعی قومی پیداوار کے کئی گناہ سے بھی زیادہ ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ شام میں ایک تہائی مکانات یا تو تباہ ہو چکے ہیں یا انہیں بری طرح نقصان پہنچا ہے۔ شام میں خانہ جنگی کے پہلے 5 برسوں میں سالانہ بنیادوں پر قریب 5 لاکھ 38 ہزار ملازمتیں ختم ہوئیں جبکہ وہاں نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح 80 فیصد سے اوپر جا چکی ہے۔ شام میں جاری خانہ جنگی میں وہاں سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اس خانہ جنگی کے نتیجے میں شامی معاشرے کو چلانے کے ضروری ادارے بھی تباہ ہو چکے ہیں۔ خانہ جنگی نے شامی معیشت کو تباہ کیا۔ [(2)]

معلوم ہوا کہ خانہ جنگی کی وجہ سے شامی معیشت تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہی ہے۔ عالمی طاقتوں کو چاہیے کہ انسانی جانوں کی حفاظت کے لیے جلد از جلد اقدامات اٹھا لینے چاہئیں۔

عالمی معاشی طاقتوں کی پابندیاں

2011ء کے شامی بحران کے پیدا ہونے کے بعد عالمی طاقتیں اپنے مفادات کی خاطر کود پڑی۔ شامی بحران کے شروع ہونے کے کچھ عرصہ بعد امریکہ نے شامی صدر اور شامی حکومت کے اثاثے منجمد کرنے کا اعلان کر دیا۔

---

[1] یو این رپورٹ 2018ء، سیریا

[2] ورلڈ بینک رپورٹ 2018ء، سیریا

یورپی یونین کے بریسلز میں ہونے والے ایک اجلاس میں شام کے 18 حکومتی اہلکاروں کو اس فہرست میں شامل کر دیا جن پر سفر کرنے پر پابندی عائد ہے اور جن کے اثاثے منجمد کر دیئے گئے ہیں اس فہرست میں ان 18 افراد کی شمولیت کے بعد اب تک مجموعی طور پر 74 اہم حکومتی افراد پر پابندی عائد کر دی جاچکی ہے جن میں صدر بشار الاسد بھی شامل ہے۔ اجلاس میں یورپی انویسمنٹ بینک کی جانب سے شام کو دیئے جانے والے قرضوں کو بھی منجمد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔[1]

شام کی صورتحال پر بحث کے لیے عرب ممالک کی نمائندہ تنظیم عرب لیگ کا ہنگامی اجلاس مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں ہوا جس میں شام کو دی جانے والی تمام امداد معطل کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور شامی حکومت کے رکنیت کو معطل کر دیا گیا۔[2]

عالمی طاقتوں کی پابندی کے بعد سے شامی معیشت کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ رہی سہی کسر آئے روز بم دھماکوں اور خودکش حملوں کی وجہ سے ختم ہو رہی ہے۔ بحران کے بعد جہاں شامی معیشت کے لیے بیرونی امداد انتہائی اہمیت اختیار کر چکی تھی وہیں پر اس امداد پر پابندی نے ملکی معیشت کو زوال کی دہلیز پر پہنچا دیا۔

بے روزگاری میں اضافہ

بے روزگاری کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگ بغیر کام کے ہوں اور کام کرنے کا کوئی مناسب موقع میسر نہ ہو، اور عملی طور پر کام کرنے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ بے روزگاری کا اندازہ بے روزگار لوگوں کی غلبہ کی بناء پر لگایا جاتا ہے۔ کسی بھی ملک کے زوال کے دور میں یا جنگی حالات میں اس ملک کی بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر جلد قابو نہ پایا گیا تو پھر صورتحال مزید خراب ہو سکتی ہے۔

بسا اوقات کچھ ملکوں میں نااہل طرز حکمرانی کے بدولت بھی بے روزگاری میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جس کی بدولت عوام میں بے چینی پھیلتی ہے اور عوام ان حکمرانوں کے خلاف بغاوت پر اتر آتے ہیں۔

انٹرنیشنل لیبر ادارے کے تیار کردہ تحقیقات کے مطابق پوری دنیا میں 197 ملین سے زیادہ لوگ بغیر کام کے تھے۔ یہ تحقیقاتی رپورٹ 2012 میں شائع کی گئی تھی۔[3]

---

[1] ورلڈ بینک رپورٹ 2018ء، سیریا

[2] بی بی سی، امریکہ کا شام پر عالمی دباؤ کا خیر مقدم، 15 نومبر 2011ء

[3] World War:. International Labour organization, 2012

ہر حکمران کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے رعایا کے حقوق کا خیال رکھے۔ اور ان کی استعداد سے فائدہ اٹھایا جائے جب پڑھے لکھے لوگوں کو ان کے استعداد کے مطابق کام نہیں ملتا تو ان لوگوں میں مایوسی پھیلتی ہے۔ جو کہ ملک وملت دونوں کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

بشار الاسد کے اقتدار کے سائے میں شام میں بے روز گاری کی شرح تقریباً ہر سال بڑھتی رہی ہے۔ اگرچہ صدر بشارالاسد نے اپنے اقتدار کو طوالت بخشنے کے لیے بے روز گاری کے روک تھام کے لیے کچھ اقدامات اٹھائے لیکن وہ دیرپا ثابت نہ ہو سکے۔ ہر گزرتے سال کے ساتھ شام کی بے روز گاری کی شرح میں اضافہ ہوتا رہا۔ بڑھتی ہوئی بے روز گاری حکومتی نا اہلی کو عیاں کر رہی تھی۔ حکومت عوام کی فلاح و بہبود کے لیے عملی طور پر کچھ کرتی دکھائی دے نہیں رہی تھی۔ عوام کا حکومت پر اعتماد ہر گزرتے وقت کے ساتھ کم ہو تا جا رہا تھا۔ اور شامی حکومت عوامی اعتماد حاصل کرنے کے لیے کوئی قابل قدر اقدامات نہیں کر پا رہی تھی۔ ادھر شامی عوام میں بڑھتی ہوئی بے روز گاری کی وجہ سے تشویش میں اضافہ ہو رہا تھا۔

بے روز گاری پر قابو پانے میں حکومتی ناکامی پر سیرین اکنامکس فورم نے ایک رپورٹ شائع کی تھی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ:۔

"Since the Syrian government realize that the high unemployment rates will speed up the collapse of the Syrian economy, they have trying to show them that they are doing their best to provide more job opportunities by putting forward the project called "Youth Employment". Youth employment aim to provide 25 thousand job oportunities, but it was soon clear that this project was bogus. The Syrian economy faces many crises, with high unemployment rates being the most dangerous of all. It seems that it is impossible to find a solution for these crises."(1)

"جب شامی حکومت کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ بڑھتی ہوئی بے روز گاری کی شرح شامی معیشت کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔ حکومت یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور لوگوں کو نوکریوں کے مواقع پیدا کرنے کی کوشش کر دیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں "یوتھ امپلائمنٹ" کے نام سے ایک منصوبہ شروع کیا جس کا مقصد پچیس ہزار نوجوانوں کو نوکریاں فراہم کرنا تھا لیکن بہت جلد یہ واضح ہو گیا تھا کہ یہ منصوبہ مکمل

---

[1] "Syrian economic forum"، 19 جون، 2014

ناکام تھا۔ شامی معیشت کو بہت مشکلات درپیش تھیں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کی شرح ان سب میں سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ مشکلات پر قابو پاکر ان کا حل تلاش کرنا ناممکن دکھائی دے رہاہے۔"

اب صورتحال یہ ہے کہ صرف دو کروڑ آبادی والے اس ملک کے 70 لاکھ افراد بے گھر ہیں، یعنی ملک کی آبادی کا 35 فیصد دربدر ٹھوکریں کھاتا پھر رہاہے، ان میں سے پندرہ لاکھ لبنان میں، دس لاکھ اردن میں، پانچ لاکھ مصر اور پانچ لاکھ ترکی میں پناہ گزینوں کے لیے تیار کردہ کیمپوں میں ہیں۔ اچھی خاصی تعداد مغربی ممالک میں بھی ہے۔ کچھ لوگ اپنے آباواجداد کے علاقہ کو چھوڑ کر ملک کے دوسرے علاقے میں رہائش پذیر ہیں۔ ملک میں تباہی کے ساتھ بے شمار اقتصادی، تعلیمی اور سماجی مسائل درپیش ہیں، جن کی اصلاح کے لیے جنگ بندی کے بعد پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ درکار ہو گا۔ درمیانی طبقہ سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ آج ایک وقت کی روٹی کے لیے پناہ گزینوں کے کیمپ کے اندر لمبی صف میں کھڑے نظر آرہے ہیں۔ دوسروں کے بچوں کی کفالت کرنے والے آج اپنے بچوں کی کفالت کے لیے بھیگ مانگ رہے ہیں۔ ہزاروں ٹن زیتون کی کھیتی کرنے والے کسان زیتون کھانے کے لیے دوسروں کے محتاج بن گئے ہیں۔ پستہ جیسی طاقت ور چیز کی پیداوار کرنے والوں کو آج پیٹ بھر کر کھانا نہ ملنے کی وجہ سے کمزوری کی شکایت ہے۔ جن علاقوں سے دین اسلام کی خدمت کرنے والے پیدا ہوئے، آج وہاں کے رہنے والے غیروں کی تربیت گاہوں میں دنیاوی زندگی کے قیمتی اوقات گزار رہے ہیں، جس کا نتیجہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ 80 فیصد تعلیم یافتہ والے ملک کے افراد اِن دِنوں اپنے بچوں کو بنیادی تعلیم دینے کے لیے دوسروں کے رحم وکرم پر منحصر ہوگئے ہیں۔ پردہ میں رہنے والی بے شمار خواتین آج غیر محفوظ مقامات پر رات گزارنے پر مجبور ہیں۔[1]

ان رپورٹس کی روشنی میں یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شامی حکومت بے روزگاری کی روک تھام کو روکنے میں ناکام رہی تھی اور اس کی شرح مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اور حکومتی اقدامات ناکافی تھے۔ اگرچہ حکومت کو بھی یہ اندازہ تھا کہ بے روزگاری کی بڑھتی ہوئی شرح ملکی معیشت کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے لیکن اس کے باوجود اس پر قابو پانا حکومت کی بس میں نہیں تھا جسکا نتیجہ ملک میں خانہ جنگی کی صورت میں ہوا اور اب بے روزگاری تاریخ کی بلند ترین شرح پر ہیں، ملک کے اکثر تعلیمی ادارے یاتو تباہ ہوگئے ہیں یاناکارہ۔ ایسے میں بے روزگاری کا بڑھنا یقینی ہے۔

[1] محمد بوعزہ، الانقلابات العسکریہ فی سوریا، 73۔

بڑھتی ہوئی بے روز گاری کی شرح

شام میں بشار الاسد کے اقتدار کی آخری سالوں میں بے روز گاری کی شرح میں بے پناہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اور حکومت کسی بھی طرح اس پر قابو پانے میں ناکام دکھائی دے رہی تھی۔ بے روز گاروں کی بہت بڑی تعداد نوجوان اور پڑھے لکھے لوگوں کی تھی۔ بہت بڑی تعداد میں نوجوان روز گار کی تلاش میں پھر رہے تھے لیکن روز گار نہیں مل رہا۔ جس کے بدولت نوجوانوں میں حکومت مخالف رد عمل بڑھ رہا تھا۔ "سیرین ٹرسٹ فار ڈویلپمنٹ" نے اپنی ایک رپورٹ جاری کیا تھا جس میں واضح کیا گیا کہ کس طرح بے روز گاری کی شرح میں اضافہ ہو رہا تھا اور حکومت کے اقدامات ناکافی تھے۔ اس بناء پر بے روز گاری کے شرح میں کتنا اضافہ ہوا۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ:۔

"Unemployment rate for Syrian Youth 15-24 to be 22.04% in 2010. Many factors contribute to high youth unemployment including demographic factors such as high population growth and urbanization, as well as economic and educational. Policies that have led to a lack of co-ordination between the education system and the labor market, and Lackluster economic growth, which has not created sufficient job growth. It is perhaps not surprising that youth account for the majority of the unemployed, with youth aged 15-24 accounting for 47.9% of unemployed and those 15-29 years old comprising 70.7% of all unemployed in 2008. Unemployment is much higher for young women than men. Those in rural areas are also more likely to suffer from unemployment. While the Syrian population is now more urban than rural, unemployment rates for Syrians in rural areas account for 54.2% of total

unemployment, compared to 45.8٪ for Urban areas. Unemployment rates increase up in 2010. "(1)

"بے روزگاری کی شرح 15-24سالہ نوجوان کے لیے2010میں 22.4فیصد ہو گئی تھی۔ بے روزگاری کے اضافے کے عوامل بہت سارے تھے خاص کر بڑھتی ہوئی شہری علاقوں کی آبادی کی وجہ سے اور ساتھ ساتھ معیشت اور تعلیمی پالیسیاں جو کہ نظام تعلیم اور لیبر مارکیٹ میں توازن پیدا کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اور معاشی بدحالی کی بڑھوتری جو کہ لوگوں کو کام کے مواقع پیدا نہیں کر سکا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ بے روزگاروں میں بڑی تعداد 15-24سال کے نوجوان کی ہے۔ کل بے روزگاری کا جو کہ 47.9فیصد تھی۔ اور 15-19سال کے بے روزگار نوجوانوں کی شرح 70.7فیصد تھی۔ مردوں کے مقابلے میں نوجوان عورتوں کی شرح بے روزگاری بہت زیادہ تھی۔ اور جو دیہی علاقوں کے رہائشی ہیں وہ زیادہ بے روزگار ہیں بنسبت شہری علاقوں کے رہائشیوں کے۔ جبکہ شامی آبادی زیادہ تر شہری آبادی پر مشتمل ہے شام کے دیہی علاقوں کی بے روزگاری کی شرح 54.2فیصد تھی اور 2010میں یہ شرح مزید بڑھ چکی تھی۔"

اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ شامی حکومت بے روزگاری پر قابو پانے میں ناکام ہو چکی ہے اور عوام کو ریلیف فراہم نہیں کر سکی۔ یہی وجہ ہے کہ عوام بشار الاسد کے خلاف بغاوت پر اتر آئے اور یہ بغاوت کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ لیکن بغاوت کے اہم اسباب میں ایک سبب بڑھتی ہوئی بے روزگاری تھی۔

بڑھتی ہوئی بے روزگاری پر عالمی بینک کی رپورٹ

2017ء کی رپورٹ کے مطابق شام میں خانہ جنگی کے پہلے 5برسوں میں سالانہ بنیادوں پر قریب 5لاکھ 38 ہزار ملازمتیں ختم ہوئیں جبکہ وہاں نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح 80فیصد تک پہنچ چکی ہے۔(2)

دی گارڈین کی ایک رپورٹ کے مطابق ہر 5 میں سے 4 افراد غربت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق:

---

[1] Syrian Trust for Development, 12, April 2014

[2] عالمی بینک رپورٹ، 2018ء، سیریا

The war in Syria has plunged 80% of its people of Poverty just over 4 in 5 Syrians now live in poverty and reduce the life expectancy by 20 years and led to massive economic losses.[1]

معاشی بحران میں کرپشن کا کردار

جون 2000ء میں بشار الاسد نے شام میں اقتدار کی باگ ڈور سنبھال لی اس وقت وہ نوجوان تھا۔ایک ملک کو کیسے سنبھالا جاتا ہے وہ اس تجربہ سے نابلد تھا۔لیکن اس کے باوجود وہ ملک کو چلا رہا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج وہ اس میں بہتری لانے کی کوشش کر رہا تھا۔شروع میں بشار الاسد کرپشن کے خلاف واضح موقف رکھتا تھا تاکہ عوام میں مقبولیت حاصل کر سکے اور عموما ایک ڈکٹیٹر ہی طریقہ آزماتا ہے۔اس نے سخت قوانین متعارف کرایا کرپشن کے خلاف لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ قوانین صرف قوانین کی حد تک محدود ہو کر رہ گئے۔ان پر عمل داری بالکل بھی ختم ہو تی گئی سرکاری سطح پر کرپشن میں اضافہ ہوتا رہا۔عوام کے پاس ایسی کوئی سہولت نہیں تھی جس سے وہ حکومتی معاملات کی معلومات حاصل کر سکیں۔اس کے باوجود حکومتی کرپشن کے رپورٹس منظر عام پر آتی رہیں۔ لیکن حکومت کرپشن کی روک تھام میں سنجیدہ نہیں تھی۔نچلی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک کرپشن پہنچ گئی تھی ورلڈ بینک اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے کرپشن کی بار بار نشاندہی کی۔لیکن حکومت ٹس سے مس نہیں ہوئی۔یوں عوامی سطح پر بشار الاسد اپنی مقبولیت کھونے لگا۔اور پھر عوامی احتجاج نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔جو دیکھتے ہیں دیکھتے بشار الاسد کے خلاف بغاوت میں بدل گیا۔اور تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ ملک کے وسیع پیمانے پر باغیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔اور اہم اڈوں اور فوج کے تنصیبات پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ان تمام صورت حال کے جہاں دیگر وجوہات ہیں وہاں بڑھتی ہوئی کرپشن بھی ایک اہم اور بنیادی وجہ ہے۔

شام میں بڑھتی ہوئی کرپشن

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے شام میں بڑھتی ہوئی کرپشن کے حوالے سے ایک مفصل رپورٹ جاری کی ہے۔جس میں واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح شام میں کرپشن نے پنجے گاڑھے۔اور کرپشن کن اداروں

[1] دی گارڈین،2019ء،اَن ایمپلائمنٹ اِن سیریا

اور جگہوں تک پہنچ چکی ہے۔ساتھ ہی بڑھتی ہوئی کرپشن پر تشویش کا اظہار بھی کیا تھا۔اور حکومت کو خبردار کیا تھا کہ اس پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔رپورٹ سے کچھ اقتباس درج ذیل ہے:۔

"The Corruption which starts at the top filters down through all levels of business elite, many of whom have an exe to grind with the regime because of their classes continued demised role, complain that a predominantly "corrupt class" have become entrenched over the past 30 years and is using the corrupt system to dominate all levels of business. They contend that the members of the corrupt classes are well known and that any Syrian could develop a list of the 50 most corrupt. They state that the corrupt classes have varying levels of influence and power in the government, and that the most powerful are in president Asad's inner circle."[1]

"کرپشن تجارت کے تمام درجوں میں پہنچ چکی تھی اعلیٰ سطح سے ہوکر نچلی سطح تک۔الزام لگایا جارہاتھا کہ انتہائی بدعنوان درجے کےلوگ ان پر پچھلے تیس سالوں سے حکومت کررہے ہیں۔اور تجارت کے تمام درجوں کو قابو میں رکھنے کے لیےبدعنوان نظام کوتحفظ فراہم کیاجارہاہے۔بدعنوان لوگ خوب جانے پہچانے تھے یہاں تک کہ عام شامی آدمی آسانی سے پچاس کرپٹ ترین افراد کی لسٹ بناسکتا تھا۔بدعنوان طبقہ کے پاس اثر و رسوخ بھی ہوتا تھا اور حکومت میں بھی ان کی طاقت ہوتی تھی۔اور جو زیادہ طاقتور ہوتا (بدعنوانی میں)وہ بشار الاسد کے قریبی ساتھی ہوتا۔"

معلوم ہورہا ہےکہ حکومتی سطح پر کرپشن کوروکنےکےبجائے اسے تحفظ فراہم کیاجارہاتھا۔اگرحکومت چاہتی توبدعنوان طبقہ کولگام لگا سکتی تھی لیکن چونکہ اس میں حکمرانوں کا ذاتی مفادتھااس لیےانہیں کھلی آزادی حاصل تھی۔

کرپٹ ترین ممالک میں شمار

شام پچھلے چند سالوں میں دنیا کے بدعنوان ترین ممالک میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کے"کرپشن پرسپشن انڈکس" نے اس حوالے سے رپورٹ جاری کیا ہے:۔

---

[1] Transparency International Syria Corruption and Government Transparency, globalsecurity.org, 20 March, 2010

"Syria's score dropped from 2.4 (out of possible 10) and 138 place (out of 180) in 2007, to 2.1 and 147th place in 2008. In 2009 Syria still hovered near the bottom of the list with a score of 2.6 and 126th place." [1]

"شام کا درجہ 2.4سے بھی نیچے گر گیا ہے اور ایک سو اسی ممالک میں سے اٹھائیسویں نمبر پر آ گیا ہے یہ اندازے 2007کے ہیں۔اور 2008میں 2.1اور ایک سو سینتالیسویں جگہ پر پہنچ گیا ہے(مطلب مزید ابتری کا شکار ہوا ہے)۔2009میں بھی تقریبا لسٹ کے انتہا پر پہنچ گیا تھا۔2.6پوائنٹ کے ساتھ اور 126ویں جگہ پر موجود تھا۔"

ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل عموماًہر سال تقریباً تمام ممالک کی ایک فہرست مرتب کرتا ہے جس میں یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ کرپشن میں کون سا ملک کس درجے پر ہے۔جو بھی ملک کرپشن سے پاک ہوتا ہے وہ اس فہرست میں اگلے نمبروں پر ہوتا ہے۔اور جو جتنا بدعنوان ہے وہ فہرست کے آخر میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق خلیجی ممالک کے سترہ ممالک میں شام پندرھویں نمبر پر موجود ہے۔اس فہرست کے آخر میں لیبیا ہے۔جس کی کرپشن کو پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔شام بھی کرپشن میں لیبیا سے کسی بھی طور پر پیچھے نہیں تھا۔

افراطِ زر میں اضافہ

افراطِ زر:- افراطِ زر (Inflation) زری معاشیات کی اہم اصطلاح ہے۔تعریف کے مطابق کسی معیشت میں موجوداشیاکی قیمتوں میں مسلسل اضافےکی شرح کوافراطِ زر کہتے ہیں۔افراطِ زر میں مسلسل اضافہ کا رجحان مہنگائی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

تاہم ہرمعیشت میں کم وبیش افراطِ زرکی موجودگی قدرتی امر ہے۔ یہ اوسطاً 5 سے 6 فیصد سالانہ رہتا ہے۔ تاہم دیوالیہ معیشتوں میں افراطِزر ہزار فیصد سے بھی تجاوز کر سکتا ہے۔اسکومعقول حدود میں رکھنا مرکزی بینک کابنیادی وظیفہ ہے۔افراطِ زر کی بنیادی وجہ حکومت کااپنی آمدنی بڑھانے کے لیے زیادہ نوٹ چھاپناہے۔

افراطزرکیاہے؟کسی چیز کی قیمت بڑھتی ہے تو اسے افراطِ زر (مہنگائی) کہتے ہیں لیکن یہاں جس افراطِ زرکی بات ہورہی ہےوہ کسی ایک دو یا درجنوں اشیاءکی بات نہیں۔

---

[1] Corruption Perception Index, Transparency International, 2009

سادہ زبان میں کہا جائے تو کسی معیشت میں مجموعی طور پر جتنی اشیاء خریدی جاتی ہیں اس کی اوسطاً قیمت اگر بڑھتی ہے تو ہم اسے افراطِ زر کہتے ہیں۔

افراط زر میں اضافہ کیسے ہوتا ہے؟

اشیاء کی قیمت بڑھنے کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ اشیاء کی تیاری کی لاگت بڑھ جاتی ہے، مطلب خام مال کی قیمت زیادہ ہوئی یا پھر اجرت زیادہ لگی اس پر جو خرچہ زیادہ ہوا تو قیمت بھی بڑھ جائے گی۔ اسے "Costpushinflation" کہتے ہیں۔

دوسری وجہ محدودیت ہے۔یعنی مارکیٹ میں مال کم ہے لیکن خریدار زیادہ ہیں۔کچھ گاہک زیادہ پیسہ دینے کو بھی تیار ہوتے ہیں اسے "Demandpushinflation" کہتے ہیں۔

یہاں مثال تیل کی قیمت کی ہے۔اگر تیل کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو وہ Costpushinflation ہے۔کیونکہ اسی ایندھن کی مدد سے چلنے والا ٹرک اشیاء منڈیوں تک پہنچاتا ہے۔یوں تیل کی قیمت میں اضافے کا اثر ان تمام چیزوں کی قیمت پر پڑے گا اور وہ بڑھ جائے گی۔

اورایک وجہ نوٹ چھاپنا بھی ہے۔ اگر حکومت زیادہ پیسے چھاپتی ہے تو پھر لوگوں کے پاس زیادہ پیسے آجاتے ہیں۔ منڈی میں چیزیں محدود ہوتی ہیں اور لوگوں کے پاس پیسے زیادہ ہوتے ہیں تو اس سے بھی چیز مہنگی ہوتی ہے۔اسے Demandpushinflation" کہتے ہیں۔

زراعت کی تباہی

شام کے تنازعہ کے چھٹے سال، ایف اےاو کے نقصان کے جائزے میں آبپاشی کے نظام، ذخیرہ کرنے کی سہولیات اور کاشتکاری کے سامان میں مادی نقصان شامل تھا۔ لڑائی کے دوران بڑی تعداد میں زرعی اراضی تباہ کر دی گئی تھی یا انہیں جزوی طور پر نقصان پہنچایا گیا۔

بڑھتی ہوئی عدم تحفظ نے تجارت اور رسد میں رکاوٹ پیدا کردی جس کی وجہ سے کھاد، بجلی اور مزدور قوت میں قلت پیدا ہوگئی۔ اسی طرح پیداوار تیزی سے اور نمایاں طور پر کم ہوتی رہی، مسلسل خشک سالی نے ہی پہلے سے ہی سنگین صورتحال کو بڑھاوادیا۔

عالمی بینک کے مطابق، تنازعات سے پہلے کی شرح کے مقابلہ میں 2015 میں زراعت جی ڈی پی میں 41 فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔[(1)]

---

[1] عالمی بینک رپورٹ،2015ء، سیریا

متحارب فریقین نے زرعی پیداوار پر مزید اثر ڈالا ہے اوراس شعبے میں بڑے پیمانے پر ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ جو علاقے مسلح گروہوں کے زیر قبضہ تھے وہاں مسلح گروہوں نے محصولات میں اضافے کے لیے products مصنوعات پر ٹیکس عائد کیا ہے، جبکہ شام کی حکومت کے محاصرے کے ہتھکنڈوں نے پیداوار سپلائی چین سے علاقوں کو ختم کر دیا ہے، اور آبادی اپنا کھانا تیار کرنے سے قاصر ہیں۔ معاملات مزید خرابی کی طرف تب گئے جب حکومت کی طرف سے جنگی کوششوں کے لئے ریاستی وسائل کو استعمال کیا گیا، اور اسکے ساتھ ہی اس سے زرعی اراضی تک رسائی نہ ہونے سے اسکی پیداوار کی خریداری میں کمی واقع ہوئی ہے، جس سے کاشتکاروں کو ان کے اصل خریدار کے نقصان پر بری طرح متاثر کیا گیا۔

اقوام متحدہ کی فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2010ء سے پہلے زراعت کا شعبہ کل ملکی ملازمتوں کا تقریباً 20 فیصد ملازمتیں فراہم کرتا تھا۔ زراعت کا شعبہ شامی معیشت کا اہم ستون مانا جاتا تھا۔ جبکہ خانہ جنگی کی بدولت نصف سے زائد افراد کو اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ زراعت کا شعبہ تقریباً مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔[1]

دی گارڈین کی 2015ء کی رپورٹ کے مطابق جنگ کے بہت سے محاذ آرائیاں دیہی کھیتوں کے اندر یا اس کے آس پاس واقع ہوئی ہیں، جس کے نتیجے میں ان علاقوں سے رہائش پذیر خاندانوں میں زیادہ ہلاکتیں ہوئیں اور لڑائی کرنے والے گروہوں نے انکی زمین ضبط کر دی۔

ہزاروں افراد اپنی زمین اور روزگار چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہوگئے۔ ان لوگوں کو پیداوار کی بڑھتی قیمت نے ان کی آمدنی پیدا کرنے اور اپنے اہل خانہ کو کھانا کھلانے کی صلاحیت میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ 2017ء میں شامی شہریوں نے اپنی آمدنی کا 50٪ سے زیادہ خوراک پر خرچ کیا، جبکہ اس تنازعہ سے قبل یہ شرح 25 فیصد تھی۔ شامی بحران کی وجہ سے شامی زراعت کو اب تک 16 بلین ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔[2]

زراعت شام کی معیشت، ثقافت اور معاش کا ایک اہم جز ہے اور اس صنعت کو پائیدار طریقے سے استوار کرنے کی پائیدار کوششوں کے بغیر شامی باشندوں کو جلد ہی کھانے کی سنگین عدم تحفظ اور زبردست بے روزگاری کے بحران کا سامنا کرنا پڑا ہے، یہ دونوں محرکات لامحالہ تنازعہ کو دوبارہ زندہ کر دیں گے۔

---

[1] Food & Agriculture Organization of the United Nations: Counting the cost: Agriculture in Syria, April 2017

[2] The Guardian, Syria War 1, March 12, 2015, Associated Press

تیل کی پیداوار میں کمی

شام کی حکومت کی آمدن میں تیل اور گیس سے حاصل ہونے والی دولت کا ایک اہم کردار ہے۔ اگرچہ شام کے پاس تیل کے ذخائر مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک کی نسبت کافی کم ہیں۔ 2018ء کے تخمینوں کے لحاظ سے شام کے پاس ڈھائی ارب بیرلز کے تیل کے ذخائر موجود تھے۔ جبکہ سعودی عرب کے ذخائر 270 ارب بیرلز ہیں۔ ایران کے 170 ارب بیرلز ہیں۔ اور عراق کے 147 ارب بیرلز ہیں۔ شام کے تیل کے ذخائر مشرقی حصے دیر الزور کے صوبے میں ہیں۔ جو کہ عراقی سرحد کے قریب واقع ہے لیکن شام میں تیل کی پیداوار 2011ء سے شروع ہونے والی خانہ جنگی کے بعد سے بیٹھ گئی ہے۔

برٹش پیٹرولیم سٹیٹسکل ریویو آف دی ورلڈ فار 2019ء کے مطابق، 2008ء میں شام تقریباً 4 لاکھ بیرل روزانہ تیل پیدا کرتا تھا۔ 2011ء میں تیل کی پیداوار گر کر ساڑھے تین لاکھ بیرل ہو گئی جو کہ 2018ء میں صرف 24 ہزار بیرل تھی یعنی 90 فیصد تیل کی پیداوار میں کمی دیکھی گئی۔ [1]

دمشق کا تیل کی پیداوار پر کنٹرول ختم ہو چکا ہے

بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق شامی حکومت کا ملک کے تیل پیدا کرنے والے علاقوں میں حکومتی رِٹ مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے جس کی وجہ سے تیل کی پیداوار میں خاطر خواہ کمی واقع ہو رہی ہے۔ رپورٹ کے مطابق:

بشار الاسد کی دمشق کی حکومت شمالی شام میں واقع تیل کے کنوؤں پر اپنا کنٹرول مکمل طور پر کھو چکی ہے اور ان کنوؤں پر ان کے مخالفین اور دولت اسلامیہ کے جنگجوؤں کا قبضہ ہو گیا۔ 2014ء میں شام کے مشرقی علاقوں میں جن میں دیر الزور صوبہ میں واقع تیل کا سب سے بڑا کنواں بھی شامل تھا جس پر جنگجوؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اور دولتِ اسلامیہ 2015ء میں اس وقت تیل کی فروخت سے ماہانہ 4 کروڑ ڈالر کما رہی تھی۔ شام کے تیل کے کنوؤں کو اس وقت نقصان پہنچا تھا جب امریکہ نے انہیں دولت اسلامیہ کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے اس خطے میں سخت بمباری کی تھی تا کہ دولتِ اسلامیہ کی آمدن کے سلسلے کو منقطع کیا جا سکے۔ دولتِ اسلامیہ کے جنگجوؤں نے بھی بچی کچھی تیل کی تنصیبات کو تباہ کر دیا جب انہوں نے دیکھا کہ یہ کنویں اب ان کے ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔ [2]

---

[1] British Petrolium Statical Review of the World, Edition 68, 2019

[2] بی بی سی، شام میں جنگ، 21 نومبر 2019ء

فصل سوم

معاشرتی انتشار

شامی سماجی ساخت ٹوٹ پھوٹ کا شکار

اس بحران کی وجہ سے شامی معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ مشرق وسطی میں شام کی سرزمین ایک ایسی جگہ متصور کی جاتی تھی کہ جہاں مذہبی لحاظ سے بہت زیادہ تنوع اور ہم آہنگی موجود تھی۔ اسی طرح نسلی اعتبار سے بھی رنگا رنگی اور تنوع تھے مگر اس کے باجود یہ اختلاف یہاں کا حسن سمجھا جاتا تھا۔ لوگ پر امن تھے اور لڑائی جھگڑے سے دور رہتے تھے۔ اس کی وجہ جہاں ایک حد تک طبعی مزاج تھا وہیں ایک اور سبب تاریخی جبر کا بھی کارفرما تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے 70 کی دہائی کی شروعات تک شام میں بدامنی اور عدم استحکام رہا تھا۔ طاقت کی رسہ کشی اور اقتدار کی راہداریوں کی جانب سے عوام پر جبر کا طویل عرصہ مسلط رہا تھا۔ یہاں اس سارے عرصے میں مختلف حکومتیں قائم رہی تھیں مگر یہ سب آمرانہ اور جابرانہ تھیں۔[1] اس میں عوامی شعور ورضا کا کوئی عمل دخل نہیں لیکن اس سارے عرصے میں عوامی سطح پر تبدیلی کی ایک کشمکش جاری رہی تھی۔ دانشوروں اور تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے تسلسل کے ساتھ یک مزاحمت کی تحریک بھی جاری رہی۔

مگر ستر کی دہائی سے شام کے اقتدار پر اسد خاندان براجمان ہے۔ یہ بھی ایک آمرانہ حکومت رہی ہے مگر اس کی خاصیت یہ رہی کہ اس نے شروع میں عوامی سطح پر اٹھنے والی تحریکوں کو نہایت جبر اور خونریزی کے ذریعے سے دبادیا تھا۔ مصنفین کے مطابق 1982ء کے بعد سے شامی معاشرے میں ایسی کوئی تحریک نہیں چلی تھی جو سیاسی نوعیت کی ہو اور عوام کو سڑکوں پر لا سکی ہو۔ اس کا سبب وہ واقعات و حالات تھے جو ماضی میں تبدیلی لانے کی کوششوں کے دوران بیت چکے تھے۔ اس لیے وہاں معاشرے کے اندر یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ بھلائی اسی میں ہے کہ خاموشی کے ساتھ آگے بڑھا جائے اور کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔ گویا شامی معاشرے کے اندر حقوق کے حصول اور تبدیلی کے لیے ایک لاوا تو موجود تھا لیکن وہ اسے باہر نہیں لا سکتے تھے۔[2]

اب گزشتہ دس سالہ خانہ جنگی نے شامی معاشرے کے اندر کئی طرح کے مسائل پیدا کر دیے جو نہایت پیچیدہ اور مشکلات سے بھرپور ہیں۔ اس خانہ جنگی نے شامی معاشرے میں سب سے پہلے خاندانی ڈھانچے کو شدید متاثر کیا

---

[1] مجلہ البیان، لندن، جولائی، 2018ء

[2] ایضاً

ہے، اور اس کے بعد مجموعی طور پہ سماجی ساخت کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔(1) ایک ایسی حالت کہ جس میں نیچے سے لے کر اوپر تک سماجی ساخت کو تحفظ دینے والا ڈھانچہ اچانک دھڑام سے گر گیا ہو ایسے حالات میں لوگوں کے لیے اپنی ترجیحات کو حقیقت کا لبادہ پہنانے کی سعی تو ناممکن ہو ہی جاتی ہے، بلکہ لوگوں کے لیے اپنی جان کی حفاظت اور روٹی کا حصول ہی سب سے بڑا حقیقت اور ترجیح بن گئی ہے۔

خانہ جنگی اور معاشرے کا منقسم سیاسی موقف

شامی خانہ جنگی نے ملک کے اندر ایک سیاسی بحران کو جنم دیا ہے۔ اس بحران نے لوگوں کو تقسیم کر دیا ہے اور ان کے مابین آپس میں منافرت پیدا ہوئی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ کہ جس کی ہم آہنگی کی مشرق وسطی میں مثال دی جاتی تھی کہ جو مذہبی اور نسلی اعتبار سے متنوع ہے مگر اس کے باوجود وہاں امن اور باہمی احترام کبھی کم نہیں ہوا اس معاشرے میں اب خانہ جنگی اور انقلاب کے بارے میں سیاسی موقف کی وجہ سے شدید تقسیم پیدا ہوئی ہے۔ کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حکومت کے خلاف سڑکوں پر آنا درست عمل نہیں تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ مظاہروں میں شامی لوگوں کو استعمال کیا گیا۔ جبکہ بعض دیگر افراد کا موقف ہے کہ شامی حکومت کے خلاف کھڑا ہونا درست اقدام تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی طرح کے سیاسی موقف معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ ایک دوسرے کو ذمہ دار قرار دیتے یا مخالف گروہ کا ہمنوا سمجھتے ہیں جس سے باہمی احترام کم یا ختم ہوا ہے اور لوگوں میں منافرت کا احساس پیدا ہوا ہے۔ رشتوں میں دراڑیں آئی ہیں اور لوگوں میں باہمی سطح پر اعتماد کی کمی واقع ہوئی ہے۔ ایسے مسائل نے شامی سماجی ساخت کو بری طرح متأثر کیا ہے۔(2)

شامی معاشرہ فرقہ وارانہ اختلافات میں بھی تقسیم کا شکار ہوا ہے۔ مذہبی اختلافات جو پہلے یہاں کسی بھی سطح پر قابل گرفت نہیں سمجھے جاتے تھے اب قابل گردن زنی ٹھہرے ہیں۔ اس کی ایک وجہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر مختلف ملیشیاؤں کا فعال ہونا اور ان اساسات پر جتھوں کی صورت ایک دوسرے کے خون کو مباح بنانا ہے۔ ایسے گروہ شامی سماجی ساخت سے نہیں ابھرے ہیں بلکہ دیگر ممالک کی شہ پر اتارے گئے تھے جو اب ایک ایسی حقیقت بن چکے ہیں کہ اب وہاں لوگوں کے لیے یہ مشکل ہو گیا ہے کہ وہ گروہی تفریق سے اپنی جان چھڑا سکیں یا اس سے کنارہ کشی اختیار کر سکیں۔(3) شامی معاشرہ طوعاؤ کرھاً فرقہ وارانہ گروہی تفریق سے فرار اختیار نہیں کر سکتا۔

---

[1] Christopher Philips, The Battle for Syria(Yale University Press, (2016),44

[2] ایضاً47

[3] مجلہ دستور، پیرس، جنوری،2019ء

معاشرے میں جرائم کی شرح میں اضافہ

رپورٹس کے مطابق شامی نوجوانوں کے اندر کئی طرح کے جرائم کی طرف میلان میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے ایک منشیات کا استعمال ہے۔ سروے کے مطابق خانہ جنگی سے قبل شامی معاشرے منشیات کے استعمال میں مشرق وسطی کے ممالک میں سب سے نچلے درجے پر آتا تھا۔ یعنی کہ ان میں منشیات کا استعمال بہت کم تھا لیکن اب خانہ جنگی کے دس سالوں بعد یہاں نوجوانوں میں اس مرض میں ابتلاء کا تناسب مشرق وسطی میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ مایوسی اور جنگ سے بیزاری و فرار کی کوشش بھی ہے کہ نوجوانوں کو اپنا مستقبل تباہ نظر آتا ہے، یا ان کو خاندانی سطح پر جو جسمانی یا مالی نقصانات اٹھانے پڑے ہیں یہ تکلیف انہیں منشیات کی طرف لے کر آئی کہ ہے کہ وہ اس بھیانک حقیقت سے خود کو دور لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ منشیات کی طرف میلان کی ایک وجہ منشیات فروشی کے کاروبار سے منسلک گروہوں کا فعال ہونا بھی ہے کہ اس خانہ جنگی کے دوران انہیں قانونی گرفت کا کوئی خطرہ نہیں رہا یوں شامی معاشرہ ان کے لیے ایک منافع بخش منڈی بن گیا ہے جہاں آسانی کے ساتھ منشیات فروخت کی جاسکتی ہیں اور نوجوانوں کو اس کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔[1]

شام کو آبادی میں اضافے کا بھی سامنا ہے۔ حکومت کے وزیر خزانہ محمد الحسین نے چند ہفتے قبل پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ حکومت ایگریکلچرل ڈیزاسٹر فنڈ قائم کرنے کی پلاننگ کر رہی ہے لیکن ابھی تک اُس کا اعلان نہیں ہو سکا ہے۔

شام ایک دور میں گندم دوسرے ملکوں کو بیچ کر کثیر زرمبادلہ کمایا کرتا تھا لیکن اب اُس کو گندم خریدنا پڑ رہی ہے۔ شام کے اندر موجود حکومت مخالف ناقدین کا خیال ہے کہ اِس کی بڑی وجہ ملک کے اندر ایک جامع اقتصادی پالیسی کا نہ ہونا ہے۔ سن اُنیس سو تریسٹھ میں بعث پارٹی نے ایک بغاوت کے بعد شام میں حکومت سنبھالی تھی۔ ابھی بھی اِس ایک جماعت کی ہی حکومت چلی آرہی ہے۔

وہ دریا، جن سے لوگ مچھلیاں پکڑ کر لذتِ کام و دہن کی تکمیل کرتے تھے، اُن میں اب پانی کم ہو کر میلا ہو گیا ہے۔ زمین کے اندر بنائے گئے کنوئیں، جو میٹھے پانی کا خزانہ ہوا کرتے تھے، اب خشک ہوتے جارہے ہیں۔

شام، مشرق وسطیٰ میں اناج کی پیداوار کی وجہ سے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں کی گندم، زیتون، پھل، سبزیاں اور مویشی دوسرے عرب ملکوں کی منڈیوں میں خاص طور پر پسند کئے جاتے تھے۔ شام کی آدھی آبادی کا ذریعہ ء معاش

---

[1] مجلہ دستور، 138، پیرس، جنوری 2019ء

کھیتی باڑی رہا ہے۔ شام میں دریائی پانی کے علاوہ چار لاکھ بیس ہزار کنوئیں بھی کھیتوں کو ہریالی دیتے رہے ہیں۔ شام میں کنواں کھودنے کے لئے حکومت سے اجازت لینا ہوتی ہے۔

زراعت کے اعتبار سے شام کا شمال مشرقی صوبہ الحکصہ یا حصاکہ، خاص طور پر اہم تھا۔ اِس بڑے صوبے کو دجلہ کے علاوہ الخابور دریا زرخیزی دیتے تھے۔ الخابور کا پانی ترکی کے کنٹرول میں ہے۔ دجلہ عراق کے ساتھ صرف سرحد سازی کرتا ہے۔ گزشتہ سال کے مقابلے میں یہاں گندم کی پیداوار میں تقریباً ایک ملین ٹن کی کمی واقع ہو چکی ہے۔

گدلا پانی پینے سے بیماریوں کی شرح افزائش کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ تیرہ لاکھ شامی پانی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہو چکے ہیں۔

فصل چہارم

مذہبی اور فرقہ وارانہ کشمکش

فرقہ واریت کا تعارف

فرقہ یہ عربی زبان کا لفظ "فرق" سے مشتق ہے جس کا معنیٰ جدا کرنا الگ کرنا اور فرقہ کے معنیٰ "جماعت یا گروہ" کے ہیں۔[1]

"فرقہ کے معنی جماعت یا گروہ کے ہیں۔ یہ لفظ "فرق" سے مشتق ہے، جس کے معنی الگ کرنا/جدا ہونا ہے۔ دوسرے الفاظ میں فرقہ کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ فرقہ کسی بھی مذہب، جماعت (سیاسی یا مذہبی) یا گروپ کا ذیلی حصہ ہوتا ہے جو اپنے الگ خیالات و نظریات کی وجہ سے الگ جانا جاتا ہے"۔

یعنی فرقہ کو ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ فرقہ کسی بھی مذہب، جماعت یا گروپ کا ذیلی حصہ ہوتا ہے۔ جو اپنے الگ خیالات و نظریات کی وجہ سے الگ سے جانا جاتا ہے۔

اسلام میں فرقہ واریت کی حیثیت

قرآن کریم میں فرقہ کا ذکر

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ (فَرِيقًا هَدٰى وَ فَرِيقًا حَقَّ عَلَيهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِينَ اَولِيَآءَ مِن دُونِ اللّٰهِ وَ يَحسَبُونَ اَنَّهُم مُّهتَدُونَ)[2]

ترجمہ: "ایک گروہ کو ہدایت عطا کی اور ایک گروہ پر گمراہی واجب ہو چکی، ان لوگوں نے اللہ کے ماسوا شیاطین کو اپنا دوست بنایا اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں "۔

امت محمدیہ ﷺ میں افتراق کی ابتداء

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے موقع پر جب بعض صحابہ کے مابین خلافت کے معاملہ پر کشمکش شروع ہوگئی اور قریب تھا کہ ان کی تلواریں آپس میں ٹکرا جاتیں، تب سے ہی مومنین کی جماعت افتراق و انتشار کا شکار ہونے لگی لیکن پھر وہ معاملہ ابوبکر صدیقؓ کی فہم و فراست کے باعث دب گیا۔ جس چیز نے

---

1 مصباح اللغات، مولانا عبدالحفیظ بلیلاوی، ص،630، مکتبہ قدوس، زیلدار روڈ، اچھرہ لاہور۔

2 الاعراف،30/7

خلافت اسلامیہ کی کمر توڑ دی ہے وہ فرقہ پرستی ہے اسلام کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ خلافت اسلامیہ کو جتنا نقصان فرقہ پرستی اور گروہ بندی نے پہنچایا ہے اتنا نقصان نہ عیسائیوں نے پہنچایا ہے اور نہ یہودیوں نے۔ خلافت اسلامیہ میں پہلی دراڑ فرقہ پرستی ہی کی شاخسانہ تھی۔

عہد عثمانیؓ میں ملت اسلامیہ پر پہلا حملہ اسی راستہ سے کیا گیا۔ عبداللہ بن سبا دراصل یہودی تھا یا عیسائی۔ لیکن وہ آیا ایک مسلمان اور محب اہلبیت کے روپ میں تھا۔[1] وہ اسلام کے مقابلہ میں کافر بن کے آیا نہیں تھا۔ بلکہ اس دعویٰ کے ساتھ آیا تھا کہ خلافت اہلبیت کا حق ہے۔ دوسروں نے خواہ مخواہ اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہی فتنہ حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت پر منتج ہوا۔ خلافت اسلامیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ امت کی وحدت کو شدید دھچکا لگا۔ اور امت ہمیشہ کے لیے دو گروہوں میں بٹ گئی۔ [2]

حضرت علیؓ کے عہد میں خوارج نمودار ہو گئے بظاہر جمہوریت کے علمبردار اور تقویٰ وتدین کے ہما تھے۔ اپنے اعتقادات کی اشاعت پر جان کی بازی لگانا ان کے لیے معمولی بات تھی۔

اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے خود ساختہ عقیدوں اور انتہا پسندی کے سبب اسلامی حکومتوں کو جتنا نقصان ان کے ہاتھوں اٹھانا پڑا۔ اتنا کسی اور سیاسی گروہ کے ہاتھوں نہیں اٹھانا پڑا۔ شروع میں حضرت علیؓ نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر تمام کوششیں بے سود اور رائیگاں گئیں۔ لیکن ان کا پوری طرح قلع قمع نہ ہوا پھر حضرت علیؓ کی شہادت انہی لوگوں کی سازش تھی۔ [3]

دوسری صدی ہجری میں جب غیر عرب اقوام دامن اسلام سے وابستہ ہونے لگیں اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے تو ایسے میں کئی فرق باطل جن سے (خوارج، زنادقہ، جھمیہ وغیرہ) کا وجود میں آنا اور اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور ہر فرقہ کا اپنے عقائد کی تائید میں آیات قرآنی اور احادیث طیبہ کا خود ساختہ معنیٰ و مفہوم مراد لینا غیر عرب نو مسلم اور عوام الناس کے لیے ایک لمحہ فکریہ تھا، ایسے حالات میں ان باطل فرق اور ان کے عقائد و افکار کا بطلان اور عقائد اسلامیہ کو عوام الناس کے لیے حقیقی اور اصلی صورت میں پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت تھی کیونکہ اہل ایمان کے لیے اسلامی عقائد فکری استحکام پیدا کرتے ہیں یہ فکری استحکام ایمان ویقین کی وجہ سے صاحب ایمان کو ہر قسم کی فکری بے راہ روی سے محفوظ کر کے حق و صداقت کی جانب گامزن کرتا ہے۔

---

[1] ابن عساکر، تاریخ دمشق، جلد 3 صفحہ 29، قاھرہ، مکتبۃ الخانجی، 1988ء

[2] امت مسلمہ کا عروج وزوال، پروفیسر حبیب اللہ چشتی، ص،196، ضیاء القرآن پبلیکیشنز کراچی، 2005

[3] ایضاً

امت مسلمہ میں افتراق و انتشار کا یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ عہد عباسی کے بعض خلفاء کی طرف سے ان باطل فرق کو سیاسی تعاون بھی میسر آنے لگا اور (۸۱ھ) میں یہ فتنہ اور شدت اختیار کر گیا، جب خلیفہ مامون نے لوگوں کو جبرا جہمیہ اور معتزلہ کے عقائد کو اپنانے کی سرکاری سطح پر دعوت دینا شروع کر دی۔ ایسے پر فتن دور میں جلیل القدر تابعین کرام میدان عمل میں آئے اور ان باطل فرق کے ساتھ جدل و مناظرات کا سلسلہ شروع کیا تاکہ ان کے باطل عقائد اور افکار و نظریات کو رد کیا جا سکے اور حقیقی اسلامی عقائد کو مدون صورت میں پیش کیا جائے تاکہ امت مسلمہ میں افتراق و انتشار اور مذہبی تعصبات و عناد کی کیفیات ختم ہو جائیں اور باہم امن و سلامتی اور اتحاد و اتفاق کی فضاء قائم ہو جائے۔ اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مناظرات و مجادلات قابل ذکر ہیں جن میں آپ نے خوارج، معتزلہ، زنادقہ، دہریہ و غیرہ کے باطل افکار و نظریات کا رد فرمایا اور عقائد اسلامیہ کو دلائل و شواہد سے ثابت کیا۔ [1]

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ نے ان باطل فرق کے ساتھ مناظرات و جدل کا سلسلہ جاری رکھا اور زنادقہ اور جھمیہ کے رد میں (السنۃوالرد علی الزنادقہ والجہمیہ) تین جلدوں پر مشتمل کتاب تالیف کی اور عقائد اسلامیہ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں مدون فرمایا ایسے ہی کئی جلیل القدر تابعین کرام نے اس میدان میں خدمات سر انجام دیں تاکہ امت اسلامیہ متحد و منظم رہے۔

شام میں موجودہ بحران کے نتیجے میں فرقہ واریت کا خطرہ

جب شامی انقلاب کے آثار ملک میں شروع ہوئے اور عوام سڑکوں پر نکل کر احتجاج کرنے لگے تو اس وقت اس لہر کو ایک عوامی لہر کے طور پہ دیکھا جا رہا تھا۔ تب اس کے اندر کسی طور فرقہ واریت کے راجحانات موجود نہیں تھے۔ ملک میں آمرانہ نظام اور حقوق کی پامالیوں کے سبب عوامی سطح پر ایک ناراضی پہلے سے موجود تھی۔ اس لیے جب عرب بہار کی ابتداء ہوئی اور شام بھی اس کی لپیٹ میں آیا تو یہی سمجھا گیا کہ یہ مظاہرے عوامی رد عمل ہیں۔ ٹیلی وژن پر سیاسی ماہرین کے تبصرے بھی اسی نوعیت کے تھے اور مشرق وسطی کے اخبارات بھی شامی مظاہروں کو اسی تناظر میں بیان کر رہے تھے۔ لیکن اس دوران ملکی سطح پر ایسی تبدلیاں رونما ہوئیں جن کی وجہ سے ان احتجاجات میں پہلی بار فرقہ واریت کا رنگ ظاہر ہونا شروع ہوا اور لوگ اس زاویے سے تبصرے کرنے لگے۔ [2]

---

[1] Barah Mikail, FRIDE Policy Briefs, June, 2012, Madrid, span

[2] محمد حسین ہیکل، ماالذی جری فی سوریا(القاہرہ، مکتبہ طیاف، 2014ء)33

ایک تو حکومت کی جانب سے عام شہریوں کو احتجاج کا حصہ بننے سے روکنے کی غرض سے نشانہ بنایا جانے لگا اور ان پر تشدد کیا جانے لگا۔ چونکہ اس تشدد اور پکڑ دھکڑ میں زیادہ تر نشانہ سنی شہری تھے اس لیے عمومی تاثر یہ ابھرنے لگا کہ یہ نظام علوی اور شیعہ ہے۔[1]

دوسرا سبب یہ تھا کہ خود حکومت کی جانب سے کبھی اس کو خارجی سازش کے طور پہ بیان کیا جانے لگا تھا اور کبھی اسے فرقہ وارانہ رنگ میں دیکھا جانے لگا کہ مشرق وسطی کی بعض سنی طاقتور ریاستیں ان احتجاجوں کو سپورٹ کر رہی ہیں۔ اس دوران یہ تبدیلی بھی رونما ہوئی کہ حکومتی نظام کی جانب سے کچھ ملیشیاؤں کا استعمال کیا جانے لگا جو فرقہ وارانہ نوعیت کی تھیں۔ اس کا مقصد عوامی مظاہروں کی روک تھام تھا۔ اس اقدام کے بعد عوام کی جانب سے بھی اس نوع کے گروہ اور دھڑے سامنے آنے لگے اور رفتہ رفتہ یہ ایک فرقہ وارانہ خانہ جنگی کے اندر تبدیل ہو گیا۔[2]

تیسرا سبب یہ تھا کہ اس انقلاب کے بعد مظاہروں اور حکومت کی حمایت یا مخالفت کے اندر خطے کے ممالک میں جو تقسیم سامنے آئی وہ بھی لگ بھگ فرقہ وارانہ رنگ لیے ہوئے تھی۔ شامی حکومت کی حمایت میں عراق، ایران اور حزب اللہ[3] سامنے آئے جبکہ عوامی مظاہروں کی حمایت میں سعودی عرب اور دیگر سنی ریاستیں آگے بڑھیں۔ یوں ان کے میڈیا اور صحافتی حلقے اپنی اپنی سطح پر اس انقلاب کو فرقہ وارانہ تناظر میں دیکھنے اور اس پر تبصرے کرنے لگے۔ اس سے بھی یہ تاثر قوی ہوتا گیا کہ شامی سرزمین پر ایک فرقہ وارانہ خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ اور وہاں بھی عملاً یہی صورتحال بنتی چلی گئی۔[4]

بعض مفکرین کے مطابق اس میں ایک کردار میڈیا کا بھی رہا ہے۔ شام سے باہر کا میڈیا بھی چاہے وہ سنی طبقات کا ہو یا شیعہ گروہوں کا، دونوں کی جانب سے شام کی صورتحال کو منفی تاثر دیا جاتا رہا۔ پاکستان سمیت عرب دنیا کے میڈیا میں بعض حلقے اس کو شیعہ سنی لڑائی قرار دے رہے تھے۔[5] خلیجی ممالک اور عرب دنیا میں شیخ عرعور کا شمار صف اول کی علمی شخصیات میں ہوتا ہے اور ان کا دائرہ اثر بھی بہت وسیع ہے۔ انہوں نے شروع سے ہی صفا اور وصال ٹی وی

---

[1] محمد حسین ہیکل، ماالذی جری فی سوریا(القاہرہ، مکتبہ طیاف، 2014ء)38

[2] ایضاً39

[3] Elon, amos, herted, newyork: Holt,Rinehart and Winston, 23

[4] الدکتاتوریہ محنۃ الاسلام، 98

[5] عروہ التاج، الاستقلال الثانی نحو مبادرۃ الاصلاح السیاسی فی العالم العربی، 150۔

پر اس انقلاب کو سنی اور شیعہ مسالک کی لڑائی قرار دیا اور عوام کے اندر یہ بات راسخ کرتے رہے کہ وہ اس بحران کو انسانی و شہری حقوق کے تناظر میں دیکھنے کی بجائے مسلکی دائروں میں پرکھیں۔[1]
فرقہ وارانہ بنیادوں پر شروع ہونے والے قتل کا سلسلہ یہیں نہیں رکا بلکہ اس سے آگے بڑھتا چلا گیا اور خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ ملک میں مقامی سطح کی کئی ایسی جہادی تنظیمیں وجود میں آگئیں جو ایک دوسرے کو مسلک کی بنیاد پر مار رہی تھیں۔ ان تنظیموں کو صرف داخلی سطح پر ہی تعاون میسر نہیں تھا بلکہ انہیں باہر کے متعدد مسلم ممالک سہارا دے رہے تھے۔ یا ان کے پیچھے مغربی قوتیں تھیں۔[2] تاہم ان کا کردار فرقہ وارانہ تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ "شامی بحران" کی تحریکیں مسلح گروپ کی شکل اختیار کر رہی ہیں۔ تشدد کا راستہ اختیار کر رہی ہیں۔ بادی النظر میں یہ تحریکیں اب پرامن نہیں رہیں۔ مصر میں بم دھماکے ہوں یا لیبیا میں۔ اور شام کی جنگ تو اب واضح صورت اختیار کرچکی ہے۔ اور یہ جنگ فرقہ واریت کا روپ اختیار کرچکی ہے۔ حالیہ عرب بحران کے نتیجے میں اکثر مسلم ممالک میں فرقہ واریت میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ FRIDE کے سینئر، ریسرچر اپنے آرٹیکل میں اس کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

While the Arab spring has led to greater Sectarianism across the Arab world. This trend does not justify people turning their back on democratic reforms. The obstructions posed by sectarianism are actually overblown.[3]

"عرب بہار نے فرقہ واریت کو عرب دنیا میں پھیلانے میں ایک کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے خیالات جمہوریت کی طرف راغب نہ ہوسکیں۔ فرقہ واریت سے پھیلنے والے اس عذاب نے درحقیقت اس رجحان کا خاتمہ کر دیا ہے"۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالیہ شامی بحران کے منفی اثرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان فرقہ واریت میں اضافہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اب یہ فرقہ واریت کس کے درمیان اور کیسے ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے "Barah Mikail" مزید لکھتا ہے کہ:۔

---

[1] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 420۔

[2] Sectarianism and Sectarian System in Syria,26

[3] ایضاً

Sectarianism has experienced a boost in the aftermath of popular uprisings in the Arab world. Recent Sectarian strife following the fall of Arab authoritarian leaders has been provoked by ideological rifts between Islamist and secularists, and between conservatives and liberals, as well as by religions divisions between Sunni and shias, Muslims and Christians.(1)

"حالیہ مقبول "عرب بہار" کے بعد عرب دنیا میں فرقہ واریت کے فروغ کا تحریر کیا گیا ہے۔ عرب آمرانہ رہنماؤں کے زوال کے بعد اسلام پسندوں اور سیکولر کے درمیان نظریاتی اختلافات کو اکسایا گیا ہے۔ اسی طرح قدامت پسندوں اور لبرل کے ساتھ ساتھ سنی اور شیعہ، مسلمان اور عیسائیوں کے درمیان مذہبی تقسیم کو بھی ہوا دی گئی ہے"۔

فرقہ واریت میں اضافہ پر بی بی سی رپورٹ

بی بی سی کے رپورٹر جرمی بوون نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں رپورٹ کیا گیا کہ "عرب سپرنگ" کے بعد فرقہ واریت کتنی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ وہ اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

"One of the dominant issues to emerge in three years of Arab uprisngs across the middle east has been the divid between Sunni and Shia Muslims. Iraq Bahrain and Lebanon, among other countries, have witnessed a surge in sectarian-related violence. It divides shia and sunni muslims, The two sides of Islam.(1)

"نہایت ہی اہم ایشو میں سے ایک یہ ہے کہ "عرب بہار" کے بعد خلیجی ممالک میں شیعہ اور سنی مسلمانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی مذہبی تقسیم ہے۔ جس کی واضح گواہی عراق، بحرین، لبنان اور اس جیسے دیگر ممالک کی متشدد صورتحال ہے جس نے شیعہ اور سنی مسلمانوں کو اسلام کے دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔"

اس تمام صورت حال پر نظر دوڑانے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "حالیہ شامی بحران" کے بعد اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے درمیان فرقہ واریت پروان چڑھ رہی ہے۔ اور یہ سلسلہ تھمنے کا نام تک نہیں

---

1 Jermy Bowen, Surge in Arab Sectarian Violence After Arab Uprising BBC news 20 September, 2013

لے رہا۔ بلکہ یہ مسلسل پھیلتا جارہا ہے۔ اس کی خاص وجہ شام کی لڑائی ہے۔ جس کو حکومت اور مذہبی انتہاپسند گروپ دونوں کی طرف سے فرقہ ورانہ رنگ دیا گیا۔ جس کی بی بی سی کے رپورٹر جرمی بوون نشاندہی کرتا ہے ۔وہ کہتا ہے۔

"In Syria itself, the uprising that called the freedom and Justice has become an increasingly sectarian war. Sunni extremist groups, generally al-Qaeda followers, now dominate the armed opposition to president Assed. Hezbollah, the Shia political party and militia, has sent forces to fight for the Assad regime."(1)

شام میں ہی "عرب بہار"کی جو تحریک چلی تھی وہ آزادی اور انصاف کے لیے تھی مگر اب یہ بڑھتی ہوئی فرقہ ورانہ جنگ میں تبدیل ہوچکی ہے۔

سنی انتہا پسند گروپ خاص کر القاعدہ سے تعلق رکھنے والے اب مسلح جد و جہد کر رہے ہیں بشار الاسد کے خلاف حزب اللہ جو کہ لبنان کی ایک سیاسی پارٹی ہے اور شیعہ ملیشیا بھی ہے۔ نے اپنے فوجی ملیشیا کو بشار الاسد کے طرز حکومت کی حفاظت کے لیے شام بھیجا ہے۔

اس حوالے سے جیو پولیٹیکل کے کالم نگار کامران بخاری اپنے کالم میں لکھتا ہے کہ:۔

"The Syrian upheaval takes palce at a time of heightened geopolitical and sectarian tensions in the region, where Iran and its Largely Arab shiite allies are seeking to make in roads into the largely suni arab countries. For Tehran and its main non-state proxy, the Lebanese Shiite Islamic group hezbullah. The survival of an alawite regime in Syria that owes its survival to Iran is critical. Tehran and Hezbollah both have a military presence in Syria, which is assisting Damascus in its efforts to contain the uprising."(2)

---

1 Jermy Bowen, Surge in Arab Sectarian Violence After Arab Uprising BBC news 20 September, 2013

2 Kamran Bukhari, Jihadist Opportunities in Syria, Geopolitical Weekly, Stratfor Global Intellengence, 14 Feb, 2012

موجودہ صورتحال میں فرقہ واریت امت مسلمہ کے لیے ایک ایسا ناسور بن کر ابھرا ہے جس کا فی الحال علاج نظر نہیں آتا ہے۔ بلکہ یہ مزید پھلتا اور پھولتا جا رہا ہے۔اور مسلمان تقسیم در تقسیم ہوتے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے کے خون بہانے کو اجرِعظیم سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس لڑائی میں اپنی جان دینا عظیم کارنامہ سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں میں فرقہ واریت اگرچہ بہت پہلے سے ہے لیکن اس کو موجودہ جو تقویت ملی ہے وہ "عرب سپرنگ" کے بعد جب شام میں مسلمان دو گروہ میں بٹ گئے۔ اور بالآخر ایک ڈکٹیٹر سے آزادی کے لیے لڑی جانے والی یہ جنگ شیعہ، سنی تصادم سے تعبیر کیا جانے لگا۔ پھر یہ جنگ دیکھتے ہی دیکھتے قریبی ممالک لبنان اور عراق تک پھیل گیا اور یمن اور اردن بھی لپیٹ میں آ گئے۔

فرقہ واریت کی اس جنگ میں روزانہ سینکڑوں لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور اب اس جنگ کا اصل میدان شام اور عراق ہیں۔جہاں پر لاکھوں لوگوں کی زندگیاں اس جنگ کی نذر ہو چکی ہیں۔ اور یہ جنگ دیگر مسلم ممالک میں پھیلتا جا رہا ہے اگر یہ جنگ یوں ہی جاری رہی تو اسلامی دنیا تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گی۔

اردن کے بادشاہ عبداللہ دوم کا خدشہ

اردن کے بادشاہ عبداللہ دوم نے اشارہ کیا ہے۔ اور اسلامی دنیا کو وارننگ دی ہے کہ اگر فرقہ واریت یوں ہی چلتی رہی تو اسلامی دنیا تباہ ہو جائے گی ۔وہ کہتا ہے کہ:۔

"Ethnic and Sectarian violence sweeping accross several Arab countries could lead to the Distruction of the Muslim World."(1)

اس تمام صورتحال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "عرب بہار" کے بعد فرقہ واریت مزید پھیلتی جارہی ہے۔ جس کی وجہ سے اسلامی دنیا کو جانی اور مالی دونوں طرح کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ فرقہ واریت کو روکنے کے لیے سعودی عرب اورایران کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اگر یہ دو ممالک اپنا کردار صحیح طرح اور خلوص دل سے ادا کریں تو یقیناً اس عفریت سے چھٹکارہ ممکن ہے۔ اور ساتھ ساتھ علماء کرام کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کی اصلی روح کے مطابق تعلیم دیں۔ اور ساتھ ساتھ حکومتوں کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان فیکٹرز پر نظر رکھیں جو تشدد کی طرف لے

1" Sectarian violence could Destroy the Muslim World" Posted, 21 Aug, 2013, Huffington post, UK

جاتے ہیں اور انہیں روکنے کے لیے اقدامات اٹھائے جائیں۔ پروفیسر خورشید احمد اپنی کتاب اسلامی نظریہ حیات میں لکھتا ہے کہ "اسلام کے سیاسی نظام میں ملت اسلامیہ کی وحدت ایک بنیادی اصول ہے۔ اور اگر حالات کی مجبوری کی وجہ سے ملت بہت سے ممالک میں بٹی ہوئی ہو تب بھی ہر ملک کو خالص وطنی قومیت کے مقابلے میں اسلام کی نظریاتی قومی کو بنیاد بنانا چاہیے اور آہستہ آہستہ اتحاد اسلامی یا مسلمانوں کی دولت مشترکہ کو قائم کرنے کی کوششیں کرنی چاہیے۔

اسطرح یہ ممکن ہے کہ بہت سی ریاستیں اسلام کی بنیاد پر قائم ہوں۔ اور اپنے اپنے دائرے میں اس انقلابی دین کو قائم کرنے کی کوشش کریں"۔

فصل پنجم

مہاجرین کے مسائل

شامی مہاجرت کے اعداد و شمار

شامی بحران کو دس سال کا عرصہ بیت چکا ہے مگر یہ مسئلہ وقت کے ساتھ مزید گھمبیر اور لاینحل ہوتا جارہا ہے۔ یہ اب ایسی شکل اختیار کر چکا ہے کہ جس کے حل کی عالمی و مقامی پیش رفت میں کہیں بھی عوام اور مہاجرین کی فلاح و بہبود پیش نظر نہیں ہے۔ سیاسی رسہ کشی میں یہ عالمی کھیل اور مقامی حریفانہ کشمکش کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

شام میں جو انسانی المیے سامنے آئے ہیں ان میں سے ایک مہاجرت کا مسئلہ بھی نمایاں ہے۔ اعداد و شمار اور تباہ حالی کے اعتبار سے شامی مہاجرت کا المیہ اس صدی کے بدترین المیوں میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے شامی مہاجرین کی نوعیت و تعداد کچھ اس طرح ہے:[1]

شام کے پڑوسی ممالک میں 5.5 ملین لوگ مہاجر پناہ گزینوں میں موجود ہیں۔ 6.7 ملین شامی مہاجر 130 ممالک میں شہریت اور رہائش کی درخواستوں کے ساتھ موجود ہیں۔ خطے کے اندر 66 فیصد شامی مہاجرین عورتیں اور بچے ہیں۔ ان میں سے 1.6 ملین بچے ایسے ہیں جو دس سال کی عمر سے کم ہیں۔ 1.8 ملین مہاجرین ایسے خیموں میں رہتے ہیں جو کسی طور رہنے کے قابل نہیں ہیں۔ کل مہاجرین میں سے 12 ملین شامی مہاجر ایسے ہیں جو غذائی قلت کا شکار ہیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد بیمار اور بوڑھوں کی بھی ہے۔ بالخصوص شام کے اندر سرحدی علاقوں کے خیموں میں موجود شامی عوام زیادہ مسائل کا شکار ہیں جن میں غذائی قلت ایک بڑا مسئلہ ہے۔

خاندانی ڈھانچہ

شام سے ہونے والی مہاجرت نے کئی دیگر مسائل کو جنم دیا ہے جن میں سے بعض کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:[2]

اس مہاجرت نے شامی عوام کے خاندانی ربط اور بندھن کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ خاندانی تحفظ کی عدم موجودگی سے کئی بچوں کا مستقبل موہوم ہے۔ رپورٹس کے مطابق پناہ گزینوں کے خیموں میں موجود بچوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو والدین سے محروم ہیں یا باپ اور ماں میں سے کسی ایک سائے سے محروم ہیں۔ ان بچوں میں سے بعض کے والدین مارے گئے ہیں، یا ان کا کوئی پتہ ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ بعض والدین نے سرحد پر موجود انسانی سمگلروں کے

---

[1] مجلہ المجتمع، کویت، اگست، 2016ء

[2] ھؤلاء حکموا سوریا، 178

ہاتھوں پیسے دے کر اپنے بچوں کو دوسرے ملک کے پناہ گزین خیموں میں بھیجا ہے اور وہ خود پیسوں کی قلت کی وجہ سے وہیں رہ گئے۔ اقوام متحدہ کے ارکان ان بچوں کو اپنی تحویل میں رجسٹر کرتے ہیں۔ ان کی پرورش کے لیے کسی دوسرے خاندان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں یا پھر انہیں اس مقصد کے لیے بنائے گئے خاص سکولوں میں مقیم بنایا جارہا ہے۔ لیکن ایسے بچوں کا تناسب انتہائی کم ہے جنہیں کوئی پناہ گاہ یا خاندانی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔[1]

مہاجرین کے جسمانی ونفسیاتی مسائل

شامی مہاجروں کی پناہ گاہوں میں موجود بچوں کو متعدد جسمانی اور نفسیاتی مسائل کا سامنا ہے۔ یہ وہ بچے ہیں جو جنگی علاقوں سے آئے ہیں اور ان میں سے بہت ساروں نے جنگ ہوتے ہوئے دیکھی ہے جس میں قتل وغارت اور خون خرابے کے واقعات نے ان پر یا تو جسمانی آثار مرتب کیے ہیں کہ وہ اس کا شکار ہوئے ہیں یا پھر یہ کہ ان پر اس حالت کے نفسیاتی اثرات مرتب ہوئے ہیں جس سے انہیں سونے میں دشواری اور رہن سہن میں نارمل رویے اپنانے میں ہچکچاہٹ اور مسائل کا سامنا ہے۔

تعلیمی حقوق سے محرومی

شامی مہاجرین خطے کے پڑوسی ممالک میں سے زیادہ تر ترکی، لبنان اور اردن میں موجود ہیں۔ وہاں موجود بچوں کی ایک خاطر خواہ تعداد ایسی ہے جو پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کی بجائے مشقتی کام کرنے پر مجبور ہے۔ بچوں کی مزدوری بین الاقوامی قانون کے مطابق ممنوع ہے مگر شامی مہاجرین اپنا پیٹ پالنے اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ ان کے بچے کام کریں۔ ان میں سے بعض خاندانوں کے مرد سربراہان مارے گئے ہیں یا ان کا علم نہیں کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں اس لیے خاندان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بچوں کو کام کرنا پڑ رہا ہے۔ رپورٹس کے مطابق یہ بچے کام کی جگہوں پر غیر اخلاقی حرکات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ مگر ان کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ نہ وہ رپورٹ کر سکتے ہیں اور نہ ہی مزاحمت کرتے ہوئے کام چھوڑ سکنے یا حقوق کے حصول کی کوئی کوشش کر سکتے ہیں۔[2]

یونیسف کی ایک رپورٹ کے مطابق مہاجر بچوں میں دس میں سے ایک بچہ خاندانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بازاروں اور دیگر کام کی جگہوں پر مزدوری کرتا ہے۔[3] ادارے کا کہنا کہ بچوں کی مشقت اور مزدوری ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اسے روکنے کے لیے جو وسائل درکار ہیں وہ عالمی تنظیموں اور میزبان ممالک کے پاس میسر نہیں ہیں۔ اسی ادارے کی رپورٹ کے مطابق 47 فیصد خاندان بچوں کی اور نوعمر جوانوں کی مزدوری کی کفالت میں اپنی

---

[1] حسام ہرہوری، تصورات الاحزاب المغربیہ للاصلاح السوری (بیروت، مکتبہ الحیاۃ، 2019ء)177

[2] Christopher Philips, The Battle for Syria(Yale University Press, (2016),4

[3] النہضہ فی سوریا، 99

ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ چونکہ میزبان ممالک میں بچوں کی مزدوری غیر قانونی ہے اس لیے انہیں چھپ کر کام کرنا پڑتا ہے اور کسی استحصال کی صورت میں خاموشی مجبوری ہوتی ہے تاکہ وہ قانونی گرفت میں نہ آجائیں۔

ان شامی مہاجرین کو بچوں کے حوالے سے جن مسائل کا سامنا ہے ان میں سے ایک میزبان ممالک میں ان کی رجسٹریشن کا مسئلہ بھی ہے۔ وہ خاندان جو ہجرت کر کے دوسرے ممالک میں داخل ہوئے انہیں میزبان ممالک کو اپنی اور اپنے بچوں کی رجسٹریشن کرانی پڑتی ہے۔[1] چونکہ تمام خاندانوں کے پاس بچوں کے پیدائش سرٹیفکیٹ موجود نہیں اس لیے ان کے پاس یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ بچے ان کے ہیں۔ ایک بہت بڑی مہاجرت کے بعد اس طرح کے الیے جنم لیتے ہیں جن کے خاندانوں کے سربراہاں پر نفسیاتی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں کے انہیں اپنے بچوں کی ولدیت ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت پیش کرنا ہے جو حالت جنگ میں ایک دشوار عمل ہے۔

ایک عالمی تنظیم کی رپورٹ کے مطابق ایک پناہ گزین کیمپ میں 202 بچوں کا انٹرویو کیا گیا۔ ان میں 43 بچوں نے کہا کہ ان کے دونوں والدین یا کوئی ایک ان کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہاجر خاندانوں کو کس سطح پر انسانی المیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک سروے کے مطابق لبنان میں پناہ گزین خاندانوں میں 51962 خاندانوں کی کفالت عورتیں کر رہی ہیں۔[2]

ماہرین کے مطابق مہاجرین کی پناہ گاہوں اور ان کے خیموں سے شام میں قتال کی غرض سے نوجوانوں اور نوعمر بچوں کی بھرتی بھی کی جاتی ہے۔ وہاں ایسے عناصر متحرک ہیں جو شام میں فرقہ وارانہ یا دیگر عسکری جتھوں کی انسانی وسائل کی ضروریات پوری کرنے کے لیے نوجوانوں کو لے کر جاتے ہیں۔ بعض عناصر یہ کام جہاد کے نام پر کرتے ہیں اور بعض انتقامی جذبات کو ابھار کر اپنے مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔

ایک عالمی تنظیم کے سروے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ 80 بچوں سے ان کی تعلیم کے بارے میں سوال کیا گیا تو ان میں سے 66 فیصد نے یہ کہا کہ وہ سکول نہیں جاتے ہیں۔ لبنان کے کچھ خیموں میں موجود شامی مہاجروں میں سے تین لاکھ مہاجرین میں سے 30 ہزار بچے سکول جارہے تھے۔[3]

تعلیم کے حوالے شامی مہاجرین کو جن مسائل کا سامنا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سکولوں کے اندر ان کے ساتھ اجنبیوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کے دوست کم ہیں جس سے انہیں پریشانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مالی

---

[1] النہضہ فی سوریا، 66

[2] مجلہ البیان، لندن، جولائی، 2018ء

[3] مجلہ مرکز حرمون للدراسات، قطر، ستمبر، 2020ء

حیثیت کمزور ہونے کی وجہ سے بھی دیگر بچوں کے ساتھ مساوی حیثیت نہیں بن پاتی اور وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نصاب کا ایک بڑا مسئلہ ہے کہ ان میزبان ممالک میں جو نصاب ہوتا ہے وہ مختلف ہوتا ہے اس سے جو وہ پڑھتے تھے یا ان کے ملک شام میں پڑھایا جاتا تھا۔ اس لیے امتحانات اور دروس کو سمجھنے میں بھی دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔[1] البتہ جو بچے شام کے اندر جنگ سے محفوظ علاقوں میں وہاں تعلیم کا باقاعدہ کوئی نظام موجود نہیں۔ جس کی وجہ سے بچوں کی تعلیم بہت بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ یہ چند ایسے مسائل ہیں جن سے شامی مہاجرین نبرد آزما ہیں۔

شام میں تقریباً ستر لاکھ لوگ اندرونی طور پہ بے گھر ہوئے ہیں اور شام سے ہمسایہ ممالک میں ہجرت کرنے والوں کی تعداد تقریباً چالیس لاکھ کے قریب ہے۔ ترکی مہاجرین کی سب سے بڑی تعداد کو پناہ دیئے ہوئے ہے جہاں مہاجرین کی کل تعداد بیس لاکھ کے قریب ہے اِس کے بعد گیارہ لاکھ کے قریب مہاجرین لبنان میں موجود ہیں اردن میں چھ لاکھ انتیس ہزار اور عراق میں شامی مہاجرین کی تعداد دو لاکھ پچاس ہزار کے قریب ہے اور مصر میں نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ بتیس ہزار ہے۔ یورپ میں اب تک ایک لاکھ پچاس ہزار مہاجرین کو پناہ دی جا چکی ہے۔ یورپ کی طرف رُخ کرنے والے مہاجرین بحیرۂ روم کے سمندری راستے کے ذریعے پہلے یونان کا رُخ کرتے ہیں اور پھر وہاں سے دوسرے یورپی ممالک تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس سفر میں بہت سے لوگ جان کی بازی بھی ہار جاتے ہیں کیونکہ یہ سفر انتہائی ناقص کشتیوں پر ہوتا ہے اور انسانی سمگلنگ کرنے والے سینکڑوں کی تعداد میں لوگوں کو چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار کر لیتے ہیں جن میں سے اکثر کشتیاں ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی ڈوب جاتی ہیں۔ یورپ کے ممالک میں پہنچ کر بھی اُن مہاجرین کو مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں بچوں سمیت فٹ پاتھوں، کھلے میدانوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں راتیں بسر کرنا پڑتی ہیں۔

مہاجرین کے مسئلہ سے متعلق یورپی ممالک میں مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں لہٰذا ہر ملک کی پالیسی بھی مختلف ہے جس کے باعث یورپی یونین میں تناؤ بھی دیکھنے میں آیا۔ آسٹریا اور ہنگری جیسے ممالک نے اُن مہاجرین کو اپنی سرحدوں سے دور رکھنے کی کوشش کی بلکہ سرحدوں سے دھکیلنے کے لیے لاٹھی چارج اور ربڑ کی گولیوں کا استعمال بھی کیا گیا۔ کچھ ممالک کا یہ ماننا ہے کہ اُن مہاجرین میں ضرورت مندوں کی تعداد کم اور معاشی مہاجرین کی تعداد زیادہ ہے

---

[1] مجلہ مرکز حرمون للدراسات، قطر، ستمبر، 2020ء

جو بہتر روز گار کے لیے یورپ جیسے ترقی یافتہ خطے کا رخ کرتے ہیں اور اتنی بڑی تعداد میں مہاجرین کی نقل مکانی سے اُن ممالک میں آبادیات کا نظام بھی متاثر ہو سکتا ہے- کچھ ممالک نے مذہبی منافرت کا بھی اظہار کیا جیسا کے صرف عیسائی مہاجرین کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی- مہاجرین کے معاملے میں البتّہ جرمنی کا کردار حوصلہ افزا رہا ہے جس نے ایک جانب کروڑوں ڈالر کی امداد فراہم کی اور دوسری جانب ہزاروں کی تعداد میں مہاجرین کو بلا تفریق اپنے ملک میں آباد بھی کیا- جنگِ عظیم دوئم کے بعد یورپ عدمِ استحکام اور ظلم و جبر کی وجہ سے معاشی اور سیاسی طور پر تباہ ہو چکا تھا تاہم لوگوں کا ردِ عمل انسانی اور باہمی ذمہ داری کی بنیاد پر باہمی تعاون کا تھا لیکن بد قسمتی سے ایسی سیاسی بلوغت آج نظر نہیں آتی اور اس کی جگہ ڈر اور خوف نے لے لی ہے-

باب سوم

شام کے موجودہ بحران کے اسباب و محرکات

فصل اول   سیاسی عدم استحکام

فصل دوم   آمرانہ طرز حکومت

فصل سوم   انسانی حقوق کی پامالی

فصل چہارم   اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم

فصل پنجم   عالمی طاقتوں کی مداخلت

فصل اول

سیاسی عدم استحکام

ملک میں سیاسی استحکام کا نہ ہونا

ملک شام میں پچھلے چند سالوں سے جس طرح کا ماحول سامنے آیا ہے اور جو کشید گی اب تک جاری ہے اس کے تناظر میں جن اسباب و محرکات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے ان میں سے سیاسی استحکام کا نہ ہونا ایک بنیادی و اساسی محرک وسبب ہے۔ ملک شام جس خانہ جنگی کا شکار ہے اسے سراسر انارکی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔"عوام کے اندر کسی ایک قیادت پر اتفاق نہیں ہے بلکہ مسلح گروہوں کے اپنے اپنے امراء ہیں جن کی اطاعت کی طرف دعوت دی جاتی ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے جبری سطح پر لوگوں کو کسی قیادت کے ماتحت جمع کر کے اتحاد پیدا کیا جائے جو عملاناممکن ہے"۔[1]

پھر اس پر مستزاد یہ بھی ہے کہ مختلف گروہ فرقہ واریت کی بنیاد پر قائم ہیں جو آپس میں بر سر پیکار بھی ہیں۔

گزشتہ عشرے میں سرزمین شام جس قسم کی کیفیت کا شکار ہوئی ہے اس کا حقیقی سبب یہ کہ ایک معتدل قیادت عامہ موجود نہیں جس کی وجہ سے مستقبل میں بھی یہ امید نظر نہیں آتی کہ کہ اگر موجودہ طرز عمل پر اصرار جاری رہا تو خدانخواستہ یہ خانہ جنگی ختم نہیں ہو گی اور مسائل جوں کے توں رہیں گے۔

لہذا اس صورتحال پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ شام میں کسی ایک قیادت و امیر کی اطاعت میں اتحاد پیدا ہو اور لوگوں کی زندگیاں واپس نارمل حالت میں بحال ہو سکیں اور خون کا یہ بحران کسی انجام کو پہنچے۔ سرزمین شام میں اطاعت امیر کے فقدان کی بحث کے چند زاویے ہیں جن پر غور کیا جانا چاہیے۔

انارکی اور قیادت عامہ کا مخدوش تصور:

سرزمین شام میں خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد سے اب تک آمریت یا بادشاہت رہی ہے۔ تاہم موجودہ خانہ جنگی کے شروع ہونے سے قبل تک سیاسی سطح پر ایک اتفاق رائے موجود رہا جس میں شہریوں کے اندر اس بات کا احساس پختہ تھا کہ انہیں اس نظم کو تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے اور اس میں پیدا ہونے والی دراڑ کو برداشت نہیں کرنا کیونکہ اگر ایسا ہوا تو اس کے نتائج بھیانک نکلیں گے۔[2] خصوصا مشرق وسطی میں جب تمام ریاستیں آمرانہ تسلط کے تحت چل رہی تھی تو ایسے میں بادشاہت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا تصور بھی کمزور رہا اور عام لوگ اس پر قانع

---

[1] محجوب زویری، العرب وایران، مراجعة في التاريخ (دوحہ، المركز العربي للدراسات، 2013ء)، 122۔

[2] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 44۔

تھے کہ اگر امن ہے تو حکومت کو چلنے دینا چاہیے۔ اگر نچلے طبقات کہیں ناگواری کے جذبات موجود تھے بھی تو وہ اتنے مقبول یا مضبوط نہیں تھے کہ انہیں بغاوت میں بدل کر ایک نئے نظم کی تشکیل میں کوئی کردار ادا کیا جاسکے۔ لہذا یہ نظام اسی طرح چلتا رہا۔[1] لیکن تیونس سے اٹھنے والی عرب بہار کی چنگاری نے مشرق وسطی کی ریاستوں میں ہلچل مچادی اور شہری سڑکوں پر نکلنے لگے۔ عرب ممالک اس کی لپیٹ میں آئے لیکن ملک شام جس طرح کی خانہ جنگی اور انارکی کا شکار ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور یہ جنگ اب تک جاری ہے۔

شام میں عرب بہار کے اثرات نے لوگوں کو تفریق کا شکار کیا اور وہ فرقہ وارانہ بنیادوں میں تقسیم ہوگئے۔ ملک کی اکثریت آبادی سنی تھی جس نے یہ مطالبہ کر دیا کہ وہ بشار الاسد کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے۔ انہیں آزادانہ اساسات پر قائم ایک ایسے نظم کی تشکیل کرنی ہے جس میں لوگ اپنی مرضی سے اپنے لیے امیر یا حاکم کا انتخاب کر سکیں۔ یہ مطالبہ حکومت کی جانب سے مسترد کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ سرزمین داخلی وخارجی قوتوں کی دخل اندازی اور سازشوں کی آماجگاہ بن گئی۔ ''اس دوران فرقہ وارانہ بنیادوں پر بھی اور نسلی اساسات پر بھی اتنے طبقات سامنے آئے کہ اس کے بعد کسی طرح کے سیاسی اتفاق رائے کا وجود ایک ناممکن تصور بن گیا۔ اب وہاں پر جنگ صرف سنی شیعہ کے دو گروہوں کے مابین نہیں ہے بلکہ ہر دو میں بھی چھوٹے چھوٹے مزید گروہ ہیں جو اپنی اپنی حکومت کے لیے کوشاں ہیں۔ مذہب و آئیڈیالوجی کے نام پر ایک مسلح جدوجہد ہے جس کا کوئی واضح سِرا نظر نہیں آتا''۔[2] یوں لوگ ایک نظم تو چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی امیر یا سیاسی استحکام کے قیام کے لیے قیادت عامہ کا تصور نہیں ہے جس کے بل بوتے پر امن کو یقینی بنایا جاسکے اور اور اس انتشار وخانہ جنگی کو انجام تک پہنچایا جاسکے۔

شام میں شروع ہونے والے انقلاب کو ابتداء میں جہاد کا عنوان دیا گیا۔ لیکن اس کے لیے بر سر پیکار جماعتیں تقسیم ہو گئیں اور مختلف ایجنڈوں کے تحت کام کرتے ہوئے آپس میں لڑائی پر اتر آئیں۔ اس کا نقصان اس اکثریت آبادی کو ہوا جو عام شہری تھے اور جو محض پر امن طریقے سے نظام کی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ کس امیر کی اطاعت کی جائے اور کسے مسترد کر دیا جائے یہ ایک معمہ بن گیا جو عام لوگوں کے لیے آج تک قابل حل نہیں بن سکا۔ یہ صورتحال تبدیل ہوتی نظر نہیں آتی۔

معتدل قیادت کی ضرورت:

اہل شام کے مسائل کا حل یہ ہے کہ ان کے لیے فوری طور پہ کوئی ایک معتدل قیادت سامنے آئے جو موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احادیث مبارکہ میں بھی بے شمار مواقع پر یہ سبق دیا گیا کہ مسلمانوں کے طبقات وگروہوں

---

[1] محمد بوعزہ، الانقلابات العسکریہ فی سوریا (دمشق، مکتبہ المنارہ، 2010ء) 45۔

[2] رضوان زیادہ، التحول الدیمقراطی فی سوریہ (القاہرہ، مرکز لدراسات حقوق الانسان، 215ء)، 221۔

کے لیے امیر اور قیادت کا ہونا از حد ضروری ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے: إِذَا كُنْتُمْ ثَلاثَةً فِي سَفَرٍ فَأَمِّرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدَكُمْ۔[1] لہٰذا اگر سیاسی استحکام کی امید رکھی جا سکتی ہے تو اس کا واحد رستہ یہی ہے کہ کہ اہل شام کے اپنے نمائندے اور باقی مسلم دنیا کسی امیر کی قیادت و سیادت کو یقینی بنائیں جس کے تحت ملک میں استحکام کی جانب سفر کو ممکن بنایا جاسکے گا۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالی نے یہ ہدایت کی ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ آپس میں اتحاد و اتفاق سے رہیں اور تفرقہ پیدا نہ ہونے دیں: واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا۔[2] اسی طرح ایک اور موقع پر ارشاد کیا گیا کہ: و لا تکونوا کاالذین تفرقوا و اختلفوا۔[3] تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے آپس میں اختلاف کیا اور تقسیم ہو گئے۔

لہٰذا شرعی طور پہ شام کے عام شہریوں اور بر سر پیکار گروہوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ تعالی کے حکم کے آگے سر جھکاتے ہوئے انصاف و عدل کے تقاضوں کے مطابق سب سے پہلے کسی ایک قیادت و سربراہ کا انتخاب کریں جو ان تمام لوگوں کی نمائندگی کرے اور معاملات واضح حل کی جانب گامزن ہوں۔ شدید انارکی اور تفرقے کے ماحول نے عالمی سیاست میں بھی یہ جواز پیدا کیا ہے کہ شام کے مسئلے کا حتمی و یقینی حل کسی منطقی انجام کو نہ پہنچ سکے۔ اگر شام میں فریقین کی واضح و غیر مختلف فیہ قیادت موجود ہوتی تو خانہ جنگی میں اضافہ نہ ہوتا اور عالمی برادری پر بھی اس مسئلے کے حل کے لیے دباؤ بڑھ سکتا، لیکن بد قسمتی ایسا نہ ہونے کی وجہ سے شام کا مسئلہ وہاں کے عام لوگوں کے لیے ایک اذیت ناک تجربہ ثابت ہوا۔

اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ سب مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں، اگر ان کے مابین اختلاف ہو جائے تو صلح کرادیا کرو۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ۔[4]

اگر شرعی طور پہ یہ اجازت دی گئی کہ امن کے حصول کے لیے دشمن کے ساتھ بھی صلح کی ضرورت پڑے تو ایسا کرنا چاہیے تو پھر حالیہ بحران کی صورت میں خود ایک ہی مذہب کے طبقات کے درمیان مصالحت تو بطور اولی واجب فریضہ ہے جس پر عمل کیا جانا ضروری ہے۔ شام کے علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس زمین پر لڑنے والے مسلح یا غیر مسلح طبقات کے درمیان صلح کرائے اور ایک ایسی فضا کے قیام کو یقینی بنایا جائے جس میں ایک امیر کے ماتحت اتفاق رائے پنپ سکے، تاکہ اس مسئلے کا کوئی حل نکلے اور لوگ امن کی خوشبو کو محسوس کر سکیں۔

---

[1] ابو داود سلیمان ابن الاشعث، سنن ابی داود، حدیث نمبر: 1023۔

[2] آل عمران، آیت: 103

[3] آل عمران، آیت: 105۔

[4] الحجرات، آیت: 10۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔[1] اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہ لوگ پسندیدہ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح لڑتے ہیں جیسے وہ ایک ناقابل تسخیر بندھ ہوں۔

اس کے علاوہ دین اسلام میں شوریٰ کی اہمیت کو بار بار اجاگر کیا گیا ہے، اس کا پس منظر اور مقصود بھی یہ ہے کہ مسلمان باہمی طور پر مشورہ کر کے کسی ایک قابل عمل نتیجہ کی طرف بڑھ سکیں اور اختلاف کو جگہ نہ دیں۔ یہ ایک بدقسمتی ہے کہ مسلم دنیا کی اکثریت کسی نہ کسی سطح پر اہل شام اور ان کی جدوجہد کے ساتھ رہی ہے لیکن وہاں پر برسرپیکار گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا، ایک دوسرے کے خلاف فتاویٰ جاری کیے اور حالات کو اس نہج تک پہنچا دیا کہ اب ایک مسلسل غبار ہے جس میں حقیقی شامی شہریوں کی نمائندگی نظر نہیں آتی اور نہ ہی لوگوں میں اب سکت رہی ہے کہ اس معرکے میں مزید قربانیاں دے سکیں۔ اگر عام آدمی سے سوال کیا جائے کہ اس ملک میں جاری معرکے کا نتیجہ کیا نکلے گا اور امن کس طرح قائم ہو گا تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اس سرزمین پر اس کی سچی نمائندگی کرنے والے گروہ موجود نہیں ہیں۔ یوں نہ کوئی متفقہ امیر ہے اور اس کی اطاعت کے لیے عام شہریوں کی حمایت دستیاب ہے۔

شام میں قیادت کے سیاسی فورم اور ان کی ناکامی:

شام میں جب مسائل بڑھنا شروع ہوئے اور انقلابی تحریکوں کے مابین چیلنج وسیع ہونے لگے تو اس وقت ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ ایک ایسے فورم کو تشکیل دیا جائے جس کے ذریعے اختلاف کو ختم یا اسے حل کیا جاسکے اور اس زمین پر شروع ہونے والی جدوجہد کو کسی منطقی انجام تک پہنچایا جاسکے۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا یہ فورم ترجیحی طور پہ شام کے عام شہریوں کی ترجمانی کرے گا۔ گویا یہ ایک قسم کی شورائی تمثیل تھی اور اس کے ذریعے لوگوں کو ایک ایسی قیادت فراہم کرنا مقصود تھا جسے ان کی حمایت حاصل ہو۔ یہ ایک قسم کا سیاسی فورم تھا جس کی صدارت عبد االرحمان مصطفیٰ کو سونپی گئی تھی۔[2] جدید معنوں میں اہل شام کو ایک امیر و شوریٰ کی چھتری تلے جمع کرنا مقصد تھا۔

اس فورم کا نام مجلس قومی اتحاد (National Coalition for Syrian Revolution and Opposition Forces) رکھا گیا۔ تاہم پچھلے آٹھ برسوں میں اس فورم نے کوئی قابل قدر کردار ادا نہیں کیا۔ رپورٹس کے مطابق اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ شام کے اندر لڑنے والی تمام اپوزیشن جماعتوں و تحریکوں کی نمائندہ ہے اور اس کے ساتھ

---

[1] الصف، آیت: 4۔

[2] یوسف سیوفی، ذکری استقلال سوریا (بیروت، دارالامان الجدیدہ، 2017ء)189۔

شام کے عام لوگوں کی ترجمان بھی ہے۔ لیکن عملی سطح پہ یہ فورم ان کی قیادت نہیں کر رہا۔ کارنیگی ریسرچ سنٹر[1] کے مطابق اس فورم کا وجود صرف شام سے باہر تک ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس کی نمائندگی داخلہ یا خارجہ سطح پر تسلیم نہیں کی جاتی بلکہ اسے عالمی سطح پر قبول عام حاصل ہے، تاہم اس کی عملی فعالیت نظر نہیں آتی۔ شام کے عام شہریوں نے اس فورم کے حوالے سے بہت ساری امیدیں باندھی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ اس کے مفید و ثمر آور نتائج بر آمد ہوں گے۔ خانہ جنگی رکے گی اور وہ جلد اپنے گھروں کو واپس لوٹ سکیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکا۔ اسے اگرچہ عرب ممالک سمیت باقی دنیا کی تائید حاصل ہے لیکن اس نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔[2] خصوصا کوئی ایسی پالیسی مرتب نہیں جس کے ذریعے شام میں بر سرپیکار گروہوں کے درمیان فاصلوں کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی۔

مزید بر آں "معاملات زیادہ پیچیدگیوں کا شکار اس وقت ہوگئے کہ جب شام کے اندر فورم کی قیادت نے تاخیر کر دی اور کوئی بہتر حل تلاش نہ کر سکی۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے نئی جماعتیں اور گروہ ملک کے اندر پھیلنے لگے جو دیگر مافیاؤں کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس کے بعد صورتحال مزید ابتری کا شکار ہوگئی۔ مارچ 2013ء میں اس فورم نے بظاہر یہ تاثر دیا تھا کہ انہوں نے شام کے اندر ایک عارضی حکومت کے قیام کا منصوبہ تشکیل دیا ہے جس کے لیے عارضی طور پہ صدارت کے لیے امریکہ میں مقیم شامی شخصیت غسان ہیتو کا نام زیر غور آیا۔ اگر یہ عملا اس جانب اقدام کیا جاتا تو عالمی برادری و عرب ممالک پر بھی اس کی حمایت کے لیے دباؤ بڑھتا کیونکہ یہ فورم ان فریقوں کی طرف سے منظور شدہ ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں ہو سکا۔ اس کی متعدد وجوہات ذکر کی جاتی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے عارضی حکومت کے قیام کے لیے ٹیکنوکریٹس کے ناموں پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔"[3] بالخصوص عرب ممالک اس میں بڑی رکاوٹ بنے۔ بااثر عرب ریاستیں چاہتی تھیں کہ شام میں قائم ہونے والی عارضی حکومت ان کے مفادات کو پیش نظر رکھ کر بنائی جائے۔ ان اختلافات کی وجہ سے عارضی حکومت کے قیام کا اعلان نہ ہو سکا۔ اگرچہ اس فورم کو بشار الاسد اور اس کے چند حامی ممالک نے تسلیم نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے یہ خدشہ موجود تھا کہ اگر عارضی حکومت کے قیام کا اعلان ہو بھی جائے تو بھی اس کو عملی جامہ پہنانے میں وقت درکار ہو گا اور کئی مشکلات سامنے آئیں گی لیکن بہر حال اس سے شامی حکومت پر دباؤ بڑھتا اور وقت کے ساتھ معاملات کسی نہ کسی سطح پر بہتری کی جانب چل پڑتے۔ مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔

---

[1] اس کو مڈل کارنیگی ایسٹ سینٹر بھی کہتے ہیں۔ نومبر 2006، بیروت میں ہیڈ کوارٹر ہے۔ ویب سائٹ:cornegie.mec.org

[2] دیب کمال، تاریخ سوریا المعاصر (بیروت، دار النہار للنشر، 2012ء)، 99۔

[3] Marwan Hisham, Brothers of the Gun (New York, Rendom House Publishing, 2016), 198.

کسی بھی عملی اقدام اور ملک میں متبادل سیاسی بندوبست کو پیش کیے بغیر تو شام کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ یوں انفرادی ممالک کی مذمت سے کوئی فوائد حاصل نہ ہو سکے اور نہ اس کی امید تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شامی شہری امارت و قیادت سے محروم رہے اور ان کی دادرسی نہ ہو سکی۔ اسی بنا پر وہ ملک سے ہجرت پر مجبور ہوئے۔ اگر انہیں کسی متبادل سیاسی بندوبست کے قیام اور اس کی کامیابی کی امید ہوتی تو جانوں کو خطرے میں ڈال کر اہل عیال سمیت ہجرت پر مجبور نہ ہوتے۔

قیادت کے آپسی اختلافات:

اس فورم سے قبل عرب بہار کے شروع ہوتے ہی ایک اور فورم بھی شامی شہریوں کی قیادت و ترجمانی کے لیے تشکیل دیا گیا تھا جس کا نام Syrian National Council تھا۔[1] تب بھی اہل شام نے یہ امید باندھی کہ اگر وہ اپنا وزن اس فورم کے حق میں ڈالیں گے تو بہتر نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں اور شامی حکومت کے متبادل کوئی بندوبست قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ فورم بعد میں تشکیل پانے والے فورم National Coalition for Syrian Revolution and Opposition Forces سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوا۔ ''سیرین نیشنل کونسل نے اپنی توجہ داخلی معاملات کی بجائے خارجہ معاملات میں زیادہ ظاہر کی۔ یہ عالمی میڈیا میں تو نمایاں رہا اور باہر ممالک میں شامی شہریوں کے حق میں مسلسل پروگرامز کرتے رہے لیکن شام کے اندر موجود طبقات سے کوئی رابطہ نہیں کیا اور نہ ان جماعتوں کے اندر اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے یا استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس فورم کی یہ خصوصیت بھی تھی اس میں یورپی یونین کے ارکان بھی ممبر تھے۔ فورم کی تشکیل کے ایک سال بعد یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ اہل شام کی قیادت کے لیے اس طرح موزوں ثابت نہیں ہوا جیسے توقع کی گئی تھی''۔[2] اسی لیے ایک اور فورم کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جسے پورا کرنے کے لیے نیشنل کولیشن فار سیرین ریوولیوشن اینڈ اپوزیشن فورسز کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔

مؤخر الذکر فورم نے 2013ء میں یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ شامی حکومت کے ساتھ سیاسی طور پہ معاملات حل کیے جائیں۔ مذاکرات ہوں مگر ان میں ابتدائی سطح پر بشارالاسد کی معزولی کو موضوع نہ بنایا جائے۔ اس تجویز کا مجموعی طور پہ اچھا خیر مقدم کیا گیا اور شامی شہریوں کی اکثریت نے بھی اس پر رضامندی ظاہر کی، لیکن سیرین نیشنل کونسل اس تجویز کے خلاف کھڑی ہوئی۔ اس نے یہ تحریک چلائی کہ مذاکرات میں اولین شرط اگر بشار الاسد کو ہٹانے کی نہ رکھی گئی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اہل حل و عقد نے شامی شہریوں کے خون کا سودا کیا ہے۔ اس نے اس تجویز کو دھوکہ قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا تھا۔

---

[1] Marwan Hisham, Brothers of the Gun (New York, Rendom House Publishing, 2016), 77

[2] عبد الفضل، العرب والتجربہ الآسویہ (بیروت، مرکز دراسات الوحدہ العربیہ، 2013ء)، 232۔

شامی قیادت اور حکومت کا کردار:

عرب بہار میں شام کا منظر نامہ اس لیے بھی مختلف ثابت ہوا کہ اہل شام کو داخلی سطح پر میسر آنے والی قیادت کو شروع میں ہی گرفتار کر لیا گیا یا پھر انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متبادل کے طور پہ ایسی قیادت سامنے آئی جو منتشر الخیال تھی اور ان کا موقف واضح نہیں تھا۔[1] لہذا عوام کی طرف سے انہیں بہت زیادہ حمایت حاصل نہ ہو سکی۔ یہ نئی اور چھوٹی چھوٹی متفرق جماعتوں کی قیادتیں اپنی اپنی جگہ پر کام تو کرتی رہیں تاہم انہیں بطور امارت وسیادت ترجمانی کا حق حاصل نہ ہو سکا۔ کیونکہ عوام کی اکثریت نے ان کی اطاعت کرنے اور ان کی پالیسیوں کے ماتحت چلنے سے انکار کر دیا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ شام میں ایسی جماعتیں موجود نہیں تھیں جو سیاسی حل پر یقین رکھتی ہوں، بلکہ ملک میں ایسی نوع کی دسیوں جماعتیں موجود تھیں جن کا تعلق بائیں بازو یا سوشلزم سے تھا اور وہ پچھلے کئی برسوں سے فعال تھیں۔ لیکن حکومت کی طرف سے چونکہ ان پر پابندی عائد تھی اور وہ کھلم کھلا اپنے موقف کے لیے کام نہیں کر سکتی تھی اس لیے ان کی پذیرائی اور اثرورسوخ عوامی جڑوں میں اتنا گہرا نہیں تھا۔ جب عرب بہار کی ابتداء ہوئی تو یہ جماعتیں بھی میدان میں نکلیں اور انہوں نے حکومت کی تبدیلی اور سیاسی استحکام کے لیے آواز بلند کی مگر ان کی زیادہ شنوائی نہ ہو سکی، اس لیے کہ ان کا تعلق و ربط لوگوں کے ساتھ گہرا نہیں تھا۔ اور ان جماعتوں کی عدم مقبولیت کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق سوشلسٹ نظریات سے تھا، ایسے نظریات رکھنے والی تحریکوں کو عرب دنیا سمیت کسی مسلم ملک میں خاص کامیابی یا پذیرائی نہیں مل سکی۔[2] باقی عرب دنیا میں تو اس نظریات کی حامل جماعتوں کا ڈھانچہ نوے کی دہائی میں ہی ختم ہو گیا تھا، تاہم شام میں یہ کسی نہ کسی حد تک کام کر رہی تھیں۔ لہذا جب عرب بہار کی فضا چلی تو یہ جماعتیں بھی باہر نکل آئیں مگر یہ انقلابی تحریک کے اندر جگہ بنانے میں ناکام رہیں۔

مفادات کا ٹکراؤ:

شام کے مسئلہ پر دسترس رکھنے والے ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ "شام کی سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں کی قیادت نے اہل شام کے حقوق کے نام پر خطے کے دیگر ممالک کے مفادات کی ترجمانی کی ہے، یا پھر مغربی ممالک کی پالیسیوں کے ماتحت رہی ہیں۔"[3] براہ راست انہوں نے کبھی بھی عوامی مسائل اور ان کے دکھ کے مداوے کے لیے اقدامات نہیں اٹھائے۔ وہ شامی مہاجرین جو ملک سے باہر دیگر ریاستوں میں پناہ لیے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم انسانی حقوق کے

---

[1] حمزہ المصطفی، المجال العام الافتراضی فی الثورۃ السوریہ (القاہرہ، مرکز الجزیرہ للدراسات، 2017ء)، 33۔

[2] حمزہ المصطفی۔ مختصر حوالہ۔

[3] حسام ہرہوری، تصورات الاحزاب المغربیہ للاصلاح السوری (بیروت، مکتبہ الحیاۃ، 2019ء)246۔

مطالبے کے طور پر اور اپنے وطن میں امن کی بحالی کے لیے آواز اٹھانے کو تیار ہیں، مگر اپنی جد وجہد اور آواز کا وزن جس پلڑے میں ڈالیں وہ موجود نہیں ہے۔ شامی عوام یکجان ہو کر سیاسی استحکام کی خاطر آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور کسی ایسے امیر و قائد کی خواہش رکھتے ہیں جو ان کی ترجمانی کرے، نہ کہ دیگر ریاستوں اور ان کے مفادات کی۔

فصل دوم

آمرانہ طرز حکومت

آمریت ایسا طرز حکومت ہے جس میں فرد واحد تمام اختیارات کا مالک ہوتا ہے، جسے آمر یا ڈکٹیٹر (Dictator) کا نام دیا جاتا ہے۔ ڈکٹیٹر لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب مطلق العنان اختیارات کا مالک شخص، آمریت میں فرد واحد تمام احکام جاری کرتا ہے۔[1]

وہ قانون بناتا نہیں بلکہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ جب چاہے کسی کو زندگی کا پروانہ تھما دے۔ آمریت جمہوری نظام کی ضد ہے۔ اس میں عوام کے بنیادی حقوق یعنی تحریر و تقریر کی آزادی، مساوات، قانون کی حاکمیت، مذہب کی آزادی وغیرہ سب کچھ آمر کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ وہ جس کو چاہے حقوق دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ یہ ضروری نہیں کہ آمرانہ حکومت ہمیشہ عوامی خواہشات کے برعکس کام کرے بلکہ آمر یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اسے کس طرح سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنا ہیے۔ اس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً تشدد کے ساتھ ساتھ ایسی مراعات بھی رعایا کو دیتا رہتا ہے جس سے عوام کے دل میں آمر کے لیے نرمی کا پہلو بھی موجود رہتا ہے اور وہ آمر کو نجات دہندہ سمجھنے لگتے ہیں بعض اوقات آمر پروپیگنڈہ کے ذریعے عوام میں نجات دہندہ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ ہٹلر نے جرمنی میں اپنے وزیر گوبٹلز کے پروپیگنڈے سے جرمن عوام کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ اٹلی میں مسولینی (Massulin) اور برطانیہ میں کروم ویل (Cromwell) کی آمریت قائم ہوئی تھی۔[2]

بادشاہت اور آمریت میں بظاہر بہت سی خصوصیات مشترک ہیں، لیکن بادشاہت موروثی طور پر خاندان میں والد سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جبکہ آمریت مختلف طریقوں سے وجود میں آتی ہے۔ کبھی بیٹا باپ کا تخت الٹا سکتا ہے تو کبھی ملک کا فوجی سربراہ بھی بر سر اقتدار آسکتا ہے۔ مثلاً پاکستان میں ایوب خان، یحیی اور ضیاء الحق آمر حکمران گزرے ہیں۔ روس میں لینن، سٹالن اور خروشیف آمر تھے۔ کیوبا میں فیڈل کاسترو (Fidel castro) آمر ہے۔ لیبیا میں معمر قذافی، مصر میں حسنی مبارک، تیونس میں زین العابدین بن علی بھی آمر تھے، شام میں بشارالاسد بھی موروثی آمر ہیں۔ انڈونیشیا میں جنرل سوہار تو بھی آمر تھا۔ الغرض آمریت کبھی موروثی صورت میں بھی ہو سکتی

---

[1] Oxford English Dictionary, Page, 165, Oxford press

[2] پروفیسر رانا اعجاز، امور سیاسیات، ص 155، ڈوگر پبلیشرز، لاہور

ہے جیسے بشارالاسد کی آمریت موروثی ہے حافظ الاسد کے وفات کے بعد بشارالاسد کو منتقل ہوئیاور کبھی زور بازو سے بھی اقتدار حاصل کیا جاسکتا ہے۔

آمریت کی چند تعریفیں مندرجہ ذیل ہیں۔

آمریت کی تعریف

آکسفورڈ کے مطابق

"Dictatorship is the assumption of extra-legal authority by the head of the state"(1)

"آمریت سربراہ مملکت کا قانون سے بالاتر یا قانون سے زیادہ اختیارات کو اپنے ہاتھوں میں لینے کا نام ہے"

۲ الفرڈ کوبون کے مطابق

الفرڈ کوبون اپنی کتاب "Dictartorship" میں آمریت کی تعریف یوں کرتا ہے:۔

"آمریت ایسا طرز حکومت ہے جس میں فرد واحد اپنی حکومت اپنے زور بازو سے بناتا ہے وہ مطلق العنان اقتدار اعلیٰ کا مالک ہوتا ہے۔ تمام سیاسی اختیارات اس کی مرضی ومنشا کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کے یہ اختیارات اس کی مرضی اور منشا کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کے یہ اختیارات لامحدود حیثیت کے حامل ہوتے ہیں"(2)

آمریت کی خامیاں

آمریت کی چند چیدہ چیدہ خامیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

1) فرد واحد کی حکومت

آمریت میں آمر مطلق اختیارات کا مالک ہوتا ہے ریاست کے تمام شعبے ہر کام آمر سے پوچھ کر کرتے ہیں۔ قانون ساز ادارہ قانون بناتے وقت آمر کی پسند کو سر فہرست رکھتا ہے۔ اسی طرح انتظامیہ قانون نافذ کرنے میں آمر کی مرضی کو مد نظر رکھتی ہے۔ عدلیہ تمام فیصلے آمر کی رائے کے مطابق دیتی ہے۔ آمر نے جان بوجھ کر دکھاوے کے لیے مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے ادارے تشکیل دیئے ہوتے ہیں تاکہ عوام میں بے چینی اور اضطراب جنم نہ لیں۔

---

[1] Oxford English Dictionary, Page, 165, Oxford press

[2] الفریڈ کوبون، ڈکٹیٹر شپ، ص، 25، لندن، جوناتھن کیپ، لندن 1939

2) آزادی اور مساوات کی عدم موجودگی

آزادی اور مساوات جدید جمہوریت کی خوبیاں متصور ہوتی ہیں جو انسانی شخصیت کی تکمیل اور نشوونما میں بہت زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ آمریت میں آزادی اور مساوات کا دور دور تک کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ریاست کے افراد کی آزادی فرد واحد یعنی آمر کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

3) بنیادی حقوق کا خاتمہ

بنیادی حقوق کا تصور بھی آمریت میں ممکن نہیں، کیونکہ آمر یہ بات بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ بنیادی حقوق انسان کو آزادی کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسے تمام مخالفین کو کچل دیتا ہے جو بنیادی حقوق کی بات کریں یا ان کا مطالبہ کریں۔

4) بدامنی

آمر کی غلط فیصلوں سے قوم مسلسل بدامنی کا شکار رہتی ہے اور ریاست کی جڑیں اندر ہی اندر سے کھوکھلی ہو جاتی ہیں، جس سے آمریت کے خاتمے کے بعد نئی آنے والی حکومت بھی کافی عرصے تک ملک میں امن و امان کی صورت حال کو بہتر نہیں کر پاتی، کیونکہ آمریت کے لمبے عرصے میں عوام نے بہت زیادہ دباؤ میں زندگی گزاری ہوتی ہے۔ جونہی آمریت کا خاتمہ ہوتا ہے تو ریاست کے افراد ردعمل کے طور پر بہت زیادہ غصے میں آجاتے ہیں جس سے نئی حکومت بھی پریشان اور ناکام رہتی ہے۔ جس کی واضح مثال عرب سپرنگ کے بعد قائم ہونے والی حکومتیں ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عوام کو پوری طرح سیاسی نظام میں شراکت داری نہیں دی گئی۔

5) قومی تعمیر کا خاتمہ

آمریت میں قومی تعمیر (Nation-Building) کا بالکل خاتمہ کو دیا جاتا ہے، کیونکہ آمر قومی تعمیر کو اپنے اقتدار میں رکاوٹ تصور کرتا ہے۔ اس لیے وہ ریاست کے افراد کی ہر آزادی پر قدغن لگا کر قومی تعمیر کے تمام ذرائع ناپید کر دیتا ہے۔

6) سیاسی جماعتوں کی عدم موجودگی

سیاسی جماعتیں جمہوریت میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں جب کہ آمریت میں آمر کے علاوہ کوئی سیاسی جماعت ریاست کے اندر جنم نہیں لے سکتی، کیونکہ آمر کسی اختلاف رائے کو نہ وہ پسند کرتا ہے اور نہ ہی اس کا متحمل ہوتا ہے۔ دراصل سیاسی جماعتیں عوام میں سیاسی شعور کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اسی لیے آمر سیاسی

جماعتوں کو معاشرے میں بالکل جنم نہیں لینے دیتا۔ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق اور ایوب خان نے اپنے اپنے دور میں سیاسی جماعتوں پر مسلسل پابندی لگائے رکھی۔

7) ملکی میڈیا پر کنٹرول

آمر ملک کے ہر قسم کے ذرائع ابلاغ کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے اور اسے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال کرتا ہے، اخبارات، ٹی وی، ریڈیو سب پر آمر اپنی خوبیوں سے بھرپور پروپیگنڈہ مہم جاری رکھتا ہے تاکہ رائے عامہ کو زیادہ سے زیادہ اپنے حق میں ہموار کر سکے۔ حتیٰ کہ تعلیمی اداروں میں بھی آمر ایسا نظام تعلیم رائج کرتا ہے جس سے طلباء کے درمیان آمر کو ایک نجات دہندہ اور اعلیٰ ترین شخص کو حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہی طلباء جب عام زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو آمر کی خوبیوں کو بیان کرتے ہیں جس سے رائے عامہ خود بخود آمر کو اپنے جان و مال کا محافظ سمجھنا شروع کر دیتی ہے۔

مسولینی اور ہٹلر نے ملکی میڈیا پر مکمل کنٹرول کر رکھا تھا اور اپنی پسند کے پروگرامز اور پروپیگنڈہ کرواتے تھے۔ تمام ملکی میڈیا پر سخت سنسر کی پابندی لگائی گئی تھیں۔[1]

آمریت میں خفیہ پولیس ملک میں آمر کی آمریت کو فروغ دینے کے لیے جاسوسی کے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ تاکہ کہیں بھی مخالفت کے بیج بوئے جا رہے ہوں تو ان کو نمو پانے سے پہلے ہی کچل دیا جائے۔[2]

موجودہ شامی بحران کی ایک بنیادی وجہ وہاں نہ ختم ہونے والی آمریت تھی جس میں عوام کو بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا۔

شامی آمریت کا پس منظر

استعمار سے آزادی کے بعد 1961ء تک کے عرصہ میں شام کچھ وقت کے لیے مصری حکومت کے مازیر نگین رہا تھا۔ جبکہ 1961ء میں فوجی انقلاب کے ذریعے وہاں ایک خاندان کی آمریت کی بنیاد رکھ دی گئی جو اب تک ختم نہیں ہو سکی۔ انقلاب کے وقت مصر اور شام میں جمال عبدالناصر کی حکومت تھی، یہ بھی اگرچہ آمریت تھی تاہم اس نوع کی بادشاہت نہیں تھی جیسی شام میں نمودار ہوئی۔[3] یوں تو اسد خاندان براہ راست 1971ء میں اقتدار پر قابض ہوا لیکن اس کی مداخلت اور کردار 1961ء میں مصر سے علیحدگی کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔

---

[1] الفریڈ کوبون، ڈکٹیٹر شپ، ص، 25، جوناتھن کیپ، لندن 1939

[2] پروفیسر رانا اعجاز، امور سیاسیات، ص 156، ڈوگر پبلیشرز، لاہور

[3] Christopher Philips, The Battle for Syria(Yale University Press, 2016), 111.

"28 اکتوبر 1961ء کی صبح سات بجے شام کے قومی ریڈیو سے فوجی ترانے بجنے شروع ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد خبر دی گئی کہ ملک میں فوجی نظام نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد سارا دن ریڈیو سے مسلسل ترانے بجائے جاتے رہے۔ جب جمال عبد الناصر کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے مصر سے فوج بھیج کر انقلاب کو کچلنے کی کوشش کی اور علیحدگی کو مسترد کیا۔ لیکن شام میں فوجی بغاوت مربوط و منظم تھی جس نے مصر کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔"[1]

اس مارشل لاء میں براہ راست حافظ الاسد نے کمان نہیں سنبھالی تھی بلکہ یہ ایک فوج کے اندر کی تنظیمی سعی تھی اس لیے فوج کی ایک مجلس شوریٰ ملک میں نظام کو سنبھال رہی تھی جس میں حافظ الاسد بھی شریک تھے۔ تب حزب البعث کے نام سے شام میں ایک سیاسی جماعت بھی تشکیل دی گئی۔ ملک کی اکثریت آبادی مصر سے علیحدگی کے حق میں نہیں تھی۔ اس لیے جب انتخابات ہوئے تو ان میں اخوان المسلمون کے متعدد نمائندوں نے کامیابی حاصل کی۔ تاہم انفصال اور سیاسی تحرک کا یہ زمانہ طویل نہیں تھا۔ 1963ء میں حافظ الاسد نے حزب البعث کے اندر ساز باز کر کے اس کو اپنے حق میں کر لیا اور یوں عملاً شام کے اندر اسد خاندان کے اثر و رسوخ اور اقتدار کی بالواسطہ اساس رکھ دی گئی۔ لیکن اس وقت تک ابھی براہ راست حافظ الاسد کے خاندان نے اقتدار حاصل نہیں کیا تھا۔[2] اگرچہ حزب البعث میں طاقتور طبقہ اہل تشیع کا تھا لیکن اس میں کئی مختلف فرقے شامل تھے جو آپس میں لڑتے رہتے تھے، جن میں نصیری، دروزی اور علوی نمایاں تھے۔

اسد خاندان کا شامی اقتدار پر غلبہ:

یہ کشمکش اس وقت اپنے انجام کو پہنچ گئی جب حافظ الاسد نے جماعت کے اندر سے اپنے تمام حریفوں کو ختم کر کے خود براہ راست اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ یہ 1971ء کا سال تھا۔ اس سے اگلے پانچ سالوں کے اندر جبری گمشدگیوں، قتل یا زندان میں ڈالنے کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ملک میں مکمل طور پہ حافظ الاسد کی گرفت مضبوط ہو گئی۔[3]

خاندانی رقابت:

1971ء سے شروع ہونے والی آمریت نے سرزمین شام کی عوام کی زندگیوں کو بوجھل کر دیا تھا۔ حافظ الاسد نے نہ صرف یہ کہ اہم حکومتی اداروں میں اپنے ہم خیال افراد کو چن کر منتخب کر لیا تھا بلکہ اپنے ذاتی تشخص کو مضبوط بنانے اور اپنی پرچھائی کو غالب کرنے کے لیے ان تمام افراد کو بھی علیحدہ کر دیا جو اس سے اختلاف کی جسارت کرتے تھے یا کسی بھی سطح پر اس کے انفرادی تشخص کو متاثر کر سکتے تھے۔ ان افراد میں کی فہرست میں اس کا اپنا بھائی رفعت الاسد

---

[1] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 155۔

[2] عروہ التاج، الاستقلال الثانی نحو مبادرۃ الاصلاح السیاسی فی العالم العربی (القاہرہ، مکتبہ الشرق الجدید، 2018ء) 77۔

[3] علی باروت، مسارات السلطۃ والعارضہ فی سوریا (القاہرہ، مرکز القاہرہ لدراسات حقوق الانسان، 2018ء)، 251۔

بھی شامل تھا جس نے ابتداء سے ہی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا اور اس کی خواہش و حکم کے مطابق کئی خونی معرکوں میں قیادت کرتے ہوئے حریفوں کو شکست دی تھی۔

"ملک میں جب فوجی انقلاب کے بعد مصر سے علیحدگی کا اعلان کیا گیا تھا تو اس کے بعد کچھ وقت کے لیے سیاسی تحرک کی فضا قائم رہی تھی اور انتخابات بھی ہوئے تھے جس میں مسلم سیاسی فکر کی نمائندہ جماعت اخوان المسلمون نے کافی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس سے بظاہر یہ تاثر سامنے آیا تھا کہ ایک طرف یہ کہ سنی اکثریت رکھنے والے سیاسی ترجمان حکومتی اداروں میں رسائی حاصل کریں گے بلکہ ایک ایسی جماعت جو سیاسی اسلام کی دعوت دیتی اور اس کے غلبے کے لیے کوشاں تصور کی جاتی ہے وہ اقتدار کے ایوان میں نظر آئے گی۔ ملک میں تب اخوان المسلمون کو کافی پذیرائی حاصل تھی اور حکومت میں شامل حافظ الاسد کے حامی اراکین میں سے بھی کچھ ایسے لوگ تھے جو اخوان کے لیے ہمدردی رکھتے تھے۔ تاہم حافظ الاسد کو یہ منظور نہیں تھا اور اس کی کوشش تھی کہ اخوان کے عناصر کو پس دیوار کر دیا جائے۔ یہ ہدف رفعت الاسد کو دیا گیا تھا جس نے ایک خونی آپریشن کے ذریعے اخوان کو پیچھے دھکیل دیا۔"[1]

جماعت کے متعدد اہم اراکین کو قتل کیا گیا، کئی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیے گئے اور کئی دیگر شخصیات کو غائب کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ حافظ الاسد کے سیاسی استبداد کے لیے دوسرا بڑا خطرہ مارکسی فکر اور سوشلزم سے تعلق رکھنے والی بائیں بازو کی جماعتیں تھیں جو ملک میں آزادانہ سیاسی فضا کی ہمواری کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔ حماۃ نامی صوبے میں بائیں بازو کی جماعتیں کافی طاقتور سمجھی جاتی تھی۔ وہاں بھی رفعت الاسد کی سربراہی میں آپریشن کیا گیا اور اس فکر کو جبری طور پہ دبا دیا گیا۔

لیکن وہ ڈھانچہ جو حافظ الاسد کی سوچ میں واضح نظر آرہا تھا اس میں سے اس کا بھائی رفعت الاسد کیلئے بھی جگہ نہیں تھی۔ رفعت الاسد کے پاس فوج کی سربراہی تھی۔ حافظ الاسد نے اپنے ابتدائی دور میں سنی اکثریت آبادی کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے یہ اقدام اٹھایا تھا کہ ملک کے اہم سول عہدوں پر ان افراد کو متعین کیا جو سنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ملک کا وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ بھی سنی تھے۔ لیکن فوجی عہدوں اور انٹیلی جنس ایجنسی میں اپنے ہم خیال کے اور قریبی رشتوں کو متعین کر رکھا تھا۔ رفعت الاسد اگرچہ اپنے بھائی کے ساتھ کرم کرتا رہا اور اس کے لیے مخلص تھا لیکن کچھ وقت کے بعد وہ حافظ الاسد کی بعض پالیسیوں سے متفق نہیں رہا تھا۔ مثال کے طور پہ اس کا خیال تھا کہ شام کو امریکا اور مغربی ممالک کے ساتھ زیادہ گہرے روابط رکھنے چاہیئں جبکہ اس کے بھائی صدر حافظ الاسد روس کی کی طرف میلان رکھتا تھا۔ رفعت الاسد کا کہنا تھا کہ اگر روس کے ساتھ ہی تعلقات رکھنے تھے تو

[1] علی باروت، مسارات السلطۃ والعارضہ فی سوریا (القاہرہ، مرکز القاہرہ لدراسات حقوق الانسان، 2018ء) 190۔

اپنے ملک سے سوشلزم کی فکر کو کس لیے نکال دیا گیا تھا۔ اسی طرح صدر اسد نے ایران کے ساتھ روابط میں نرمی پیدا کر لی تھی۔ جبکہ رفعت الاسد کی رائے تھی کہ ایرانی فکر اور اخوان المسلمون کی سوچ کے مابین زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں سیاسی اسلام کی نمائندگی کرتے اور اس کی ترویج کرتے ہیں، ایسے میں اخوان کو ملک میں جگہ نہ دینا مگر ایران کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ فلسطین کے معاملے میں رفعت الاسد کا خیال تھا کہ یاسر عرفات پر کلی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔[1]

اس طرح کے کئی معاملات تھے جن میں دونوں بھائیوں کا اختلاف تھا۔ حافظ الاسد کو یہ پسند نہیں تھا کہ رفعت الاسد مغربی ممالک کے دورے کرے یا داخلہ پالیسی میں کسی حوالے سے اس سے اختلاف رکھے۔ ان کے آپس کے اختلافات اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ 1984ء میں ایک بار رفعت الاسد نے دمشق کا گھیراؤ کر لیا تھا اور یہ صدر حافظ الاسد کے لیے واضح پیغام تھا کہ وہ جب چاہے اس کے اقتدار کو کمزور کر سکتا ہے۔ حافظ الاسد اس وقت اپنے بھائی کے گھر گیا اور والدہ کے سامنے اس سے کئی امور پر طویل بحث کی اور اسے سمجھایا کہ شام میں اس خاندان کی قوت اس وقت تک ہے جب وہ ساتھ رہیں گے۔ اس کے بعد ماں کے اصرار پر رفعت الاسد نے دمشق کے گھیراؤ کو ختم کر دیا تھا۔ تاہم حافظ الاسد کو یہ سمجھ آ گئی تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی اس کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اسی طرح اگلے برس جب حافظ الاسد کو بیماری کا جھٹکا لگا تو اس نے اپنے نائب کے طور پہ چھ افراد کی مجلس منتخب کر دی تھی جس میں اس کے بھائی کا نام شامل نہیں تھا۔ یہ امر سب کے لیے باعث تعجب تھا۔ فوج کے کئی عہدیداران رفعت الاسد کے پاس گئے اور مطالبہ کیا کہ آپ آگے آئیں۔ کچھ وقت کے لیے اس نے زمام اقتدار سنبھالنے کی ذمہ داری ادا کی مگر یہ صدر حافظ الاسد کو درست اقدام نہیں لگا۔ اس لیے اس نے رفتہ رفتہ رفعت الاسد کی طاقت کو کم کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی حافظ الاسد اپنے بعد اقتدار کو اپنی اولاد میں منتقل کرنا چاہتا تھا، وہ اپنے بھائی کو اس سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس اپنے بڑے بیٹے باسل الاسد کو حکومتی معاملات کی فائلیں دینا شروع کر دیں اور اس سے کام لیا جانے لگا تاکہ اسے تجربہ کار بنایا جاسکے۔ اسی اثنا میں باسل الاسد کو ایک آپریشن سونپا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں غیر قانونی کاروبار جس میں منشیات کا کام بھی شامل تھا، اس کا قلع قمع کیا جائے۔ بظاہر یہ آپریشن ملک میں غیر قانونی کاروبار کے خلاف تھا لیکن اس میں رفعت الاسد، اس کے بیٹوں اور قریبی دوستوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ان کے کاروبار کو مشکوک قرار دے کر بند کیا جانے لگا اور انہیں قانونی گرفت سے بچنے کی خاطر ملک سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ بالآخر رفعت الاسد لندن منتقل ہو گیا۔[2] اس کے ساتھ اس کا خاندان

---

[1] محمد المبارک، ترکیب المجتمع السوری (القاہرہ، مکتبہ الحداد، 2015ء)44۔

[2] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات (دوحہ، مرکز للعلم، 2001ء)، 177۔

اور قریبی دوست بھی ملک چھوڑ کر جانے لگے۔ یوں صدر حافظ الاسد کے بعد ملک شام کی زمام اقتدار کے لیے اس کی اولاد کا راستہ صاف ہو گیا۔ لیکن اس دوران یہ حادثہ ہوا کہ باسل الاسد لبنان گیا تو وہ کار حادثے میں مارا گیا۔ اسے اگر چہ ایک حادثہ قرار دیا گیا مگر کئی ماہرین کا خیال ہے کہ اس کے پیچھے رفعت الاسد اور اس کے بیٹوں کا ہاتھ تھا جو باسل الاسد کے آپریشن کی وجہ سے ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔
لہذا شام میں قائم ہونے والی آمریت میں کسی اور کے لیے جگہ نہیں تھی، حتی کہ صدر کے بھائی بھی اس کے آذار سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ایسی آمریت میں عام آدمی کے حقوق کا تصور بہت مشکل تھا۔

بشار الاسد کی آمریت:

باسل الاسد کی وفات کے بعد شام میں بطور نئے ولی عہد کے بشار الاسد کا انتخاب کیا گیا۔ جون 2000ء میں جب حافظ الاسد کی وفات ہوئی تو اس کی جگہ بشار الاسد کو صدر بنایا گیا۔ حافظ الاسد کی وفات کے وقت شام کے عوام نے حکمرانی کی وارثت کے لیے ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ ان کے خیال میں بشار الاسد اپنے والد کی پالیسیوں کو آگے بڑھائے گا اور جبر کا وہ دور کبھی ختم نہیں ہوگا جو 30 برس قبل شروع ہوا تھا۔ مگر بشار الاسد نے عوام کو یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ ملک میں پرانی پالیسیوں پر نظر ثانی کرے گا اور نظام کا رخ پہلے سے تبدیل کرے گا۔[1] تب ایک ایسی تحریک کے اٹھنے کے خدشات بھی نمودار ہوئے جو بادشاہت کے خلاف تھی اور جمہوریت کا مطالبہ کرتی تھی۔
لیکن بشار الاسد کی یقین دہانیوں کے بعد عوام نے بہر حال وراثتی نظم حکومت بادشاہت کو قبول کر لیا۔ ''عوام کے اعتماد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بشار الاسد نوجوان ہے اور اس کی عمر چونتیس برس ہے۔ اس لیے وہ فرسودہ نظام کو تبدیل کرے گا۔ اس کے علاوہ اس کی تعلیم لندن سے بھی تھی۔ ایک جدید معاشرے سے تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان کا حکمران بننا شاید ایک امید تھی کہ سابقہ پالیسیوں میں تبدیلی آئے گی۔ لوگوں کو شہری آزادیاں میسر ہوں گی اور تقسیم کی دیوار منہدم ہو جائے گی۔ مزید براں امید کی ایک اور علامت یہ بھی نظر آئی تھی کہ بشار الاسد نے جس لڑکی سے شادی کی وہ علوی نہیں تھی، بلکہ سنی مسلک سے تعلق رکھتی تھی۔ اسماء الاسد کا خاندان شام سے تھا مگر وہ خود لندن میں پیدا ہوئی اور وہیں پرورش پائی۔ اس نے معیشت کے شعبے میں اعلی ڈگری حاصل کر رکھی تھی۔ اس طرح کی صورتحال سے عوام کو حوصلہ اور امید ملی کہ شام کا مستقبل ماضی جیسا نہیں ہوگا۔ ملک کی اکثریت سنی آبادی نے بھی ان وجوہ کو مثبت لیا۔''[2] جب بشار الاسد حکمران منتخب ہوا تو اسماء لا اسد نے ملک کی تمام بڑے شہروں میں دورے کیے تھے اور عام لوگوں سے ملاقاتیں کی تھیں۔ عوام نے اس اقدام کو بھی حوصلہ افزاء خیال کیا۔

---

[1] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات (دوحہ، مرکز للعلم، 2001ء)، 179۔
[2] سمیر قصیر، دیموقراطیۃ سوریا (القاہرہ، دارالنہار، 2018ء) 127۔

تاہم ان ظاہری علامات کے باوجود جو شامی عوام کے لیے حوصلہ افزاء تھیں، ملک میں مفکرین اور دانشور طبقے کی جانب سے تحفظات کا اظہار کیا جاتا رہا۔ جب حافظ الاسد کی وفات ہوئی تو شام میں اس طبقے کی جانب سے بہارِ دمشق کے نام سے ایک پر امن فکری تحریک کا آغاز بھی ہوا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ملک میں بادشاہت اور استبداد کو ختم کر کے جمہوری نظم کو بحال کیا جائے۔ "انہوں نے دستور میں تبدیلی کا تقاضا جس کے مطابق حکمرانی کا حق اسد خاندان کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے بلکہ صدارت کے لیے آزادانہ انتخابات کرائے جس کے بعد ایک متفقہ حکمران منتخب ہو۔ ان مطالبات کو عوامی پذیرائی حاصل ہوئی تو نومنتخب صدر بشار الاسد نے اپنے پہلے خطاب میں یہ یقین دلایا کہ وہ اپنی حکومت میں جمہوری نظام کا تجربہ ضرور کریں گے اورانسانی شہری حقوق کی پاسداری کا مکمل دھیان رکھا جائے گا۔ لیکن جب وہ صدر منتخب ہوا تو تھوڑے ہی عرصے بعد ان اقدار کو پس پشت ڈال دیا گیا"۔[1]
اور اس کے لیے جو جواز پیش کیے گئے وہ کچھ یوں تھے:[2]

1۔ ایک تو 2001ء کے نائن الیون کے بعد سے ساری دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ چھیڑ دی گئی۔ اس کی آڑ میں متعدد مسلم آمریتوں نے فائدہ اٹھایا۔ اسی طرح شام میں یہ تصور رائج کیا گیا کہ ملک میں دہشت گردی کا خطرہ منڈلا رہا ہے اور شدت پسند موقع کے انتظار میں ہیں۔ اگر موجودہ نظام میں تبدیلی لانے کی کوشش کی گئی اور آزادیاں فراہم کی گئیں تو اس کی آڑ میں شدت پسند عناصر کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ نظام کو اسی طرح چلنے دیا جائے۔

2۔ دوسرا جواز وہی پیش کیا گیا جو حافظ الاسد اور دیگر ان جیسے آمر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہ ملک کو بادشاہت کے نظام سے جمہوریت کی جانب انتقال سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک مرکزیت کی حامل مضبوط حکومت کو جگہ دی جائے۔ بشار الاسد کا کہنا تھا کہ سیاسی نظم کے ڈھانچے کی نوعیت پر زور دینے کی بجائے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک میں موجودہ سیاسی استحکام کو متاثر نہ ہونے دیا جائے۔ ملک میں سیاسی استحکام کے متاثر ہونے کا مطلب شامی عوام جانتے تھے اور ماضی میں حافظ الاسد کے دور میں داخلی جبر واستبداد کی صورت میں اس کا تجربہ بھی کر چکے تھے۔ ماضی میں حکومت کی مخالفت کرنے والوں کو یا اصلاح کی جدوجہد میں شریک کسی جماعت سے وابستہ لوگوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور کئی بار خونی فسادات بھی ہوئے۔

3۔ تیسرا جواز یہ پیش کیا گیا تھا کہ شامی تاریخ و ثقافت مغربی نظم و ثقافت سے بالکل الگ ہے۔ اس لیے ملک میں من وعن جمہوری نظام کو نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ عوام اس کے لیے تیار نہیں ہیں اور نہ ہی یہ ممکن کہ عشروں پر

---

[1] عزمی بشارہ، سوریادرب الاحلام نحو الحریہ، 156

[2] سابقہ مرجع، 213۔

مشتمل ایک نظام کو یک دم تبدیل کر دیا جائے۔ جب بشار الاسد نے پہلا صدارتی خطبہ دیا تھا تو اس میں بھی اس نے کہا تھا کہ شام کی تاریخ و ثقافت مغربی ممالک سے مختلف ہے۔ یہاں پر جمہوری نظم و اقدار کو نافذ کرنا ممکن نہیں ہو گا۔ تاہم رفتہ رفتہ جمہوری سیاسی اقدار کا تجربہ کیا جائے گا۔ بشار الاسد نے مقتدر حلقے کی نیت پر غبار نہیں رہنے دیا اور گویا یہ کہا کہ ہم شہری حقوق اور جمہوری اقدار کی فراہمی کے لیے تیار ہیں لیکن عوام تیار نہیں ہیں۔ سماجی ساخت اتنی مختلف ہے کہ مغربی جمہوری اقدار کو قبول نہیں کر پائے گی۔ یا یہ کہ اس کے نقصانات بر آمد ہوں گے۔

آمریت کی مزاحم تحریکیں:

اگرچہ مقتدر حلقوں کی جانب سے سیاسی نظم کی تبدیلی کو مسترد کیا جاتا رہا اور آمریت کو ہی واحد و حتمی حل کے طور پہ پیش کیا جاتا رہا لیکن ملک میں دانشور و سول سوسائٹی کی طرف سے یہ مطالبہ ختم نہیں ہوا کہ آمریت کو ختم کیا جائے اور سیاسی آزادی کو یقینی بنایا جائے۔ 2005ء میں اعلانِ دمشق کے نام سے ایک اعلامیہ جاری کیا گیا تھا جس میں تفصیل سے سیاسی نظم کے متعلق ترامیم پر گفتگو کی گئی تھی۔ اس اعلامیے کو تمام جماعتوں کی جانب سے منظور کیا گیا تھا جن میں لبرل، سوشلسٹ، قومیت پرست اور مذہبی طبقات شامل تھے۔ شام کے دستور میں شق نمبر 49 میں اخوان المسلمون کی سیاسی سرگرمیوں پر مستقل پابندی عائد کی گئی تھی۔ اعلامیے میں اس پابندی کو ابھی اٹھانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ اعلامیہ ایک طاقتور دستاویز تھی کہ اسے ملک کی تمام نمائندہ جماعتوں کی حمایت حاصل تھی۔
سب سے اہم بات یہ تھی کہ لبرل و سوشلسٹ جماعتوں نے بھی مذہبی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کو بنیادی انسانی سیاسی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا تھا۔ 1963ء سے لے کر اب تک یہ اعلامیہ حکومتی جماعت حزب البعث کے خلاف سب سے بڑا اقدام تھا جو اٹھایا گیا تھا۔ اس کو اس لیے بھی زیادہ پذیرائی ملی اور عوام نے اس کی حمایت کی کیونکہ اس کی بنیاد حکومتی حلقے کے اپنے وعدوں سے فرار پر رکھی گئی تھی۔ بشار الاسد نے پانچ سال قبل منتخب ہوتے وقت جن اصلاحات کا وعدہ کیا تھا انہیں پس پشت ڈال دیا گیا۔ لہٰذا اعلانِ دمشق میں ان وعدوں کے ایفاء پر زور دیا گیا تھا کہ انہیں پورا کیا جائے۔[1]

"لیکن مقتدر حلقے کو علم ہو گیا تھا کہ اگر یہ اعلامیہ عملی تحریک کی صورت میں بدل گیا جیسا کہ حزب مخالف کی جماعتوں نے کہا تھا تو اس کا انجام حکومت کی کمزوری پر ہو گا۔ اس لیے حکومتی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے بشار الاسد نے اعلان دمشق کی نمائندہ افراد پر پابندیاں عائد کر دیں۔ ان کے باہر سفر کو روک دیا گیا اور بعض کو گرفتار کر لیا گیا۔ اعلانِ دمشق کے اعلامیے کے بعد ملک کے اندر حکومت کے خلاف بے چینی اور ہلچل واضح نظر آنے لگی۔ بالخصوص جب 2005ء سے 2007ء کے درمیان دو سالوں میں شام کو ناموافق پالیسیوں کی وجہ سے سیاسی تنہائی کا

---

[1] ہندی احسان، کفاح الشعب العربی (بیروت، ادار الشئون العامہ، 2009ء)، 84۔

سامنا ہوا اس وقت حکومتی حلقے پر دباؤ میں اضافہ ہو گیا۔ معاشی ابتری نے اس کی ساکھ مزید متاثر کیا۔ حتیٰ کہ لبنان میں موجود شامی افواج کو بھی واپس بھیج دیا گیا جو پچھلے کچھ عرصے سے حفاظتی تعاون کے لیے وہاں قیام پذیر تھیں۔ لیکن 2007ء کے بعد جب صورتحال بہتر ہونا شروع ہوئی اور ملک کو سیاسی تنہائی سے باہر نکلنے کا موقع ملا تو حکومتی حلقے کے رویے میں پہلے سے زیادہ شدت نظر آنے لگی۔ اس نے شہری حقوق کے لیے اٹھنے والی آوازوں اور مطالبات کو سختی کے ساتھ کچلنا شروع کر دیا"۔[1]

اس کے بعد جب عرب بہار شروع ہوئی تو اس نے شام کو بھی اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ملک میں ابتدائی طور پہ جو احتجاج شروع ہوئے ان میں صدر بشار الاسد کی معزولی کا مطالبہ نہیں کیا گیا اور یہ مظاہرے پر امن تھے۔ ان میں شہری حقوق اور بعض سیاسی آزادیوں کا مطالبہ کیا گیا۔ عوام نے یہ مطالبہ کیا کہ سماجی و جمہوری اقدار کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ تب ملک کے اندر اور باہر کے دانشور طبقے کا خیال تھا کہ پہلے سے موجود چنگاری کے ہوتے ہوئے اور اب پوری عرب دنیا میں انسانی حقوق کی بحالی کے لیے جاری مظاہروں کے بعد شام کی اشرافیہ اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرے گی اور عوام کے حق میں لچک دکھائے گی۔ مگر حقیقت میں اس کے بالکل برعکس ہوا۔

بشار الاسد نے اس دوران پہلا خطاب کیا اور اس میں کہا کہ نظام میں کوئی تبدیلی گوارا نہیں کی جائے گی۔ آپ لوگ یا تو میرے ساتھ ہوں گے یا میرے خلاف۔ اس کے خطاب کا متن حکومتی جارحانہ پالیسی کی جھلک پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا:

"یہ جو کچھ ہو رہا ہے، فتنہ ہے۔ اور فتنے کو دبانا قومی، اخلاقی اور شرعی فریضہ ہے۔ ملک کا ہر شہری جو اس فتنے کی سرکوبی میں حصہ ڈال سکتا ہے اور وہ عملاً یہ نہیں کرتا تو اسے بھی اس فتنے کا حصہ شمار کیا جائے گا۔ فتنہ قتل سے زیادہ مہلک و خطرناک ہے جیسا کہ قرآن میں بھی کہا گیا۔ جو شخص بھی جان بوجھ کر یا بھول کر اس میں شریک ہے وہ اپنے وطن کے خلاف کھڑا متصور ہو گا۔ اور یہ واضح رہے کہ درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ ریاست کا مسئلہ نہیں بلکہ وطن کا ہے۔ سازش بہت بڑی اور خطرناک ہے اور ہم اس وقت کسی جنگ و جدل میں نہیں پڑنا چاہیں گے۔ شامی عوام نرم مزاج اور پر امن ہے۔ لیکن ہم ماضی میں بھی اپنی اقدار و روایات اور مفادات کا دفاع کرتے آئے ہیں، اگر آج بھی ہم پہ کوئی معرکہ مسلط کیا گیا تو پھر اسے ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔"[2] مزاحمین کے لیے بہت واضح اور جاندار پیغام تھا کہ کسی بھی صورت میں ملکی سلامتی کو آنچ آنے نہیں دی جائے گی۔

---

[1] ایلیاد سوقی، المقاومہ الاھلیہ فی سوریا (بیروت، مکتبہ الدیدات، 2016ء) 36۔

[2] رضوان زیادہ، التحول الدیمقراطی فی سوریہ، 144۔

شام ایک سکیورٹی اسٹیٹ:

شام میں 1982ء کے بعد سے 2011ء تک کسی قسم کوئی مظاہرے نہیں ہوئے۔ سیاسی جمود اور شہری حقوق پر پابندیوں کے باوجود اتنے عرصے تک ملک میں بالکل احتجاج کی فضا قائم نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ 1982ء میں اخوان المسلمین کے خلاف ہونے والا بھیانک کریک ڈاؤن تھا۔ یہ حماۃ کے علاقے میں کیا گیا تھا جس میں اخوان المسلمون اور اس کی سیاست سے ہمدردی رکھنے والوں کا قتل عام کیا گیا تھا۔ یہ حافظ الاسد نے کر دیا تھا جس کی کمان اس کے بھائی رفعت الاسد نے سنبھالی تھی۔ یہ کریک ڈاؤن اتنا خونی اور پر تشدد تھا کہ اس کے بعد تین عشروں تک کسی نے حکومت کے خلاف سڑک پر آنے کی جرأت نہیں کی۔[1] اس کریک ڈاؤن کے بعد ملک کے سیاسی ڈھانچے میں بھی بڑی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی تھی۔ تب سے امن کی تعریف میں ریاست و سماج کے باہمی تعلق کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ یعنی کہ سماج میں سے کوئی بھی اگر ریاست یا اس کے ادارے کے خلاف بات کرے گا تو اسے بدامنی کی صورت شمار کیا جائے گا۔ ریاست ایک فلاحی ادارے کے بجائے اایک سکیورٹی اسٹیٹ بن گئی جس میں فوج اور سکیورٹی کے معاملات بنیادی حیثیت اختیار کر گئے۔

بشار الاسد کے عہد حکومت میں بھی ماضی کا عکس نمایاں تھا۔ مگر لوگ یہ تصور نہیں کرتے تھے کہ کسی بھی نوع کے استبداد کے باوجود 1982ء کے کریک ڈاؤن کو دہرایا جائے گا۔ مگر یہ ایک غلط فہمی ثابت ہوئی۔[2] حافظ الاسد کے کریک ڈاؤن میں میڈیا بلیک آؤٹ کیا گیا تھا اور دنیا کی نظروں سے اجھل ایک بھیانک منظر نامہ حقیقت میں تبدیل کیا گیا، مگر بشار الاسد نے ساری دنیا کے سامنے وہ سب کیا جو ماضی میں بھی متصور نہیں کیا گیا ہو گا۔ بشار الاسد اپنی عوام کو حکومتی مشینری کے ذریعے سے دبانے کی بجائے مل بیٹھ کر معاملے کو حل کرنے کی طرف جائے تو معاملہ شاید اس قدر خراب نہ ہوتا۔ اس سب خون ریزی کا نقصان آخر میں ملک شام کو ہوا اور سب سے زیادہ متاثر غریب اور عام عوام ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام بیرونی گروہوں کی آماہ جاہ بن گیا۔ اور پھلتا پھولتا ملک شام کھنڈر بن گیا۔ اب بھی وقت ہے بشارالاسد کو چاہیے کہ عوامی حمایت حاصل کرنے کیلئے جو ممکنہ اصلاحات ہو سکیں وہ سب کر جائے اور ملک شام کو بیرونی اور اندرونی خطرات سے نکالنے کیلئے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر سوچنا چاہیے۔

---

[1] سابقہ مرجع، 120۔

[2] ادھم آل جندی، تاریخ الثورات السوریہ (بیروت، دار صادر، 2020ء) 68۔

فصل سوم

انسانی حقوق کی پامالی

بنیادی انسانی حقوق کا تصور

انسان طبعاً معاشرت پسند ہے۔اس کی گروہی فطرت اسے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ اپنی پیدائش سے لے کر تادم زیست بے شمار افراد کی خدمات، توجہ اور سہاروں کا محتاج ہے۔اپنی تعلیم و تربیت، رہائش، پرورش، لباس اور خوراک کی ضرورت کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنی فطری صلاحیتوں کے نشوونما و ارتقاء اوران کے عملی اظہارکے لیے بھی انسان اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔پھر یہ اجتماعی زندگی خاندان، برادری، محلے، شہر، ملک اور بحثیت مجموعی پوری نوع انسانی تک پھیلے ہوئے تعلقات کے یہ چھوٹے بڑے دائرے انسان کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں۔باپ، ماں، بیٹے، استاد، شاگرد، تاجر، ملازم، شہری اور حکمران کی بے شمار مختلف حیثیتوں میں انسان پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔پھر ان فرائض کے مقابلہ میں انسان پر کچھ متعین حقوق لاگو ہوتے ہیں۔ ان حقوق کے بارے میں صلاح الدین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"ان حقوق میں بعض کی حیثیت محض اخلاقی ہوتی ہے۔ مثلاً بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا حق شفقت، ضرورت مند کا حق امداد، مہمان کا حق تواضع، بیمار کی تیمارداری وغیرہ اور بعض حقوق کو قانونی تحفظ ہوتا ہے۔مثلاً حق ملکیت، حق اجرت، حق مہر، اور حق معاوضہ وغیرہ یہ ایسے حقوق ہیں۔جن کا تعلق کسی نہ کسی مفاد سے ہوتا ہے اور ملک کا قانون اس مفاد کو تسلیم کر کے اسے عدلیہ کے ذریعے قابل حصول بنا دیتا ہے۔یہ حقوق قانونی حقوق یا مثبت حقوق کہلاتے ہیں۔فرد کے حقوق کا ایک اور دائرہ ریاست سے تعلقات کے مقابلے میں فرد کو جو حقوق دیئے جاتے ہیں۔انہیں ہم بنیادی حقوق کہتے ہیں۔ان حقوق کے لیے بنیادی انسانی حقوق اور انسان کے پیدائشی حقوق کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ان حقوق کی ضمانت ملک کے عام قوانین کی بجائے سب سے بالاتر قانون"دستور" میں دی جاتی ہے۔انہیں"بنیادی حقوق"اس لیے کہا جاتا ہے کہ ریاست کا کوئی بھی باز و خواہ وہ انتظامی ہو یا قانون ساز ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔[1]

---

[1] بنیادی حقوق، صلاح الدین، ترجمان القرآن، لاہور، ص:2/40

ملکی آئین میں بنیادی حقوق کی شمولیت کا مقصد

کسی ملک کے آئین میں بنیادی حقوق کی شمولیت کا مقصد ریاست کے اختیارات قانون سازی کا دائرہ متعین کرنا ہوتا ہے اور اسے عدلیہ کے ذریعے آئینی حدودو تحفظات کا پابند بنانا ہوتا ہے۔ تاکہ حکمران شہریوں کے بنیادی حقوق غصب کر کے آمریت کی راہ اختیار نہ کر سکیں۔ ان حقوق کے مطالبہ کا اصل محرک انسان کی عزت وعظمت اور اس کے وقار و احترام کو آمریت یا بے رحم اجتماعیت کی چیرہ دستی سے تحفظ دینا، اس کے لیے آبرو مندانہ زندگی بسر کرنے کی ضمانت مہیا کرنا، اسے اپنی صلاحیتوں کی نشوونما دینے اور ان صلاحیتوں کے ثمرات سے متمتع ہونے کے مواقع بہم پہنچانا اور فکر و عمل کی آزادی کا ایک ایسا دائرہ فراہم کرنا ہے جس سے ریاست دوسرے افراد معاشرہ کی مداخلت سے محفوظ ہو۔ حقوق کی پہچان تین طریقوں سے کی جاسکتی ہے، وہ پہچان جو انسانی ضمیر کرتا ہے۔ وہ پہچان جو لوگوں کی رائے سے ملتی ہے یا سماجی رائے اور ریاست کی طرف سے دی گئی پہچان۔ انسانی ضمیر اخلاقی حقوق کی پہچان کرتا ہے۔ سماجی رائے سماجی حقوق کی پہچان کرتی ہے اور وہ حقوق جن کی پہچان ریاست کرتی ہے کو عدالتی حقوق کہا جاتا ہے۔

اخلاقی حقوق

ایسے حقوق جن کی ادائیگی پر معاشرہ میں اخوت و ہمدردی کے جذبات کو فروغ ملتا ہے۔ جیسے بزرگوں کا ادب، مریض کی عیادت، بچوں پر شفقت، پڑوسیوں سے حسن سلوک، مسلمانوں کی دعوت قبول کرنا، جنازے میں شرکت، قرابت داروں سے حسن معاملہ، دوسروں کا مصیبت میں ساتھ دینا، مہمانوں کی خاطر تواضع دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آنا وغیرہ۔ چونکہ ان تمام حقوق کا تعلق انسان کی باطنی کیفیت سے ہوتا ہے اور شاید ہی گرفت سے ماوراء رہتے ہیں اس لیے قانون کے دائرہ عمل میں شامل نہیں ہیں۔ اخلاقی حقوق کے تحت ہر شخص دوسرے سے کچھ توقعات وابستہ کرتا ہے اور ان توقعات کو پورا کرنا ہر شخص کا اخلاقی فرض ہے، مثلاً ایک باپ کو یہ اخلاقاً حق حاصل ہے کہ بیٹا اس سے بہتر سلوک کرے اور باپ کا یہ فرض ہے کہ وہ بیٹے سے شفقت سے پیش آئے اب اگر یہ ان اخلاقی اقدار کی پرواہ نہیں کرتے تو عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا جا سکتا۔ کیونکہ ایسا نہ کرنا کوئی قانونی جرم نہیں ہے یہ ایک اخلاقی فرض ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہیں قانونی طور پر کوئی سزا نہیں دی جا سکتی لیکن اخلاقی

حقوق کی پابندی نہ کرنےوالوں کو معاشرہ اپنے طور پر یہ سزا دے سکتا ہے مثلاً ایسے شخص سے قطع تعلقی اس کے لیے بہت بری سزا ہے۔اخلاقی حقوق کو معاشرے کی پشت پناہی حاصل ہو سکتی ہے۔مذہب اور اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا میں اخلاقی حقوق کو یوں بیان کیا گیا ہے:۔

"Those rights which rest merely on the approved of public opinion called moral rights"(1)

"ایسے حقوق جو عوامی خیالات اور منظور پر منحصر ہوں ان کو اخلاقی حقوق کہتے ہیں۔"

قانونی حقوق

وہ حقوق جو قانون موضوع کے تحت آتے ہیں اور انتظامیہ کے ذریعے قابل حصول ہوتے ہیں۔ یعنی قانونی حقوق کی پشت پر ریاست کی قوت نافذہ ہوتی ہے۔یہ وہ حقوق ہیں جن کی بنیاد قانون پر ہوتی ہے قانون کے ذریعے ہی ان کا تعین کیا جاتا ہے اور قانون کے ذریعے ہی ان کی حفاظت کی جاتی ہے ان حقوق کو ریاست تسلیم کرتی ہے ا ور ریاست کی جانب سے ہی یہ شہریوں کو عطا کئے جاتے ہیں اور ریاست ہی ان حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری ہوتی ہے ان حقوق کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی ہو سکتی ہے اور عدالت خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا بھی دے سکتی ہے۔ان حقوق کی بناء پر ہی ریاست کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ شہریوں کی وفاداری حاصل کرے کیونکہ اگر ریاست حقوق عطا کرتی ہے تو ان حقوق کی حفاظت کے لیے یہ ضروری امر ہے کہ ریاست کے شہری اس کے وفادار ہوں ان حقوق کی وجہ سے ریاست اور شہری کا رشتہ استوار ہوتا ہے اور لوگ انہی حقوق کی وجہ سے ہی امن و امان کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔انسائیکلوپیڈیا امریکانہ میں قانونی حق کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"A legal right is one which is protected by law and the mean of protection is the remedy. The existence of legal rights implies the existence of legal remedy, for me does not exist without the other."(2)

---

[1] بروہی اے۔کے،"United Nations of Human Rights"ص،313،کراچی

[2] " Encyclopedia of Region of Ethics".

قانونی حق سے مراد ایسا حق ہے جس کو قانونی تحفظ حاصل ہو اور تحفظ سے مراد چارہ کار کرنا۔ قانونی حق کے پائے جانے سے مراد قانونی چارہ جوئی کا وجود ہوتا ہے جبکہ ان میں ایک دوسرے کے بغیر نہیں پایا جاتا۔ انسائیکلوپیڈیا آف امریکہ قانونی حقوق کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔

"A legal right is one which is protected by law and the mean of protection is the remedy. The existence of legal rights implies the existence of legal remedy, for me does not exist without the other."(1)

"جیسا کہ کسی کے پاس کسی مہتمم کی طرف سے عدالتی قوت اختیار اور مدافعت کا عدالتی دعویٰ ہو۔ ایک عدالتی حق وہ ہے جس کی حفاظت قانون کرے حفاظت سے مراد چارہ جوئی ہے۔ عدالتی حقوق کی موجودگی عدالتی چارہ جوئی کا نتیجہ ہے کیونکہ نظم و ضبط کے بغیر کوئی قائم نہیں رہ سکتا۔"

قانونی حقوق کی دو اقسام ہیں:۔(1) شہری حقوق (2) سیاسی حقوق

شہری حقوق

وہ حقوق جن کا تعلق شہری زندگی سے ہوتا ہے۔ مثلاً جان و مال کا تحفظ، تعلیم، روزگار، علاج وغیرہ۔ ایک ملک اور معاشرے کا فرد خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان حقوق کے حصول کا حق رکھتا ہے۔ یعنی وہ حقوق ہیں جن کا تعلق شہری زندگی سے ہوتا ہے یہ حقوق شہریوں کے جان و مال کے تحفظ سے تعلق رکھتے ہیں اور ایسے مواقع فراہم کرتے ہیں جن کی وجہ سے ایک فرد پر امن زندگی گزار سکے اور اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکے۔ بغیر شہری حقوق کے مہذب زندگی نہایت مشکل ہے۔ یہ حقوق ہر ریاست میں یکساں حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ریاست میں معاشرے پر منحصر ہوتے ہیں یہ حقوق ملکی و غیر ملکی کی تمیز کئے بغیر سب کو حاصل ہوتے ہیں۔

سیاسی حقوق

وہ حقوق جن کی بدولت ہر شخص ملکی نظم و نسق میں شریک ہو سکتا ہے، اپنی سیاسی جماعت بنا سکتا ہے، لیڈر کا انتخاب کر سکتا ہے، حکومت پر تنقید نیز احتساب تک کر سکتا ہے۔ یعنی یہ وہ حقوق ہیں جن کی بناء پر ایک فرد ملک کے نظام حکومت میں حصہ لیتا ہے اور اپنے آپ کو سیاسی سرگرمیوں سے وابستہ کرتا ہے ان حقوق میں صرف وہ لوگ شامل ہوتے ہین جو کہ ریاست کے افراد ہوں غیر ملکی

1" The encyclopedia, Americana, P, 509, Volume, 23

افراد ان حقوق سے محروم ہوتے ہیں اور شہری بھی ان حقوق سے صرف جمہوری ممالک میں ہی آزادانہ طور پر مستفید ہو سکتے ہیں آمریت میں یہ حقوق نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں کیونکہ کوئی آمر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کو کبھی اپنی کرسی سے اترنا پڑے اور لوگوں کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے اس لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ کرسی سے چمٹا رہے اور اس کے لیے اسے افراد کے حقوق غصب کرنے پڑتے ہیں کیونکہ اگر وہ لوگوں کو ان کے حقوق دے گا تو وہ ان حقوق کو استعمال کر کے اسے حاکمیت سے محروم کر سکتے ہیں۔ سیاسی حقوق میں، حق رائے دہی، الیکشن میں حصہ لینے کا حق، سرکاری ملازمت کا حق اور حکومت پر تنقید کے حق حاصل ہیں۔ سیاسی حقوق کے حوالے سے پروفیسر حمید اے۔کے لکھتے ہیں:۔

"Political rights are not enjoyed by the individual in his capacity as a citizen and they intitle him in the legal expression and administration of the soverign power of the state. Political rights accordingly are the means by which an adult citizen is entitled by the constitution and laws of the state to participate in government of his country. It is only a democrated condition which confers these rights to the people."(1)

"سیاسی حقوق وہ ہیں جس سے ایک شخص کو آئینی اور قانونی طور پر یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لے سکے جمہوری طرز حکومت ہی لوگوں کو یہ حق دیتی ہے۔"

قانونی حقوق کے چند اہم پہلو

(1) اس حق کا کوئی Content بھی ہو۔یعنی کوئی چیز جس کے کرنے یا نہ کرنے سے اس حق کا تعلق ہو۔یعنی حق کا موضوع یا وہ عمل جو اس شخص پر فرض ہو جو حق دار شخص کے حق میں ادا کرنے کا ذمہ دار تھا۔

(2) اس کا حق کوئی موضوع بھی ہو یعنی وو چیز جس پر قابل ادائیگی بھی ہو۔

(3) اس حق کے ادا کرنے والا بھی کوئی ہو۔یعنی جس پر وہ قرض ہو۔وہ شخص یا اشخاص جن کے ذمہ اس حق کی ادائیگی لازم ہو۔

---

[1] حمید رائے،اے۔کے،"Principles of Political Science"ص،269،

(4) اس کے حقدار کا کوئی قانونی حق یا ملکیت ہو۔یعنی وہ امور یا واقعات جن سے یہ حق اس کے مالک کو ملا۔

(5) حق کا کوئی حقدار بھی ہو، وہ حق کسی شخص یا اشخاص میں مرتکز ہو، بالفاظ دیگر ان حقوق کا کوئی مالک بھی ہو وہ حق کسی غیر مخصوص اشخاص کے گروہ جیسے عوامیں بھی ہو سکتا ہے۔

اس طرح ایک قانونی حق کسی شخص کے لیے کسی شخص کے اوپر لازم ہوتا ہے اور کسی امر سے اس کا تعلق ہوتا ہے اوریہ کسی امر سے اس کا تعلق ہوتا ہے اوریہ کسی ملکیت یا حق پر مبنی ہوتا ہے۔یہ ذمہ دار شخص کو مجبور کرتا ہے کہ وہ حقدار کسی شخص کے لیے کوئی کام سر انجام دے یا سر انجام دینے سے باز رہے۔[1]

اسلامی اور مغربی قوانین میں مشترک انسانی حقوق کی فہرست

اسلامی قانون ایک کتابی شکل میں نازل ہوا بلکہ اس کی بنیادیں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں موجود ہیں اور انہی بنیادوں پر مسلمان ماہرین نے اسلامی قانون کو مرتب کیا ہے۔اسلام میں بنیادی حقوق کے موضوع پر مستقلاً قرآن و حدیث میں کوئی باب تو موجود نہیں۔لیکن بنیادی حقوق کو اگر قرآن و حدیث میں تلاش کریں تو یہ مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں اور انکے رہنما اصول موجود ہیں۔قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر انسانی جان و مال اور عزت کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے انسانیت کے تمام بنیادی حقوق کو قرآن میں جگہ جگہ بیان کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح حضورؐ کی ساری زندگی انسانی حقوق سے عبارت ہے اور "خطبہ حجۃ الوداع"بنیادی انسانی حقوق کا جامع چارٹر ہے۔چونکہ تمام انسانی حقوق کسی ایک مقام پر اکٹھے بیان نہیں ہوئے۔اس لیے مختلف علمائے کرام اور اسلامی قانون دانوں نے ان حقوق کی تعداد مختلف بیان کی ہے۔

شیخ غزالی جو عصر حاصل کے عظیم مفکر ہیں انہوں نے بنیادی حقوق بارہ بیان کئے ہیں۔[2]

"انسانی حقوق کا آفاقی ڈیکلریشن (Universal Islamic Declaration of Human Rights) میں انسانی حقوق کی تعدادبائیس بیان کی گئی ہے۔[3]

---

[1] بنیادی حقوق، صلاح الدین، ص، 41-42

[2] محمد الغزالی "حقوق الانسان بین تعالیم الاسلام واعلان الاھم المتحدہ"، ص،132، دارالکتب الاسلامیہ، قاہرہ، مصر،1994

[3] ابراہیم عبداللہ المرزوقی، "Human Rights in Islamic law"ص،515

اسی طرح مغربی ممالک کی دستاویزات میں بھی تقریبا یہی 23 بنیادی حقوق بیان کئے گئے ہیں۔ اقوام متحدہ کے عالمی منشور1948ء کے تین آرٹیکلز ہیں لیکن اگر بنیادی انسانی حقوق کی فہرست مرتب کی جائے تو وہ بھی بائیس بنتے ہیں۔ انسانی حقوق کے حوالے سے اسلامی اور مغربی قوانین میں جو حقوق پائے جاتے ہیں ان کی جامع فہرست حسب ذیل ہے۔

i. حق زندگی

ii. انسانی عظمت کا حق

iii. قانون کے سامنے انسان تصور کیے جانے کا حق

iv. مساوات کا حق

v. قانونی تحفظ میں برابری اور عدم تفریق کا حق

vi. شخصی آزادی کا حق

vii. تشدد، ظلم یا غیر انسانی، ذلت آمیز سلوک اور سزا سے بچاؤ

viii. جبری غلامی سے آزادی کا حق

ix. رازداری کا حق

x. آزادانہ سماعت کا حق

xi. فوجداری قانون کے بلاوجہ نفاذ سے تحفظ کا حق

xii. جرائم سے برات کا حق

xiii. سوچ و فکر کی آزادی

xiv. ضمیر کی آزادی کا حق

xv. مذہبی آزادی کا حق

xvi. بچوں کی آزادی کا حق

xvii. جلسہ و اجتماع کی آزادی کا حق

xviii. اظہار رائے کی آزادی کا حق

xix. تعلیم کی آزادی کا حق

xx. کام کی آزادی کا حق

xxi. خاندانی آزادی کا حق

xxii. جائیداد و ملکیت کا حق

حالیہ عرب بحران سے متاثرہ عرب ممالک کے آمروں نے اپنے عوام پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے اور عوام میں سے جس نے بھی اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی اس کو دبا دیا گیا۔انسانی حقوق کی تنظیموں کو ملک میں کام کرنے کی آزادانہ طور پر اجازت نہیں تھی۔انسانی حقوق کی تنظیموں کو حکومت کی مرضی سے اپنے کام کرنے پڑتے حکومت کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔عوامی حقوق کی یہ پامالی عوام برسوں سے برداشت کرتے آرہے تھے لیکن اپنے حقوق کے حصول کے لیے وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ایسے میں عرب بہار نے عوام میں یہ امید پیدا کی کہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔متاثرہ عرب ممالک میں انقلاب کی جہاں دیگر وجوہات ہیں وہاں ایک اہم وجہ انسانی حقوق کی پامالی ہے۔اب یہاں سے یہ وضاحت کی جا رہی ہے کہ کس طرح ان آمروں نے عوامی حقوق کو غصب کیے رکھا تھا۔

طویل آمریت کے سائے میں شام کے اندر بدترین انسانی حقوق کی پامالی ایسا عنصر رہا جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ملک میں عرب بہار کے ساتھ شروع ہونے والے مظاہروں کا ایک اساسی سبب و محرک بھی یہی عنصر تھا۔

جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ حافظ الاسد کے دور حکومت میں شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں کو پوری طرح کچل دیا گیا تھا۔ سماج میں خوف اور رعب کی فضا قائم کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے تھے جن میں 1982ء کا کریک ڈاؤن سب سے مشہور ہے جس کے دوران تقریباً" 20ہزار لوگوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔"[1]
جب حافظ الاسد کے بعد بشار الاسد نے اقتدار سنبھالا تو اس کے دور حکومت میں بھی دس سالوں میں انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیاں سامنے آئیں۔ جن میں سے بعض کے بارے یہاں بحث کی جائے گی۔

حکومت کی جانب سے اصلاحات کے وعدے:

جب جولائی سنہ 2000ء میں بشار الاسد نے بطور صدر حلف اٹھایا تو اس کے چندماہ بعد نومبر میں دمشق کی مزہ نامی جیل بند کر دی گئی تھی اور درجنوں سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ تبدیلی زیادہ دیر نہیں چل سکی، اس لیے اگلے سال اگست میں ملک کے تمام شہروں سے ان شخصیات کو دوبارہ گرفتار کیا جانے لگا جو شام میں انسانی حقوق کی بہتری اور سیاسی فضا کی آزادی کی بات کرتے تھے۔ ملک میں حکومت پر ہلکی سی تنقید کی سزا بھی سخت سے سخت دی جاتی تھی۔"ایک وقت میں جب باہر سے آنے والے سیاح دمشق کے پر تعیش ہوٹلوں میں لطف اندوز ہو رہے ہوتے تھے

[1] محارب محمود، اسرائیل والتغیرات الجیو الاستراتیجیہ (بیروت، دار الکتب العلمیہ، 2013ء)، 541۔

عین اسی وقت کوئی شامی باشندہ اس لیے گرفتار کر کے جیل میں بند کیا جا رہا ہوتا تھا کہ اس نے حکومتی پالیسی کی مخالفت میں کوئی بلاگ لکھا ہے یا کہیں مجمعے میں حکومت سے ناراضی کا اظہار کیا ہے"۔[1] شام میں فیس بک، یوٹیوب اور بلاگر ویب سائٹس پر پابندی عائد تھی۔

ستمبر 2001ء میں حکومت کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کے متعلق ایک قانون پاس کیا گیا جس کے مطابق اسے یہ کلی اختیار حاصل ہو گیا تھا کہ وہ جب چاہے اور جس کتاب یا اخبار، مجلے کی اشاعت کو بند کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ شام میں انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں پر بھی پابندی عائد تھی۔[2]

کرد قوم شام کی آبادی کا 10 فیصد تھی اور ایک نمایاں اقلیت کے طور پہ دیکھی جاتی تھی لیکن یہ اقلیت اپنے بنیادی حقوق سے بھی محروم تھی۔ مثال کے طور پہ مدارس میں کردی زبان پڑھانے سے منع کیا جاتا تھا اور اس قوم کو ان کے تہواروں پر بھی چھٹی نہیں دی جاتی تھی، حتی کہ ان کی عید نوروز پر بھی نہیں۔ 2004ء میں کردوں نے آمریت میں طویل جبر اور مسلسل نظر انداز کیے جانے کے خلاف احتجاج کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے دبا دیا گیا تھا۔ کردوں کی اہم نمائندہ شخصیات کو قتل وغارت پر اکسانے کے جرم میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا، یا بعض کو ماورائے عدالت قتل کر دیا گیا۔ کردوں کو حکومت کی جانب سے عمومی طور پہ قومی وحدت کو توڑنے کے الزام کا سامنا رہتا تھا۔ ملک میں 3 لاکھ کرد ایسے تھے جنہیں ملک کے شناختی کارڈ اور شہریت سے محروم رکھا گیا تھا۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جنہیں 1960ء میں شہریت سے محروم کیا گیا، بعض ان کی اولادیں تھیں، جبکہ کچھ وہ تھے جنہیں خلاف ورزیوں کی بنا پر حافظ الاسد اور بشار الاسد کی حکومتوں نے شہریت سے محروم کر دیا تھا۔[3]

حکومتی ریفامز کے وعدے

بشار الاسد نے قوم سے متعدد بار یہ وعدے کیے کہ وہ ملک میں سیاسی مشارکت کو یقینی بنائے گا۔ 2005ء میں ہسپانوی صحافیوں سے بات کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ عنقریب شام میں آزاد سیاسی فضا کے لیے راہ ہموار کی جائے گی۔ اسی سال جنوری میں اس نے اپنی جماعت حزب البعث کو یہ حکمنانہ جاری کیا تھا کہ غیر نسل پرست اور غیر دینی جماعتوں کے قیام کی اجازت کے لیے قانون بنایا جائے۔ مگر سرکاری سطح پر اب تک کوئی ایسا قانون جاری نہیں کیا گیا۔

عرب بہار سے قبل بشار الاسد کے دس سالہ عہد حکومت میں شہریوں کے لیے شدید مشکلات رہیں اور اس کے بعد بھی صورتحال میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہیومن رائٹس واچ سے تعلق رکھنے والے ایک انسانی حقوق کے کارکن نے

---

[1] سامح العائد، الزاوادین، السیطرہ الغامضۃ (بیروت، دارالریس، 2011ء)، 66۔

[2] سامح العائد، الزاوادین، السیطرہ الغامضۃ (بیروت، دارالریس، 2011ء)، 111۔

[3] سمیر یوسف، الموقف السوری من الوجود السیاسی (بیروت، مکتبہ الحیاۃ، 2012ء) 134۔

اپنے انٹرویو میں بتایا کہ "حافظ الاسد کے دور میں بغیر کسی محاکمے اور مقدمے کے جیل میں سڑنا پڑتا تھا، اب اگرچہ مقدمہ چلتا ہے لیکن جیل میں پھر بھی رہنا پڑتا ہے"۔[1] بشار الاسد نے ملک میں ہونے والی زیادتیوں پر متعدد بار تبصرہ کیا اور یہ تسلیم کیا کہ انسانی حقوق کے حوالے تحفظات موجود ہیں لیکن ہم جلد ہی نظام میں تبدیلی لائیں گے۔ یہ واضح نہیں اس طرح کے اعلانات کے بعد بھی کوئی عملی قدم کیوں نہ اٹھایا جاسکا۔

جب آخری دفعہ 2007ء کے انتخابات میں بشار الاسد نے کامیابی حاصل کی تو اپنے خطاب میں اس نے کہا کہ "ملک میں کئی حوالوں سے سیاسی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے لیکن یہ مختلف وجوہات کی وجہ سے۔ نہیں ہو سکا، بالخصوص ہمارے پڑوس میں بدامنی نے مسائل پیدا کیے ہیں اور اصلاحات کے راستے میں رکاوٹ کا باعث بنے ہیں۔ ایسے میں ہماری اولین ترجیح صرف یہ رہی کہ ملک کے استحکام اور امن کو متأثر نہ ہونے دیا جائے"۔[2]

نائن الیون کے بعد کے منظر نامے اور عراق میں امریکی حملے کے بعد سے پیدا ہونے والی صورتحال کو ہمیشہ شام میں سیاسی تبدیلیوں اور انسانی حقوق کے مسئلے میں اصلاحات کے لیے رکاوٹ کے طور پر پیش کیا گیا۔

کتب اور اخبارات پر پابندی:

1963ء میں جب حزب البعث اقتدار میں آئی تو اس نے ملک سے جاری ہونے والے تمام اخبارات کو بند کر دیا، صرف تین کو اجازت تھی کہ وہ اشاعت جاری رکھ سکتے ہیں جو حزب البعث کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ تین اخبارات یہ تھے: البعث، الثوئر اور تشرین۔[3] جب 2000ء میں بشار الاسد صدر کے عہدے پر فائز ہوا تو اس نے حکومتی سطح پر یہ پابندی اٹھالی اور اجازت دیدی کہ آزادانہ طور پہ شہری اخبارات ومجلے جاری کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکا۔ اگلے سال حکومت نے ایک قانون پاس کیا جس کے مطابق حکومت پر تنقید کو غیر قانونی اور قابل گرفت کہا گیا۔ یہ بتایا گیا کہ خلاف ورزی کرنے والے کو بھاری جرمانوں اور جیل کی سزا کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ یہ قانون صرف اخبارات ومجلات پر لاگو نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر قسم کی کتب پر بھی لاگو کیا گیا تھا۔ اسکے بعد ملک بھر میں ایک آپریشن کیا گیا جس میں ایسے مواد کو ضبط کر لیا گیا تھا۔

جب حکومت کی جانب سے پہلے آزادی اظہار پر ماضی کی لگی ہوئی پابندی اٹھائی گئی تو کئی اہم مجلے اور اخبارات سامنے آئے جن سے حکومت کو یہ اندازہ ہوا کہ اگر انہیں آزادی دی گئی اور حکومتی پالیسیوں پر آزادانہ تبصروں پر کوئی ٹوک نہیں لگی تو حکومت کو مشکلات ہونگی۔ عوامی شعور بیدار ہو گا اور پہلے سے موجود بے چینی تحریک کی صورت اختیار

---

[1] سابقہ مرجع، 126۔

[2] محمد المحجذوب، دراسات فی السیاسہ والاحزاب (بیروت، دارابن خلدون، 2017ء) 48۔

[3] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 136۔

کر سکتی ہے۔ لہذا چند ماہ بعد انہیں کڑے ضوابط کا پابند بنا دیا گیا۔ ان اخبارات میں سے ایک 'الدومری' نام کا بھی تھا جسے علی فرزات [1] نے جاری کیا تھا۔ یہ شروع میں ہی اتنا مقبول ہوا کہ اس کی یومیہ 75 ہزار کاپیاں فروخت ہونے لگی تھیں۔ اس کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے حکومت نے 2003ء میں اسے بند کر دیا تھا۔ یہ آزادی اظہار پر قدغن ہے جو ایک شہری کا بنیادی حق سمجھا جاتا ہے۔

2005ء میں شام کے وزیر اطلاعات نزار مھیوب نے ہیومن رائٹس واچ سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ مطبوعات اور اشاعت کے معلق جدید قانون سازی کی جائے گی۔ اس کے بعد 2007ء میں صدر بشار الاسد نے بھی خطاب میں کہا تھا کہ میں نے میڈیا اور مطبوعات کے قانون کے حوالے سے سنا ہے کہ بہت سارے لوگ اس سے ناخوش ہیں۔ ہماری وزارت اطلاعات نے بھی اس تشویش کو سامنے رکھتے ہوئے قانون میں ترمیم کا عندیہ دیا تھا اور آئندہ وقت میں جلد ہی یہ امکان ہے کہ جماعت کے اندر دوبارہ اس مسئلے پر بات ہو گی اور کچھ ترامیم منظور کی جائیں گی۔ [2]

لیکن 2010ء تک کوئی قانون سازی نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ الٹا مزید پابندیاں متعارف کرا دی گئیں۔ اور یہ قانون مطبوعات و اخبارات سے گزرتا ہوا انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا میں بھی حاوی ہو گیا۔ سوشل میڈیا ویب سائٹس کو بند کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسے شخص کا اقدام ہے جو مغربی ملک میں تعلیم حاصل کر کے آیا تھا اور صدارت کا حلف اٹھانے سے قبل اس نے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ ماضی کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ایک نئے سماج کی تشکیل کرے گا جس میں انسانی حقوق کے حوالے سے بہتریاں متعارف کرائی جائیں گی۔

شام کی حکومت نے آزادی اظہار کا انسانی حق استعمال کرنے والے درجنوں صحافیوں اور مفکرین کو عتاب کا نشانہ بنایا۔ حکومت پر صدر پر تنقید ایک ایسا جرم متصور کیا گیا جس کی قطعا اجازت نہیں تھی۔ ایسا کرنے والے کو بغیر عدالت اور قانونی معاونت کے سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ 2009ء میں شام کو دنیا کی ان بدترین تین ممالک میں شامل کیا گیا تھا جہاں صحافت اور آزادی اظہار پر قبیح قدغنیں عائد ہیں۔ 2007ء اور 8 کے درمیان ملک میں 153 صحافیوں کو عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ ان میں میں دس ایسے تھے جو مشہور و بڑی شخصیات شمار کیے جاتے تھے۔ عدالت نے محمد الحسینی کو کو تین سال کی سزا اس لیے سنائی کہ کسی حکومتی ہمدرد شخص نے انہیں حکومت پر تنقید کرتے ہوئے سنا تھا۔ اس وقت ان کی عمر 67 برس تھی۔ [3]

---

[1] عرب کارٹونسٹ ایسوسی ایشن کا صدر

[2] سامی الحداد، مبادرہ العریضہ الشعبیہ (بیروت، دارالاندلس، 2013ء) 98۔

[3] سابقہ مرجع، 151۔

سیاسی قیدی اور جیلیں:

اس کے علاوہ ملک میں جیلوں کی حالت بھی انتہائی مخدوش تھی۔ حافظ الاسد نے اپنے دور میں دو ایسی جیلیں قائم کی تھی جن کے اندر سیاسی قیدیوں کو ڈالا جاتا تھا اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے۔ ان کے نام المزہ اور تدمر [1] ہیں۔ تدمر کی جیل میں 1980ء کے سال ایک ہزار شہریوں کو تشدد کے ذریعے مار دیا گیا تھا۔ ان جیلوں کو براہ راست حافظ الاسد کے بھائی اور فوجی کمان کے سربراہ رفعت الاسد کی نگرانی میں چلایا جاتا تھا۔ تدمر کی جیل میں معروف شامی شاعر فرج بیر قدار جنہوں نے پانچ سال وہاں گزارے تھے اس جیل کو موت اور پاگل پن کی جہنم سے تعبیر کیا تھا۔ جب بشار الاسد کی حکومت آئی تو المزہ نامی جیل کو بند کر دیا گیا اور اور تدمر کی جیل سے 500 سیاسی قیدیوں کو عام جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ بظاہر اس بات کی علامت تھی کہ اب ماضی کی طرح جیلوں میں تشدد نہیں ہو گا اور ماورائے عدالت و قانون کسی کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ مگر شامی پولیس اور فوج قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھتے ہیں۔ قیدیوں کا جیل سے باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہنے دیا جاتا اور نہ ان کی حالت کے متعلق ان کے رشتہ داروں کو کوئی اطلاع دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پہ 2008ء میں دیر الزور سے حکومت نے 13 نوجوانوں کو گرفتار کیا تھا۔ ان پر یہ الزام تھا کا ان کا مذہبی سیاسی جماعتوں کے عناصر کے ساتھ تعلق ہے۔ ان کی گرفتاری کے بعد نہ ان کے رشتہ داروں کو علم ہوا اور نہ باہر کی دنیا میں سے کوئی یہ کھوج لگا پایا انہیں کہاں غائب کیا گیا ہے۔ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ محمد امین القوا ایک صحافی تھے انہیں جنوری 2009ء میں گرفتار کیا گیا۔ ان کے رشتہ داروں نے ان کا چہرہ تب دیکھا جب انہیں مارنے کے بعد دفن کیا جا رہا تھا۔ [2]

ہیومن رائٹس واچ نے اپنی سالانہ رپوٹس میں یہ دعوی کیا تھا کہ جیلوں میں شہریوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ 2004ء میں کرد قوم سے تعلق رکھنے والے 30 نوجوانوں نے ہیومن راٹس واچ سے بات کی تھی اور یہ کہا تھا کہ جب انہیں گرفتار کیا گیا تھا تو انہیں مسلسل تشدد کا سامنا رہا۔ ان کے مطابق جیل میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کو شک کی بنیاد پر گرفتار کیا جاتا ہے اور محض شک کی بنیاد پر انہیں بعض اوقات جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ [3]

---

[1] Genral census of population and housing, Syria central bureau of statistics, 2004.

[2] دیب کمال، تاریخ سوریا المعاصر، 19۔

[3] ہیومن رائٹس واچ، 2004، سیریا، www.humanrightswatch.syria2004

اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی تنظیم نے کئی بار شام کی جیلوں میں ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف بیان دیا اور اس کی سخت مذمت کی۔ 2002ء میں شامی الاصل ایک کینیڈین شہری ماہر عرار[1] کو جیل میں بند کیا گیا۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے ملک میں رہتے ہوئے شامی حکومت پر تنقید کی ہے۔ جب انہیں رہائی ملی تو کینیڈا کی حکومت نے تحقیقی رپورٹ جاری کی تھی جس میں یہ کہا گیا تھا ماہر عرار بہت زیادہ تشدد کیا گیا تھا۔ دمشق کے مضافات میں واقع ایک جیل صیدیانا میں 2008ء میں قیدیوں اور پولیس کے درمیان جھڑپ ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ غیر انسانی سلوک پر قیدیوں کا احتجاج تھا۔ اس واقعے کے دوران پولیس نے قیدیوں پر فائر کھول دیا تھا جس میں کئی قیدی جان سے مارے گئے تھے۔ اس واقعے کے بعد کسی کو تفتیش کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور غیر ملکی میڈیا کو بھی اندر جانے یا کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ اندر کیا ہوا اور کتنے لوگ مارے گئے اس کا کسی کو کچھ علم نہیں ہو سکا۔ اس واقعے کے بعد جیل میں قید کیے گئے افراد کے رشتے داروں نے ان سے ملنے کی درخواست کی تھی تاکہ انہیں علم ہو سکے کہ وہ کس حال میں، کہیں وہ فائرنگ سے متأثر تو نہیں ہوئے یا مارے تو نہیں گئے۔ 2009ء کے آخر تک 43 قیدیوں کے بارے میں علم نہیں سکا تھا۔ نہ ان کے رشتے داروں کو اندر جانے کی اجازت مل سکی اور نہ کوئی معلومات فراہم کی گئیں۔[2]

اقلیتوں پر جبر:

کرد ایک ایسی قوم اور اقلیت ہے جو خطے میں سب سے زیادہ کمزور سمجھی جاتی ہے۔ شام میں کل آبادی کا دس فیصد کردوں پر مشتمل ہے لیکن ملک میں ان کی حالت انتہائی تشویش ناک رہی ہے۔ سب سے پہلے 1962ء میں حکومتی جماعت حزب البعث نے ملک کے اندر موجود کردوں میں بیس فیصد کو ان کی شہریت سے محروم کر دیا تھا۔ ان کی تعداد 17 لاکھ کے قریب ہے لیکن یہ طبقہ ہمیشہ ظلم کا شکار رہا۔ انہیں ان کی شناخت چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا رہا۔ کرد قوم ملک کے اندر اپنی تاریخی ثقافتی شناخت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔ لیکن عراق کی طرح شام میں بھی مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے سے ان پر یہ دباؤ رہا کہ وہ اپنی امتیازی و منفرد شناخت چھوڑ دیں۔ جبکہ کردوں کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ ہر طبقہ اپنی تاریخی شناخت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہ اس کی پہچان ہوتی ہے۔ ہم کرد ہیں اور شامی بھی ہیں۔ بطور ایک ممتاز ثقافتی پس منظر رکھنے والے طبقے کے ہمارا یہ حق ہے کہ ہم اس کو محفوظ رکھیں اور اس پر فخر کا اظہار کریں۔[3] لیکن حکومتی سطح میں ان کے اس بنیادی انسانی حقوق کا کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ ان کو معاشی طور پہ

---

[1] Apologizing to maher arar A Beginning-note an end" Jurist.org.21.01-2007

[2] رضوان زیادہ، التحول الدیمقراطی فی سوریہ، 35۔

[3] سابقہ مرجع، 144۔

کمزور رکھا گیا۔ ملکی معیشت میں ان کے حصے وشراکت پر پابندی رہی اور تعلیم وصحت کے شعبوں میں بھی انہیں نظر انداز کیا جاتا رہاہے۔ تاہم کرد کبھی بھی اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ شام کے اندر کردوں پر کسی قسم کے اجتماعات منعقد کرنے پر بھی پابندی عائد تھیے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی عید نوروز پر بھی کو تہوار کا جلسہ یا یا اجتماع منعقد نہیں کرسکتے تھے۔2004ء میں انہوں نے اپنے حقوق کے لیے دنیا میں آواز اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ملک میں چھوٹے پیمانے پر قائم کیے گئے احتجاج تھے جنہیں بے دردی کے ساتھ کچل دیا گیا تھا۔ ایک مظاہرے پر پولیس کی فائرنگ کی وجہ سے 36 لوگ مارے گئے تھے اور 161 افراد زخمی ہوئے۔ تب ان کے خلاف ایک آپریشن ہوا جس میں 2000 افراد کو پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ کردوں کی اہم سیاسی ونمائندہ شخصیات کو ہمیشہ جیل میں رکھا جاتا رہاہے۔ ان پر یہ الزام لگایا جاتا کہ وہ قومی وحدت کے شعور کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور فتنے کا سبب بنتے ہیں۔[1]

بشار الاسد کو وراثت میں جو ملک اور نظام ملے تھے ان میں انسانی حقوق کی بدترین پامالیوں کا احساس جاگزیں تھا اور اس نظام میں کسی بھی سطح پر کوئی ایسا ادارہ یا کمیشن موجود نہیں جو ان پامالیوں پر بات کرسکے۔ یا یہ کہ شکایت تک درج کراسکے۔ ملک میں ہمیشہ انسانی حقوق کی تنظیموں اور این جی اوز پر پابندی عائد رہی۔ ایسے میں عام شہریوں کے لیے اپنے بنیادی انسانی حقوق کے مطالبے یا اس پر بات تک کرنے کے لیے کوئی فورم دستیاب نہیں تھا۔ ان کے لیے یہ لازم تھا کہ بس وہ خاموش رہیں اور نظام جس سیدھ میں چلنے کا کہے اسی سیدھ چلتے رہنا چاہیے۔ ورنہ اس کا نتیجہ بھیانک اور انتہائی غیر متوقع ہوسکتا ہے۔ حقوق کی ان پامالیوں اور مسائل کی وجہ سے 2005ء سے 2007ء کے درمیانی عرصے میں ملک کو تنہائی کا سامنا بھی رہا۔ مغربی ممالک نے پابندیاں عائد کیے رکھیں اور شام معاشی طور پہ کمزور ہوگیا۔ لیکن اس عرصے کے بعد حالات نارمل ہونے لگے تو حکومتی حلقے نے مزید ظلم ڈھانے شروع کردیے۔ اس میں پہلے سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مقتدر حلقے کا خیال تھا کہ اگر عالمی تنہائی کے باوجود اس نے لچک نہیں دکھائی تھی تو اب جبکہ وہ مرحلہ ختم ہوچکا ہے اور ان کے روابط دوبارہ بحال ہوگئے ہیں تو وہ کیونکر اصلاحات کی جانب بڑھیں۔[2] اس مرحلے کے بعد حکومت کا اعتماد بڑھ گیا تھا اور اس نے عوام کو ناہمواریت کی جانب دھکیل دیا۔

شام میں حزب اختلاف کا کردار ادا کرنا شامی سیاست کا سب سے مشکل ترین پہلو ہے۔ کیونکہ حکومت کی مشینری نہیں چاہتی کہ کوئی بھی حکومت کے خلاف عوام کو ابھارے۔ اقوام متحدہ کی ہیومن رائٹ کی رپورٹ کے مطابق:۔

---

[1]عبد الفضل، العرب والتجربہ الآسویہ، 94۔

[2]سابقہ مرجع، 166۔

"شامی حکومت ان سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو بغیر وارنٹ کی گرفتاری کر رہی ہے جو اپوزیشن کا کردار ادا کر رہے ہیں۔شامی حزب اختلاف کی جماعتیں اور کرد سیاسی جماعتوں کے کارکن شامل ہیں ایسے بہت سارے رہنما ہیں جن کو حکومتی سیکیورٹی ایجنسیوں نے گرفتار کیا ہے۔اور گرفتاریوں کا یہ عمل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید بڑھتا جا رہا ہے۔"

ڈاکٹر کمال (جو کہ فزکس کا ماہر ہے اور اپنی سیاسی جماعت بنائی تھی ڈیموکریٹک لبرل گید رنگ کے نام سے) پچھلے پندرہ سالوں سے ملک میں قانونی ریفارمز کے لیے جدوجہد میں مصروف تھا۔حکومت نے پچھلے کئی مہینوں سے اس کو گرفتار کیا ہے بناء کسی جرم کے اور مسلسل قید و بند میں ہیں۔"[1]

آزادی اظہار رائے کا حق

شامی پریس کا قانون حکومت کو مکمل کنٹرول دیتا ہے کہ وہ تمام پبلیکیشنز کو اپنے زیر سایہ رکھے اور ان کی اجازت کے بغیر کوئی بھی خبر یا اخبار شائع نہیں ہو سکتی۔حکومت نے اپنی کنٹرول کو وسعت دے کر انٹر نیٹ آن لائن ویب سائٹس جن میں یوٹیوب، فیس بک اور گوگل شامل تھے ان سب کو بھی حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔اور سیاسی جماعتوں کے ویب سائٹس کو بھی حکومتی کنٹرول حاصل تھا۔جنوری 2010 کو حکومت نے کالم نگار کریم (جو کہ آن لائن یوتھ فورمAkhawia.net کے نام سے چلا رہا تھا)اور حکومت کی غلط پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔گرفتار کیا اور تین سالوں کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔اس کے ساتھ ساتھ بہت سارے انسانی حقوق کے کارکن اور سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔شامی ہیومن رائٹس کے تمام گروپوں کو حکومت نے لائسنس نہیں دیا ہے ان کے بار بار درخواستوں کے بغیر تاکہ حکومت جب چاہے ان کے خلاف کاروائی کر سکے۔[2]

لاپتہ اور تشدد

شام کی مختلف سیکیورٹی سروسز نے لوگوں کو حراست میں رکھنا معمول بنایا ہوا ہے بغیر کسی وارنٹ گرفتاری کے ہفتوں اور مہینوں تک ان کا ٹھکانہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا۔انہیں زبردستی چھپاتے رہتے ہیں۔نبیل کی تقدیر بھی نامعلوم ہے جس کو 2008میں اسلام پسندوں سے خفیہ تعلقات کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا تا حال اس کا ٹھکانہ اور مستقبل کسی کو معلوم نہیں۔اسی طرح کرد علیحدگی پسند تحریک سے تعلقات کے شبہ میں گرفتار کئے گئے بیس کردوں کی قسمت کے بارے میں بھی

---

[1] Human Rights in Syria, UN World Report, 2011, Syria

[2] ایضاً

خاموشی ہے۔ ہیومن رائٹس واچ نے سیکیورٹی فورسز اور حکومتی ایجنسیز کی طرف سے برے سلوک اور تشدد کی متعدد رپورٹ موصول کی۔ اقوام متحدہ کی کمیٹی نے مئی 2010 میں اپنی رپورٹ میں کہا کہ:۔ "جو الزامات تشدد کے حوالے سے شامی سیکیورٹی فورسز پر لگائے جاتے ہیں ہمیں بہت فکر لاحق ہو رہی ہے۔ قیدیوں کے حوالے سے اس رپورٹ میں کہا گیا کہ دوران قید بہت سارے قیدی ہلاک ہو گئے ہیں اور ان کے جسم پر تشدد کے نشانات واضح تھے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ حکومت لوگوں کے لاپتہ کرنے میں سیکیورٹی ایجنسیوں کے مداخلت نہ ہونے کا کوئی بھی ثبوت فراہم نہ کر سکی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شامی اخوان المسلمون کے ہزاروں کارکنوں کو لاپتہ کرنے میں حکومت ملوث ہے۔[1]

عورتوں اور بچیوں کے حقوق

شامی قانون مردوں اور عورتوں کو ایک جیسے حقوق فراہم کرتا ہے اور بہت ساری عورتیں عملی طور پر اپنے فرائض بھی سر انجام دیتی ہیں۔ لیکن جب بات عورتوں کے ذاتی حقوق پر آتی ہے تو یہ قانون عورتوں اور لڑکیوں کے درمیان تفریق پیدا کرتا ہے۔ جنوری 2010 میں شام میں عورتوں کی ڈرائیونگ پر سات سال قید کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ دفاتر اور فیکٹریوں میں کام کرنے والی عورتوں کی تحفظ کے لیے کوئی قابل قدر قانون نہیں بنایا گیا ہے۔[2]

لاقانونیت کی حکمرانی:

حافظ الاسد کے دور میں 70 اور 80 کی دہائی میں انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیاں ہوئی تھی۔ یہ دو عشرے ملک میں لاقانونیت اور استحصال کے سمجھے جاتے ہیں۔ اس عرصے میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو مصائب جھیلنے پڑے تھے۔ وہ چاہے اخوان المسلمون سے ربط رکھنے والے لوگ ہوں، سوشلسٹ ہوں، لبرل ہوں، عراقی ہوں، جمال عبدالناصر کے ہمنوا ہوں، یا پھر بعض حلقوں کے فلسطینی ہی کیوں نہ ہوں۔ ان تمام طبقات کو سخت اذیتیں جھیلنی پڑی تھیں۔ ان دو دہائیوں میں سینکڑوں لوگوں کو جبری گمشدگیوں کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق ان دو دہائیوں کے دوران غائب کیے جانے والوں کی تعداد تقریباً 17 ہزار کے قریب تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔

---

[1] Human Rights in Syria, UN World Report, 2011, Syria

[2] Syrian Human Rights 2012

جولائی 1980ء میں تدمر کی جیل میں قید اخوان المسلمین سے تعلق کے شبہے میں گرفتار ایک ہزار افراد کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اخوان المسلمون کے عناصر ملک میں حافظ الاسد کے خلاف کھڑے ہوئے اور وہ اسے ہٹانا چاہتے تھے۔ اس سے 2 سال بعد 1982ء میں حماۃ شہر میں ایک جھڑپ کے دوران لگ بھگ 10 ہزار لوگوں کو سر عام گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی اخوان سے ہمدردی رکھنے والے لوگ تھے۔[1]

انسانی حقوق کی ان شدید خلاف ورزیوں کی وجہ سے عوام کے اندر ہمیشہ حکومت کے خلاف نفرت اور بے چینی موجود تھی۔ وہ اس نظام میں تبدیلی کے خواہشمند تھے۔ جب عرب بہار شروع ہوئی تو انہیں بھی یہ امید پیدا ہوئی کہ وہ ملک میں اصلاحات کے لیے دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ مگر حکومت کی انسانیت کے خلاف ظلم کی کوئی انتہاء نہیں تھی۔

خانہ جنگی کے دوران انسانی حقوق کی پامالی:

سرزمین شام تمام مذاہب کے ماننے والوں کیلئے قابلِ احترام ہے۔ تابناک تاریخ کے حامل شام میں گزشتہ دس برسوں سے جاری خانہ جنگی میں لگ بھگ پانچ لاکھ شامی شہری مارے جا چکے ہیں جبکہ دس لاکھ سے زائد زخمیوں کی تعداد ہے، شامی باشندوں کی کثیر تعداد یورپ جانے کی کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے، گزشتہ برسوں ترکی کے ساحل سمندر پر ایلان نامی کم سن شامی بچے کی ملنے والی نعش نے انسانیت کا درد رکھنے والے ہر انسان کو خون کے آنسو رُلا دیا تھا، شامی حکومت کے مبینہ کیمیائی حملے کے رد عمل میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کا شام پر مشترکہ فضائی حملہ بھی بھیانک تھا۔

آج ایک طرف کچھ عالمی ممالک بشار الاسد کی حکومت کو بچانے کیلئے مہلک اسلحہ اور فضائی طاقت فراہم کر رہے ہیں تو دوسری طرف باغیوں کو بھی جدید تباہ کن اسلحہ دیگر ممالک سے وافر مقدار میں دستیاب ہے۔ ''بشار الاسد حکومت کو تاحال قائم رکھنے میں روس اور ایران کا کلیدی کردار ہے، روسی فضائیہ نہ صرف باغیوں پر تابڑ توڑ حملے کر رہی ہے بلکہ روس کی طرف سے تمام تر عالمی مخالفت کے باوجود مہلک ہتھیاروں کی فراہمی بھی جاری ہے، روس شام میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کے خلاف پیش کی جانے والی تمام قراردادوں کو اقوام متحدہ میں ویٹو بھی کرتا رہا ہے''۔[2]

---

[1] islamists religion and revolution in Syria, (Harmoon Center for Contemporary Studies, 2014), 14.

[2] عمر اسکندر، شوریا ازمۃ نظام وثورۃ شعب (بیروت، مرکز امیہ للبحوث والدراسات، 2014ء)، 56۔

روس کی مداخلت کی بڑی وجہ شام کی بندر گاہ طرطوس میں واقع خطے میں روس کا واحد بحری اڈہ ہے، اسی طرح لتاقیہ میں روس کا فضائی اڈہ قائم ہے۔ روس کو یہ خوف لاحق ہے کہ بشار الاسد کی حکومت گرنے کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ کی علاقائی سیاست میں اس کا کردار صفر ہو جائے گا۔

ایران کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ عالمی تنہائی کی شکار بشار الاسد حکومت کی بقا کا راز ایران کی جانب سے اربوں ڈالر کی امداد، اسلحہ اور تیل کی فراہمی ہے۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق ایران کا حمایت یافتہ لبنانی عسکریت پسند گروہ حزب اللہ اور ایرانی جنگجو شامی افواج کے شانہ بشانہ باغیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ روس اور ایران کی شام میں موجودگی نے ان کے مخالفین امریکہ اور سعودی عرب کو بھی سرگرم عمل کر دیا۔ سعودی عرب کا موقف ہے کہ صدر بشار الاسد کے ہوتے ہوئے شام کا بحران کسی صورت حل نہیں ہو سکتا، اس لئے فوری طور پر شام کی موجودہ حکومت کا خاتمہ کر کے اقتدار عبوری حکومت کے حوالے کیا جائے۔ مبصرین کے مطابق شام میں برسرپیکار باغی گروہوں کو خلیجی ممالک کی مالی اور عسکری حمایت حاصل ہے۔ امریکہ سعودی عرب کے موقف کی تائید کرتا ہے کہ بشار الاسد کی حکومت کا خاتمہ کیا جائے۔ امریکہ بھی اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر شام میں فضائی کارروائیاں کرتا رہا، اس کا جواز داعش اور دیگر شدت پسند گروہوں کا زور توڑنا بتایا جاتا رہا۔[1]

ترکی شامی صدر کو لاکھوں بے گناہ شہریوں کی ہلاکت کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے، جہاں ایک طرف شامی مہاجرین پناہ کی تلاش میں ترکی کے راستے یورپ کا رخ کرتے ہیں وہیں شام میں لڑنے والے غیر ملکی جنگجوؤں کی گزرگاہ ترکی ہے، ترک حکومت نے امریکہ اور اتحادیوں کو شام میں فضائی حملے کرنے کیلئے اپنے اڈے استعمال کرنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ "ایک اور ہمسایہ اسرائیل شامی حکومت کی طرف سے فلسطینیوں کی جدوجہد آزادی کی حمایت کی وجہ سے خائف ہے، اسرائیل اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے سمجھتا ہے کہ شام کو عدم استحکام کا شکار رہنے دیا جائے، محاذِ جنگ سے ایسی اطلاعات بھی موصول ہوتی رہی ہیں کہ اسرائیلی طیارے بھی شام پر بمباری کرنے میں ملوث ہیں"۔[2]

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ شام کے بحران کو ہمسایہ ممالک اور عالمی طاقتوں کی شمولیت نے پیچیدہ بنا دیا ہے، کوئی ایک متحارب فریق بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں، انا کی اس جنگ کا ایندھن شام کے معصوم شہریوں کو بننا پڑ رہا ہے۔ موت کے منہ سے بچ کر یورپ کا رخ کرنے والے نفرت انگیز سلوک کا شکار ہو رہے ہیں۔

شام میں جاری جنگ کی بڑی وجہ اسلحہ کی صنعت بھی ہے، خانہ جنگی کے نتیجے میں شام ہتھیاروں کی سب سے بڑی منڈی بن چکا ہے جہاں دنیا بھر کا تیار کردہ اسلحہ استعمال ہو رہا ہے، مختلف عالمی طاقتیں اپنے تباہ کن ہتھیاروں کی

---

[1] عبد الفضل، العرب والتجربہ الآسویہ، 56۔

[2] سابقہ مرجع، 66۔

آزمائش شام کی مقدس سرزمین میں کر رہی ہیں۔ دوسری طرف اقوام متحدہ، یورپی یونین اور پاکستان سمیت عالمی برادری کا موقف ہے کہ شام کے بحران کا عسکری حل ممکن نہیں اور تمام فریقین صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے عوام کو درپیش مشکلات کا احساس کریں۔ (1)

---

[1]عبدالفضل، العرب والتجربہ الآسویہ، 71۔

فصل چہارم

اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم

گریٹر اسرائیل کا نظریہ:

صہیونی گروہ اور اس کے ہمنوا مغربی طبقات عظیم تر اسرائیل کے قیام کے لیے ایک عرصے سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ 'ارض موعود' کی جانب واپسی خدائے تعالی کی منشا ہے اور اس کا قیام عملا یقینی ہو کر رہے گا۔ یہ ارض موعود نیل سے فرات تک خیال کی جاتی ہے۔ اور یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ تورات میں اللہ تعالی نے ان سے یہ وعدہ کیا کہ وہ ایک دن واپس اپنی سرزمین پر آئیں گے یہاں ان کی حکومت قائم ہو گی۔ صہیونی نظریے کے مطابق اس ارض موعود میں مصر، شام، لبنان، عراق اور فلسطین کی سرزمین شامل ہوتی ہے۔ یہ ستائیس ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلی ہے[1] جس پر بالآخر یہودی حکومت کریں گے۔

شام میں بدامنی کے مقاصد:

اس مزعومہ پیشین گوئی کے تحت اسرائیل اور دنیا کے یہودی کوئی بھی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جس کے ذریعے ان کے خواب کی تکمیل ممکن ہو سکتی ہو۔ "ارض موعود پر حکومت کے قیام اور اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے سب سے پہلے ان ملکوں کے امن کو متأثر کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ براہ راست جنگ کے ذریعے ان ملکوں پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس خواب کی تعبیر تبھی ممکن تھی پہلے مرحلے میں ان ریاستوں کی سرزمین کو بدامنی کا شکار کر کے ان کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ اس کے بعد وہاں مداخلت کو آسان بنانا ممکن ہو گا"۔[2]

گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا کام تبھی سے شروع ہو گیا تھا جب اس کے بانی تھیوڈر ہرتزل نے 1904ء میں اس کی پیشین گوئی کی تھی اور اس کے لیے تمام دنیا کے یہودیوں کو مل کر کام کرنے کے لیے کہا تھا۔ اسی طرح اسرائیل کے بانی فش مین نے بھی اسرائیل کے قیام کے اعلان کے بعد اقوام متحدہ میں 1947ء کی تقریر کے دوران بھی یہ کہا تھا کہ گریٹر اسرائیل کا منصوبہ یہودیوں کا خواب ہے۔[3]

---

[1] مجید ایاد، الموقف العربی من التغییر فی المنطقہ (القاہرہ، مجلہ سیاسات عربیہ، مارچ، 2019ء)، 166۔

[2] علی آزاد محمد، خلفیات الثورۃ السوریہ (بیروت، المرکز العربی للدراسات والابحاث، 2019ء)، 185۔

[3] مجید ایاد، الموقف العربی من التغییر فی المنطقہ، 56۔

1982ء میں یہودی مفکر اوید دینیون oded yinon نے عبرانی زبان میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا بعد میں انگریزی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔اس مضمون کا عنوان یہ تھا'80 کی دہائی میں اسرائیل کی پالیسی' A Stratigy for Israil in the Ninteen Eighties۔اس مبحث میں شام کے موجودہ بحران کو سامنے رکھتے ہوئے اسی مضمون کے تناظر میں بات کی جائے گی۔

انگریزی دانشور فرینکلن رایکرٹ کا خیال ہے کہ بظاہر یہ لگتاہے کہ اسرائیل کا موقف یہ ہے کہ نیل سے لے کر فرات تک کے سارے علاقے میں یہودی آبادکار لائے جائیں گے۔ جبکہ اس علاقے میں 1 بلین عرب رہتے ہیں۔ یہودیوں کی ساری دنیا کی آبادی 14 ملین ہے۔ اس لیے اگر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا جائے تو ارض موعود کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔اس عرب دنیامیں یا عمومی طور پہ عرب بہار کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کو دیکھتے ہوئے جو بعض مسلم یہ خیال کر رہے ہیں کہ اس بحران کے پیچھے گریٹر اسرائیل کا منصوبہ کار فرماہے تو یہ درست نہیں ہو سکتا۔ کچھ یہودی عوام بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اس بحران کے بعد اپنے خواب کی تعبیر کے قریب ہو سکتے ہیں تو شاید یہ محض ایک مفروضہ ہو۔ عملااس کو پایہ انجام تک پہنچانا ممکن نہیں لگتا۔[1]

لیکن اس کے بر خلاف کینیڈین مفکر اور مانسی Ormanci کہتے ہیں کہ موجودہ صورتحال اور بھیانک بحران کے تناظر میں یہ کہنا کہ ایسا ممکن نہیں، قرین قیاس نہیں ہے۔ اس کا کہناہے کہ یہودی امریکا میں کل آبادی کا محض 2 فیصد ہیں تاہم انہوں نے پورے امریکہ پر قبضہ کر رکھا ہے اپنی کمپنیوں اور کاروبار کے ذریعے سے۔ وہاں کی تمام بڑی پالیسیوں میں ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ نیل سے فرات تک مختصر یہودیوں کا گروہ کیسے قابض ہو سکتا ہے، درست نہیں ہے۔ بلکہ ایسا ممکن ہے۔ جیسا کہ امریکا میں نظر آرہاہے۔ اور مانسی کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہودی پوری دنیا میں اور بالخصوص غریب و پسماندہ ملکوں میں بہت سارا پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ یہ سب خیرات اور فلاحی کاموں کے نام پر ہوتا ہے۔ وہ اتنی بڑی دولت اگر دیگر ملکوں کے رفاہی کاموں کے لیے خرچ کر رہے ہیں تو کیا وہ اپنی ارض موعود کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہوں گے۔ ان کا یہ بھی دعوی ہے کہ تل ابیب اس وقت عراقی کردستان پر عملا قابض ہے۔ وہاں اگرچہ حکومت کردوں کی ہے لیکن حقیقی نظام اور فیصلے اسرائیل کے ہوتے ہیں۔اسی طرح ایک دعوی یہ کیاہے کہ شام میں دولت اسلامیہ کے پس پردہ اسرائیل بھی ملوث ہے۔ اگرچہ دولت اسلامیہ کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔[2]

---

[1] مسعد ناجی، مستقبل التغییر فی الوطن العربی (اسکندریہ، منشورات الکتب العامہ، 2012ء)، 32۔

[2] حمزہ المصطفی، المجال العام الافتراضی فی الثورۃ السوریہ، 235۔

ایک اور کینیڈین مفکر میکائیل دستووسکی نے 2015ء میں یہ کہا تھا کہ گریٹر اسرائیل کا منصوبہ صرف مذہبی یہودیوں کا خواب ہی نہیں ہے بلکہ اسرائیل میں جو بھی پالیسی بنائی جاتی ہے یا ملک میں خارجہ معاملات کے جتنے فیصلے ہوتے ہیں ان سب میں گریٹر اسرائیل کے خواب کو محور کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ عرب بہار کے بعد کے موجودہ بحران کو بھی اس سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔[1]

شامی خانہ جنگی اور اسرائیل کے عزائم:

اگر ان جدید مفکرین کے بیانات اور اودید ینون کے مضمون کے تناظر میں بات کی جائے تو اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شام کے بحران میں بھی اس نظریے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد عراق پر امریکی حملے، 2006ء میں لبنان پر میزائل داغنے، 2011ء میں لیبیا کی خانہ جنگی اور اب شام میں مسلسل خانہ جنگی کی کیفیت اور سخت بحران جیسے مسائل کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ عراق کے منصوبے کی طرح شام کو بھی تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جن میں کردی شام، سنی شام اور شیعی شام کی ریاستیں شامل ہوں گی۔[2] اگر شام کو اس طرح ٹکڑے کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خطہ ہمیشہ کے لیے بدامنی کا شکار ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ تقسیم نسلی اور مذہبی فرقہ واریت کی بنیاد پر ہو گی اور اسے کو مسلسل ہوا دیتی رہے گی۔ 2008ء میں معروف امریکی جریدے دی اٹلانٹک نے امریکی فوج کی طرف سے پیش کیے گئے ایک ایسے ہی نقشے کو جاری کیا تھا جس طرح کہ اودید ینون نے ظاہر کیا تھا۔ ایسے ہی 2006ء میں بھی اس نوع کے نقشے جاری کیے جاچکے ہیں۔ ان نقشوں میں شام کو ٹکڑوں میں تقسیم ریاستوں کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عراق، لیبیا سوڈان اور شمالی افریقا کو بھی منقسم دکھایا گیا ہے۔[3]

مصری صحافی اور معتبر عرب مفکر محمد حسین ہیکل[4] نے گزشتہ صدی کی پچاس کی دہائی میں تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بات کی تھی کہ آنے والے وقت میں اسرائیل کی جانب سے خطے میں اس طور بدامنی پیدا کی جاسکتی ہے کہ اس ریاست کے آس پاس کے ملکوں میں رہنے والے باشندوں کی ایک بڑی تعداد یہاں سے ہجرت پر مجبور ہو جائے گی۔ اسے انہوں نے transfer plan کے نام سے تعبیر کیا ہے۔[5] اس سے اسرائیل کو یہ فائدہ ہو گا کہ یہاں کے

---

[1] حمزہ المصطفی، المجال العام الافتراضی فی الثورۃ السوریہ، 45۔

[2] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات، 349۔

[3] ہندی احسان، کفاح الشعب العربی، 249۔

[4] خیر الدین الزرکلی، دار العلم للملایین، بیروت

[5] سابقہ مرجع، 98۔

باشندوں کی مہاجرت اور بدامنی کے پھیلاؤ کے بعد اس کے لئے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ ماضی کی اسرائیل مخالف پالیسیوں کے علمبردار عناصر سے چھٹکارا حاصل کر لے گا اور اس کے بعد نئے نظام کی تشکیل میں اپنے اثر ورسوخ کے ساتھ اپنی مرضی کے ہرکارندے متعین کیے جاسکیں گے۔ اگر اسرائیلی یہودی ان ممالک کی جانب رہائش کی غرض سے آتے ہیں تو ایک بڑی مہاجرت کے بعد ان کے لیے آسان ہو گا کہ وہ اپنے لیے جگہ پیدا کریں اور زیادہ اثرات کے حامل طبقہ بن کر ابھریں۔ یہ پوشیدہ امر نہیں ہے کہ اس صدی کی سب سے بڑی ہجرت ملک شام سے ہوئی ہے۔ لاکھوں شہری اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچانے کی غرض سے اپنا گھر بار اور وطن چھوڑ کر دیگر ممالک کا رخ کر چکے ہیں۔ ہزاروں شامی اس وقت ترکی بارڈر پر لگے گئے اقوام متحدہ کے خیموں میں پناہ گزین ہیں، ہزاروں ترکی کے اندر موجود ہیں، جبکہ سینکڑوں لوگ یورپ کی طرف ہجرت کر کے جاچکے ہیں۔ ابھی لڑائی جاری ہے اور خانہ جنگی کا شکار لاکھوں لوگ شام سے باہر نکلنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے اگر شام کی اتنی بڑی سنی آبادی اس ملک سے ہجرت کر کے نکلتی ہے تو اس کا فائدہ کسے ہو گا۔ کم از کم اس چیز سے انکار ممکن نہیں ہے کہ شام کی کم آبادی اسرائیل کے حق میں بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ یہودی طبقہ اپنے ارض موعود کے خواب کی تکمیل کے لیے سخت کوشاں ہے۔ موجودہ وقت ان کے لیے سب سے بہترین موقع ہے۔ اگر شام میں استحکام باقی رہتا تو ارض موعود کے خواب کی تکمیل ممکن نہیں تھی۔

جیسا کہ اورمانسی نے شام کے اس بحران کی تفصیل کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل کے لیے یہ مشکل نہیں ہے کہ وہ اس خطے میں اپنے پولیٹکل آرڈر کو نافذ کرے۔ اس کی مثال انہوں نے امریکا کی صورت میں پیش کی کہ وہاں کیسے دو فیصد آبادی ہوتے ہوئے یہودی طبقہ پورے ملک پر قابض ہے اور پس پردہ انہیں کی حکومت قائم ہے۔ اگر شام کو تقسیم کیا جاتا ہے اور وہاں نسلی و مذہبی تفریق کی اساس پر ریاستیں قائم ہوتی ہیں تو وہ اتنی کمزور ہوں گی کہ انہیں اپنے لیے مستقل سہارے کی ضرورت رہے گی۔[1] یہ تعاون اور سہارا اسرائیل کی صورت میں سامنے آسکتا ہے۔ کیونکہ بطور پڑوسی اور خطے کے ایک طاقتور ملک ہونے کی حیثیت میں وہ نئے نظام کی تشکیل اور اس میں اثر ورسوخ سے پیچھے نہیں رہے گا۔ اگر کوئی طبقہ ملک کے معاشی سرکل پر قبضہ جمالیتا ہے تو اس کی داخلہ و، خارجہ پالیسی پر اثرانداز بھی ہوتا ہے۔ عراقی کردستان اس کی پہلی مثال ہے۔ یہ چھوٹی سی ریاست ابھی تو اپنے تشکیل کے مرحلے میں ہیں اور اس کا قیام پوری طرح منظور نہیں ہوا لیکن اسرائیل اس کی حمایت میں سب سے آگے ہے اور وہ ابھی سے وہاں پوری طرح عملداری کا اظہار کر رہا ہے۔[2]

---

[1] محارب محمود، اسرائیل والتغییرات الجیو الاستراتیجیہ، 168۔

[2] جمال باروت، الاحزاب والجماعات الاسلامیہ، 77۔

شام کی تقسیم کے حوالے سے بھی اسرائیل اپنی رضامندی ظاہر کرچکا ہے۔[1] اگر یہ ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عراقی کردستان کی طرح یہاں بھی اپنی طاقت کے ذریعے اثرورسوخ حاصل کرے گا۔ اور یہاں بننے والی کسی بھی پالیسی میں دخل اندازی کرسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اسرائیل کے لیے یہ بھی انتہائی مفید پہلو ہے کہ اس کے روس کے ساتھ تعلقات اچھے ہیں۔ ایران کے علاوہ روس ایک ایسی طاقت ہے جو شام میں بہت مضبوط ہے۔[2] ایران کی قدرے مستحکم حیثیت بھی روس کی وجہ سے قائم ہے۔ اگر یہاں روس اسرائیل اور اس کی پالیسیوں کو ترجیح دیتا ہے تو کوئی اور طاقت اسرائیل کے خلاف مزاحم ہونے کے لیے موجود نہیں ہے۔

اگر خطے میں اسرائیل کی سٹریٹیجک و سیاسی طاقت کا جائزہ لینا ہو تو اس بات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خلیجی ممالک بھی اس کے خلاف مزاحم ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

" بلکہ عرب بہار شام بحران کے دوران خلیجی ریاستوں کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات میں بہتری آئی ہے۔ اب خلیجی ریاستیں فلسطین کے لیے اتنی زوردار آواز بلند کرتی نظر نہیں آتیں جیسا کہ پہلے محسوس کیا جاتا تھا۔ سعودی عرب کے فرمانروا شہزادہ محمد بن سلمان فلسطینیوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہہ چکے ہیں کہ اگر انہیں ٹرمپ کی جانب سے پیش کی گئی صدی کی ڈیل پر اعتراضات ہیں تو وہ خاموش رہیں، ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہے جسے اپنایا جاسکتا ہو۔ اس کے علاوہ جب یہ صدی ڈیل جس میں فلسطین کو ٹکڑے کرکے اسرائیل کو ایک ملک تسلیم کیا گیا اور اس کے لیے آباد کردہ جبری بستیوں کو جواز فراہم کیا گیا تو دیگر خلیجی ریاستوں نے بھی اسے بہتر حل قرار دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ فلسطین کے مسئلے کا یہ حتمی و قابل قبول حل ہے جسے منظور کیا جانا چاہیے"۔[3] لہذا اس منظرنامے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسرائیل کے لیے خطے میں من مانی کرنے کی پوری آزادی دستیاب ہے۔ ایسے میں ارض موعود کے خواب کی تعبیر کتنی دشوار ہوسکتی ہے؟

خطے کے دیگر ممالک کے معاملات اور ان کی پالیسیوں سے قطع نظر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ داخلی سطح پر جو آبادی شام میں بستی ہے وہ اسرائیل کے خلاف یا اس کے ہمنواؤں کے خلاف کیونکر کھڑے ہوسکیں گے۔ کیونکہ اس وقت عرب بہار کے بحران کے بعد جن المیوں نے جنم لیا اور اس کا جو خمیازہ شامی باشندوں کو یا اس کے ساتھ کے دیگر ملکوں کو بھگتنا پڑا اس کے بعد وہ آئندہ کسی نئے استعمار کے خلاف کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کریں گے۔ وہ اب

---

[1] مسعد ناجی، مستقبل التغییر فی الوطن العربی، 36۔

[2] جمال باروت، الاحزاب والجماعات الاسلامیہ، 78۔

[3] سابقہ مرجع، 89۔

نفسیاتی طور پر اتنے کمزور ہو چکے ہیں اور آمریت کے خوف نے ان کو اتنا متأثر کر دیا ہے کہ وہ نئے نظام میں صرف اپنے بچوں کے ساتھ پر امن رہنا پسند کریں گے۔ "کسی نظام کی تبدیلی یا اس کے خلاف مزاحمت ان کے لیے اتنی آسان نہیں ہو گی۔ گویا اس کا فائدہ بھی اسرائیل اور صہیونی قوتوں کو ہوا ہے کہ شامی عوام دوبارہ کسی ایسے نظام کے خلاف بھی کھڑے نہیں ہو سکیں گے جو استعماری ذہنیت رکھتا ہو گا اور ان کی دینی یا ثقافتی شناخت کو متأثر کرتا ہو گا۔ ویسے بھی اب مسلم معاشروں کی نسل کشی ایک ٹرینڈ بن چکا ہے جس کے خلاف دنیا کی انسانی حقوق کی تنظیمیں اور ادارے بھی یا تو بے بس ہیں یا اس کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے ہیں۔ اس کی موجود مثال بھارت اور میانمار ہیں جہاں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔"[1] اگر خدانخواستہ اسی طرح کا عمل شام یا اسرائیل کے پڑوس کی دیگر مسلم ریاستوں کے اندر نئے نظام میں دہرایا جاتا ہے تو اس کے خلاف بھی شاید کوئی مزاحمت نہیں ہو سکے گا۔

میکائیل دستوو سکی کے مطابق شام بحران کے بعد یہ عین ممکن کہ اسے تقسیم کر دیا جائے، یہ منظر نامہ اسرائیل کے لیے براہ راست مفید ہو گا اور گریٹر اسرائیل کی راہ میں زیادہ آسان بھی۔ تاہم اگر ایسا نہیں بھی ہو تا تو یہاں ایک ایسا نظام لاگو کیا جائے گا جو اسرائیل کا مخالف نہیں ہو گا بلکہ اس کا ماتحت ہو گا۔ یہی صورتحال اسرائیل کے پڑوسی دیگر مسلم ریاستوں کی ہو گی۔ یہ پراکسی اسٹیٹس ہوں گی جن کا مرکز اسرائیل ہو گا۔[2]

خطے میں صرف اسرائیل کیسے محفوظ رہا؟

2011ء میں جب عرب بہار کی لہر آئی تو شروع میں پوری عرب دنیا نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس کی بنیاد سیاسی جبر، ناانصافی اور بے روزگاری کے خلاف غصے اور مزاحمت پر اُٹھی لیکن آہستہ آہستہ اس میں مختلف سلوگن اور نعرے شامل ہوتے گئے جس نے ارتکاز کو ختم کر دیا اور انتشار و کشمکش کو جنم دیا۔ ریاستی بدعنوانی کے خلاف شروع ہونے والا احتجاج مختلف ممالک میں مختلف دیگر شکلیں اختیار کرتا گیا۔ کہیں یہ سیکولر اور اسلام پسندوں کے درمیان تنازع بن گیا۔ کہیں جمہوری و غیر جمہوری نظاموں میں کشمکش کی صورت میں بدل گیا، جبکہ کسی جگہ مذہبی فرقہ واریت کی خطرناک جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔ انجام کار عرب بہار، خزاں میں تبدیل ہو گئی۔

مشرق وسطیٰ میں ہونے کی وجہ سے عرب بہار، بالخصوص شامی بحران نے اسرائیل پر کیا اثرات مرتب کیے؟

ابتدا میں جب احتجاج عروج پر تھے تو ان میں جہاں کئی اور سلوگن سامنے آئے وہاں اسرائیل مخالف سلوگن اور نعرے بھی نمایاں تھے۔ یہ اسرائیل کے لیے پریشانی کی بات تھی۔ اس نے خطے میں طاقت کا جو توازن قائم کیا تھا وہ

---

[1] جمال باروت، الاحزاب والجماعات الاسلامیہ، 111۔

[2] زیادہ رضوان، الاسد والصراع علی الشرق الاوسط (بیروت، دار الکتاب العربی، 2015ء)، 89۔

اس لہر کی کامیابی سے متأثر ہو سکتا تھا اور مشرق وسطیٰ میں اس کے اتحادیوں کا سقوط بھی اس کے لیے نقصان دہ تھا۔ اسرائیل کو باقی ممالک میں اس کے خلاف جذبات کی انگیخت سے اتنا زیادہ مسئلہ نہیں تھا، البتہ مصر اور شام میں جب احتجاج نے زور پکڑا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ خصوصاً حسنی مبارک کے سقوط اور عام انتخابات میں محمد مرسی کی فتح سے کیمپ ڈیوڈ معاہدے کی پاسداری مشکوک ہو گئی۔ اس وقت اسرائیلی وزیر خارجہ نے اسے ایران کے ایٹمی منصوبے سے زیادہ خطرناک قرار دے دیا تھا۔[1] اس وقت اسرائیل میں یہ خدشہ مضبوط ہو گیا تھا کہ مصر جنگ پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ شام کی طرف سے بھی اسے غیر یقینی کی صورتحال کا سامنا تھا۔ اگرچہ جنگ میں اسرائیل پر غلبہ کے امکان نہیں تھے لیکن اس سے اسرائیل کا داخلی امن واستحکام اور اقتصاد تہہ و بالا ہو سکتا تھا۔

جب عرب بہار، خزاں میں تبدیل ہوئی تو عربوں کی رائے یکسر مختلف ہو گئی۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد یہ خیال کرنے لگی کہ اس کے پیچھے اسرائیل کا ہاتھ تھا۔ وہ اس کا محرک تھا یا نہیں لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس لہر کی ناکامی کا فائدہ اسرائیل کو ہوا ہے۔

خطے میں گریٹر اسرائیل کی تکمیل کے لیے مکارانہ چالیں

عرب بہار نے عربوں کو مایوس کیا اور انہیں گہرے زخم دے گئی۔ اسرائیل کارزار کے وسط میں ہونے کے باوجود محفوظ رہا، بلکہ فائدہ اٹھایا۔ جنوری 2019 میں دی ٹائمز آف اسرائیل نے لکھا تھا، عرب بہار دوبارہ نہیں آئے گی۔ سوشل میڈیا جس نے عرب بہار کو جِلا دی تھی اب وہاں اس لہر کی تکلیف دہ تصاویر گردش کرتی ہیں۔ اس وقت عربوں کے پاس دو آپشن ہیں، شدت پسند داعش یا آمریت۔

اس شدید کشمکش کی وجہ سے فائدہ صرف اسرائیل کو ہوا۔ خطے میں اس وقت وہ آزاد اور بے خوف ہے۔ اس کی پڑوسی عرب ریاستیں اس پر تنقید نہیں کر رہیں۔ گریٹر اسرائیل کا منصوبہ رفتہ رفتہ اپنی منزل کی جانب جاتا دکھائی دیتا ہے۔

گریٹر اسرائیل کا منصوبہ یہودیوں کی ایک ایسی خواہش ہے جو محض سیاسی نہیں ہے بلکہ یہ سوچ ایک عقیدے کی شکل میں ان کے اذہان میں پختہ ہے۔ اس نظریے کو ان کی مذہبی وسیاسی کتب میں 'نیل سے فرات تک' کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نظریے کی ان کے ہاں اتنی زیادہ حساسیت ہے کہ یہ اسرائیلی نصاب کا حصہ ہے اور بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی عظمت رفتہ کو دوبارہ اسی جغرافیے پر بحال کرنا ان کی ایمانی ذمہ داری ہے۔

[1] مسعد ناجی، مستقبل التغییر فی الوطن العربی، 144۔

تورات کے سفر تکوین میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

"ہم پر لازم ہے کہ مصر کی سرزمین سے چلیں اور فرات تک پہنچیں"۔[1]

اسرائیل کے بانی تھیوڈر ہرتزل[2] نے بھی اسرائیل کی بنیاد رکھتے ہوئے اس کا یہی جغرافیہ بتایا تھا۔

یہود سمجھتے ہیں کہ مسیحا آئیں گے۔ یروشلم ان کی سلطنت کا پایہ تخت ہو گا، عیسائی دعویٰ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو یروشلم کو مرکز بنا کر وہ ساری دنیا پر حکومت کریں گے اور اس طرح سے ان کے اعتقادات، تثلیث، حلول اور صلیب وغیرہ کی تصدیق کریں گے، مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ ازل سے ہے ہی یروشلم دین حق اور اسلام کو صحیح اور درست ثابت کردے گا کیونکہ یروشلم ہی اصل میں کسوٹی ہے جہاں سے نبی آخر الزماں ﷺ کی حقانیت سارے زمانے پر آشکارا ہو گی، اس کا اشارا پہلے ہی معراج کی رات میں موجود ہے جہاں نبی بر حق ﷺ نے تمام پیغمبروں کی امامت فرمائی۔

اسرائیل دنیا کی واحد ریاست ہے جس کا قیام ناجائز قبضہ اور منظم سازش کے تحت وجود میں لایا گیا تھا پہلی جنگِ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کے انہدام کے بعد فلسطین کا علاقہ ترکوں کے کنٹرول سے نکل کر برطانیہ کے قبضہ میں آگیا۔ اُس ہی زمانے میں دنیا بھر سے یہودی لوگ فلسطین آنا شروع ہوئے 1939 میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی جرمنی کا حکمران ہٹلر یہودی قوم کے سخت مخالف تھا اُس نے ہزاروں لاکھوں یہودیوں کو قتل کروایا۔

دوسری جنگِ عظیم کا اختتام 1945 میں ہوا یورپ اور دیگر ممالک میں بکھرے یہودیوں کو اپنے لیے ایک علحیدہ ریاست بنانے کا خیال آیا برطانیہ کی آشیر باد سے یہودی پہلے ہی فلسطین میں لاکھوں کی تعداد میں رہائش پذیر ہو چکے تھے یہ شاید تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے کہ غیر ملکیوں نے اصل ورثوں کو اُن کی حقیقی سرزمین سے محروم کر دیا۔ 15 مئی 1947 کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کے لیے نئی کمیٹی بنائی جس نے 3 ستمبر کو رپورٹ پیش کی برطانوی انخلا کے بعد اس جگہ یہودی اور عرب ریاست کے ساتھ یروشلم کے شہر کو الگ الگ کر دیا جائے یوں 14 مئی 1948 کو اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔

---

[1] سوزان لبندار، عندما تصبح الخیانۃ حقیقۃ (القاہرہ، مکتبہ بیضاء، 2007ء) 114

[2] Elon, amos, herted, newyork: Holt,Rinehart and Winston, 23

گریٹر اسرائیل کے خواب کی تکمیل کے لیے دنیا کا ہر صہیونی اپنی کوشش بروئے کار لاتا ہے کیونکہ یہ اس کی زندگی میں سب سے قیمتی مذہبی فریضہ ہے جس کی ادائیگی ان پر واجب سمجھی جاتی ہے۔ گریٹر اسرائیل کا منصوبہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں متعدد مؤرخین اور سوشل سائنسز کے مفکرین نے کتب قلم بند کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی مشرق وسطی میں کوئی شورش اٹھتی ہے یا حالات خراب ہوتے ہیں تو اس کے بعد یہ بحث منظر عام پر آتی ہے کہ کہیں اس کا تعلق گریٹر اسرائیل کے یہودی منصوبے کے ساتھ تو نہیں ہے۔ کیونکہ اسرائیل اپنے قیام کے بعد سے اب تک زیادہ طاقتور ہوتا آیا ہے اور مشرق وسطی میں پیدا ہونے والے کسی بھی بحران کا فائدہ اسی کو ہوا ہے۔ 1948ء میں جس جغرافیے پر اسرائیل کا قیام عمل میں آیا تھا، یہ ملک اب اس سے زیادہ رقبے پر مشتمل ہے اور یہ سلسلہ مستقل طور پہ نئی آبادکاریوں کی صورت میں جاری ہے[1]۔

ماہرین کے مطابق گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے جس ماحول کی ضرورت ہے وہ امن کا ماحول نہیں ہے بلکہ جنگیں اور بدامنی ہے۔ کیونکہ اس سے خطے کے اندر ڈیموگرافک تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو وہاں کے نسلی، دینی اور ثقافتی سٹیٹس کو میں تغیر پیدا کرتی ہیں۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہجرت کرتے ہیں اور وہاں طاقتور ملک اپنی جگہ بناتے ہیں۔ مشرق وسطی کی حالیہ تاریخ میں 1948ء کے دوران فلسطین سے ہزاروں مسلم عرب نے ہجرت کی تھی۔ اس کی وجہ بدامنی کے وہ حالات تے جن سے دلبرداشتہ ہو کر لوگ اپنے خاندانوں سمیت وہاں سے منتقل ہو گئے تھے۔ اس کا فائدہ یہودیوں کو ہوا کہ وہ فلسطین میں آبادکاریاں بنانے لگے اور ساری دنیا سے اس کے بعد یہودیوں کو اس سرزمین پر جمع کرنے کا منظم عمل شروع ہوا[2]۔

یہودیوں کے گریٹر اسرائیل کے منصوبے کی وجہ سے یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس کی لگی بندھی حدود نہیں ہیں۔ اس کی جغرافیائی حدود میں تسلسل کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور اس کا علاقہ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں کے دورا اس کی تاریخ شاہد ہے کہ اس نے نہ صرف فلسطین کے علاقوں پر قبضہ کیا بلکہ دیگر مسلم ہمسایہ ممالک کی سرزمینوں پر قبضے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ اس کی مثال سیناء مصر، گولان کی پہاڑیاں اور اردن وشام کی بعض علاقوں پر قبضہ کرنے کی سعی ہے۔ گریٹر اسرائیل کو منصوبے کی بتدریج عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں سے چند یہ بھی ہیں جو حال ہی میں سامنے آئی ہیں:

یروشلم کو اسرائیل کا دارالخلافہ مقرر کیا گیا جسے امریکا سمیت کئی ممالک نے تسلیم کر لیا ہے۔

---

[1] الانقلابات العسکریہ فی سوریا،110

[2] ایضاً

امریکا نے گولان پہاڑیوں پر اسرائیل کے حق کو سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا ہے۔

یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ غزہ کی مغربی پٹی پر عنقریب اسرائیل اپنا حق جتائے گا۔

اس طرح کی تمام کوششوں اور اعلانات کے پس منظر میں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسرائیل کا بطور ایک ملک کے اپنی زمین کے رقبے میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہے۔ خطے کے اندر جب بھی حالات خراب ہوتے ہیں اس کا فائدہ صرف اسرائیل کو ہوتا ہے۔ گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے خطے میں کئی ایسے مسائل کا جنم ہوا ہے جو ان سازشوں کو واضح کرتے ہیں۔ ان مسائل میں سے بعض یہ ہیں:[1]

دہشت گردی:

گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے صہیونیوں کے مفاد میں جو مسئلہ تیزی سے کام کرتا ہے وہ دہشت گردی کا مسئلہ ہے۔ مشرق وسطی میں دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ صرف اسرائیل کے مفاد میں ہے۔ حالانکہ خطے کے تمام مسلم ممالک یہ چاہتے ہیں کہ دہشت گردی ختم ہو اور امن آئے لیکن اس کے باوجود صورتحال برعکس ہے، دہشت گردی کا عفریت مشرق وسطی کے امن کو تباہ کر چکا ہے۔ یہ ایک سہل الاستعمال اور کم لاگت کا ہتھیار ہے۔ اسرائیل کو اپنے خواب کی تعبیر کے لیے براہ راست جنگ کرنے کی ضرورت نہیں رہی اور نہ اسے براہ راست خطے کے اندر بدامنی کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ لہذا یہ ایک ایسا کارآمد طریق ہے جس سے اسرائیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور اس کے مفادات بھی پوری طرح محفوظ رہتے ہیں۔

1933ء سے 1948ء تک صہیونی عالمی تنظیم کے سیاسی شعبہ کے سربراہ اور اسرائیل کے پہلے وزیر خارجہ یاہو شریت نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ڈیوڈ بن گوریون (اسرائیل کا پہلا وزیر اعظم) نے اپنے ایک خط میں اسے کہا تھا کہ ”اسرائیل ایسا ملک ہے جو کسی عالمی قانون کا پابند نہیں ہے۔ اسے اپنے تمام قدم احتیاط کے ساتھ اٹھانے ہوں گے۔ تلوار کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پہ استعمال کرنا ہو گا۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے سے اسرائیل اپنے مفادات کو پوری طرح تحفظ کر سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ خطے کے اندر کچھ غلطیوں کو جنم دیا جائے۔ عربوں کے

[1] کفاح الشعب العربی، 66-90

ساتھ ایک نئی جنگ کا آغاز ہونا چاہیے تاکہ اسرائیل اپنے مقصد میں حائل تمام رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے آگے بڑھ سکے"۔[1]

یاہوشریت نے اپنی یادداشتوں میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسرائیلی ایجنسیاں اُردن، مصر اور قدس میں دہشت گردی کے واقعات کراتی تھیں تاکہ ان ممالک میں بدامنی کو فروغ دیا جاسکے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسرائیل 1954ء میں مصر میں ہونے والے پے در پے دہشت گردی کے واقعات کا ذمہ دار تھا۔ ان واقعات میں مصر کے اندر امریکی اور برطانوی شہریوں اور ان کی عمارتوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ مقصود مصر کے بارے میں عالمی سطح پر یہ تاثر قائم کرنا تھا کہ وہ ایک غیر محفوظ اور دہشت گردی کا مسکن ملک ہے جس پر عالمی پابندیاں عائد کرنے اور اس کے خلاف سخت اقدامات اٹھانے کی حاجت ہے[2]۔

ڈیوڈ بن گورین، اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم تھے جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ عہد نامہ عتیق ہماری سرزمین اسرائیل کی ملکیت کی دستاویز ہے۔ یروشلم جو مسلمانوں کا ایک مقدس شہر ہے اس حوالے سے یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ مسیحا آئے گا اور یروشلم ان کی سلطنت کا پایہ تخت ہو گا اور ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جب تک ہیکل سلیمانی تعمیر نہیں ہوتا مسیحا نہیں آئے گا۔

گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دہشت گردی کا منظم استعمال سرد جنگ کے اختتام اور نائن الیون کے بعد شروع ہوا۔ اس واقعے کے بعد مشرق وسطی اب تک بدامنی کا شکار ہے۔ اس کے نتیجے میں عراق پر حملہ شروعات تھیں جس سے خلیج میں ایک نئی جنگ چھڑی جو اب خانہ جنگیوں کی شکل میں عربوں اور مسلمانوں کو کھا رہی ہے۔

---

[1] تھیوڈر ہرتزل، یومیات، ترجمہ: ہلد اشعبان (لبنان، مرکز الابحاث لمنظمۃ التحریر، 2014ء) 711

[2] تھیوڈر ہرتزل، یومیات، ترجمہ: ہلد اشعبان (لبنان، مرکز الابحاث لمنظمۃ التحریر، 2014ء) 711

رنگین انقلابات:

coloured revolutions کی اصطلاح ان انقلابات کے لیے استعمال کی جاتی ہے جن میں معاشروں کے اندر سول نافرمانی تحریکیں چلتی ہیں یا پھر ملک کے سسٹم کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اصطلاح ماضی میں ان انقلابات کے لیے استعمال کی جاتی تھی جن کا محرک سوشلسٹ نظام ہوتا تھا اور یہ مغربی کٹھ پتلی حکومتوں کے خلاف ہوتی تھیں۔ لیکن اب یہ ان تمام تحریکوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جن میں ملک کے لوگ نظام یا حکومت کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں۔

گریٹر اسرائیل کے منصوبے کی تکمیل کی خاطر ایک اور ہتھیار جو استعمال کیا جاتا ہے وہ مسلم حکومتوں کے خلاف ان کی عوام کو بھڑکانے کا ہے۔ اس سے ملک میں افراتفری اور خانہ جنگی کا ماحول پیدا ہوتا ہے جسے کئی طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے۔ ایک بنیادی مسئلہ یہ ہوتا ہے لوگ ہجرت پر مجبور ہوتے ہیں۔ خاص راسخ نظام اکھاڑ پچھاڑ کا شکار ہوتا ہے اور بیرونی مداخلت کو آسانی کے ساتھ رسائی میسر آتی ہے۔

اقتصادی جنگ:

گریٹر اسرائیل کے لیے تیسرا ہتھیار یہ ہے کہ اسرائیل کے ہمسایہ ممالک اور وہ مسلم ریاستیں جو اسرائیل کی مخالف ہیں ان کو معاشی طور پہ کمزور بنادیا جائے۔ اس سے اسرائیل کو فوقیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے مخالف ملک اپنے داخلی مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ ایسے میں وہ اپنے فیصلے آزادانہ طریقے سے کرنے کے قابل بھی نہیں رہتے اور نہ ہی بیرونی مداخلتوں کو روکنے کی استطاعت رکھتے ہیں[1]۔

اسرائیل کے لیے کسی بھی ملک پر معاشی جنگ مسلط کرنے میں کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عالمی مالیاتی اداروں میں اسی کی لابی کے افراد موجود ہوتے ہیں جو ممالک کو اپنی شرائط پر قرض مہیا کرتے ہیں یا ان پر اقتصادی پابندیاں عائد کرکے ان ملکوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔ جب کسی ملک پر معاشی گھیرا تنگ ہوتا ہے تو اس کے اپنے عوام حکومت پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ملک میں ایجاد و صنعت کا

---

[1] کفاح الشعب العربی، 125

پہیہ رک جاتا ہے جس سے عالمی مالیاتی اداروں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ان ممالک کی سیاست اور اندرونی معاملات میں مداخلت کریں۔

گریٹر اسرائیل کا خواب یہودیوں کا دینی عقیدہ ہے۔ لیکن اس کی تعبیر کے لیے عصر حاضر میں خطے کے اندر براہ راست کھلی عسکری مداخلت نہیں کی جاسکتی۔ اس ایک وجہ قومی ریاستوں کا عالمی قانون بھی ہے اور یہ بھی کہ اسرائیل ایک چھوٹا ملک ہے جو تعداد کے لحاظ سے بڑی فوجوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اس لیے ان ممالک سے معاشی جنگ لڑی جاتی ہے تاکہ ان کو کمزور کیا جاسکے۔

خوف کی سیاست:

گریٹر اسرائیل کے حق میں ایک ہتھیار یہ بھی استعمال کیا جاتا ہے کہ خطے کے اندر حوف کی سیاست کو پروان چڑھایا جائے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران یہودیوں نے ساری دنیا کو یہ تاثر دیا کہ ان کی نسل کشی کی گئی اور اگر انہیں محفوظ مقام نہ دیا گیا تو وہ ختم ہو جائیں گے۔ چونکہ یہودیوں پر جرمنی میں ظلم ڈھایا گیا تھا اس لیے اتحادی یورپی طاقتوں کے اندر ایک گونہ احساس جرم تھا کہ اس جنگ میں یہودیوں کو قتل کیا گیا۔ یہودیوں نے فلسطین میں رہنے کے لیے علاقہ مانگا۔ پہلے یہ مطالبہ انسانی بنیادوں پر تھا کہ انہیں تحفظ کے لیے یہ جگہ چاہیے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی ہجرت شروع ہوئی اور ان کی آبادی فلسطین میں بہت زیادہ ہوگئی۔ اس کے بعد انہوں نے وہاں زمینوں کی بڑی خریداری کی۔ پھر 1948ء میں الگ ملک کے قیام کا اعلان کیا گیا جو برطانیہ کی سربراہی میں ہوا۔

پہلے دو ملکی حل پیش کیا گیا تھا کہ اس تنازعہ کا حل یہ ہے کہ اسرائیل اور فلسطین دو ریاستی حل کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ اسرائیل فلسطین کو سرے سے تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے اور یہ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ فلسطینی یا تو ہجرت کر جائیں یا پھر بطور اقلیت مقہور بن کر زندگی گزاریں۔ اس صورتحال کے بارے میں بن گوریان کی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا:

''فلسطینی اراضی سے یہاں کے لوگوں کی ہجرت گریٹر اسرائیل کے لیے ایک مفید راستہ ہے اور اس میں ہماری قوت کا کیر از پنہاں ہے۔ اسرائیل کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ایک ہی دفعہ میں آس پاس کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیتا لیکن اس

سے زیادہ بہتر اور کارآمد یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو ہجرت پر مجبور کیا جائے اور وہ خود ان علاقوں کو خالی کرتے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں سے یہودیوں کو اسرائیل میں آباد کاری کے لیے لایا جائے اس سے ہمیں مزید قوت حاصل ہو گی اور آبادی کا عدم توازن ختم ہو گا۔ اگر ہم فلسطینی علاقوں پر قبضے کر بھی لیں اور وہاں آباد کاری کے لیے یہودی نہ ہوں تو اس کا فائدہ نہیں ہے اس لیے اس بات پر توجہ دی جائے کہ تمام دنیا سے یہودیوں کو راغب کیا جائے کہ وہ یہاں آکر بسیں"۔ (1)

گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات عیاں ہے کہ فلسطین کا دوریاستی حل اسرائیل کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ یہودی دوریاستی حل کا فارمولہ اس وقت تک پیش کرتے رہے جب تک کہ عرب ممالک مستحکم تھے اور ان کا سیاسی واقتصادی نظام ابتری کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اب جبکہ حالات بگڑ چکے ہیں خطے میں طاقت کا توازن ختم ہو کر اسرائیل کے مفاد میں متشکل ہو گیا ہے تو اسرائیل فلسطینی ریاست کو تسلیم نہیں کرتا(2)۔

---

[1] ڈیوڈ بن گوریون، یومیات الحرب، ترجمہ: سمیر جبور (لبنان، مرکز الابحاث لمنظمۃ التحریر، 2010ء)144

[2] الانقلابات العسکریہ فی سوریا، 120

فصل پنجم

عالمی طاقتوں کی مداخلت

شام کے موجود بحران کے اسباب و محرکات میں سے ایک نمایاں سبب یہ بھی ہے کہ جب عرب بہار شروع ہوئی تو اس ملک میں شروع ہونے والے مظاہروں کے تناظر میں عالمی قوتوں نے جس طور کردار ادا کیا، اس سے یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہوتا چلا گیا اور اس نہج تک پہنچ گیا کہ اسے رواں صدی کی بدترین خانہ جنگی[1] سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ باوجود اس کے کہ بشار حکومت کے خلاف بظاہر عالمی ضمیر نے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا اور اس کے سقوط کی حمایت کی لیکن اس کے باوجود اس نظام کو کوئی فرق نہیں پڑا۔

عالمی قوتوں کی بے توجہی:

شروع میں جب شام کے اندر مظاہرے کی ابتداء ہوئی تو عالمی قوتوں نے عوامی مظاہروں اور غیض وغضب کے حق میں بیانات دیے اور یہ کہا کہ ملک میں سیاسی قیادت کی تبدیلی ناگزیر ہے جس کے لیے شامی حکومت کو اپنا محاسبہ کرتے ہوئے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ تاہم اس کے بعد جب بشار حکومت نے عوام کے خلاف طاقت کا بھیانک استعمال کیا اور میزائل داغنے شروع کیے تو اس کے بعد ضروری تھا کہ عالمی طاقتیں اس کے خلاف بھی بھرپور انداز میں کھڑی ہوتیں اور اس کے سقوط کے لیے کوشش کرتیں لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ اس کے بعد عالمی قوتوں کی منافقت اور بے دلی واضح ہونا شروع ہوگئی۔[2]

شامی حکومت نے احتجاج کے بعد سے جو ردعمل دیا اس سے یہ ظاہر ہوا کہ عالمی قوتوں کے پاس دو آپشن ہیں: 1۔ یا تو وہ اس فرسودہ نظام کی حمایت کرتے ہوئے اسے چلنے دیں یا پھر یہ کہ اس کے متبادل کے طور پہ ان مسلح جماعتوں کے نظام کو قبول کریں جنہیں مغرب بھی اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے۔ ایسی صورتحال میں مغرب اور عالمی برادری نے جو کردار ادا کیا اس سے مسئلہ سمجھنے کی بجائے مزید الجھتا چلا گیا۔ بدقسمتی سے شروع میں بشار حکومت کے متبادل عوامی اور جمہوری طبقات تھے جنہیں عالمی قوتوں نے تنہا چھوڑ دیا اور ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کے بعد جب مظاہرے خونی شکل اختیار کرتے گئے اور میدان میں مسلح جماعتیں اترنی شروع ہوئیں تو اس کا فائدہ شامی نظام اور

---

[1] Losing on all fronts(Center for Strategic and International Studies, 2014),11-33.

[2] علی آزاد محمد، خلفیات الثورۃ السوریہ، 223۔

اس کی جابر حکومت کو ہوا کہ اس نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف برسرپیکار ہے۔[1] بالکل انہی جماعتوں کے۔ خلاف جن کے مزاحم خود مغرب اور دیگر عالمی قوتیں کھڑی ہوئی ہیں۔

2011ء میں جب شام کا بحران شروع ہوا تو یہ مارچ کا مہینہ تھا۔ اس کے بعد جولائی میں عرب لیگ کے نمائندے مسئلے کے حل کے لیے شام کی حکومت سے بھی ملے تھے۔ جولائی میں جب وہ مذاکرات کے لیے گئے تھے تو عالمی برادری اس وقت تک محض اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ ملک میں سیاسی سطح پر کچھ اصلاحات ہونی چاہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا رہا تھا۔ گویا شام کے بحران کے شروع ہونے کے پانچ ماہ بعد تک بھی دنیا بشارالاسد کی معزولی کے آپشن پر غور نہیں کر رہی تھی۔[2] تب تک حالات بشار الاسد کے کنٹرول میں آچکے تھے اور اسے بہت زیادہ اعتماد حاصل ہو چکا تھا۔

شامی حکومت کے لیے نرمی:

عالمی برادری اس وقت عملاً حرکت میں آئی جب بشار حکومت کی فوجیں شام کے گلی کوچوں میں اتر چکی تھیں اور وہ ایک خطرناک معرکہ شروع کر چکی تھیں۔ تب کافی دیر ہو چکی تھی۔ تاہم ستمبر میں عرب لیگ کا وفد ایک بار پھر شام میں مذاکرات کے لیے گیا تھا اور شامی حکومت کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے۔ عرب لیگ کے وفد کا مقصد یہ تھا کہ عالمی قوتوں کو شام کے مسئلے میں مداخلت سے روکا جائے کیونکہ اس کے نزدیک اس کے خطرناک نتائج سامنے آسکتے ہیں اور سارے خطے کو اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔[3]

عرب لیگ نے جو مطالبات سامنے رکھے وہ کچھ یوں تھے:[4]

1. شامی حکومت ملک میں مسلح آپریشن کے استعمال کو فی الفور بند کرے تاکہ شامی شہریوں کے جانی نقصان کو کم کیا جاسکے اور ان کا خون نہ بہے۔
2. شامی حکومت شہریوں کے لاحق ہونے والے سارے نقصان کا ازالہ کرے اور انہیں اس کی قیمت ادا کرے۔
3. بشار الاسد ماضی میں کیے گئے اپنے وعدوں کا ایفا کرتے ہوئے سیاسی اصلاحات متعارف کرائے اور ایک تنوع پسند نظم کی تشکیل کو یقینی بنائے۔ اس کے ساتھ 2014ء میں جب صدر کی موجودہ مدت صدارت ختم ہو تو ملک میں آزادانہ انتخابات کرائے جائیں جن میں تمام سیاسی جماعتوں کو حصہ لینے کی اجازت ہو جو عوام کی نمائندگی کرتی ہیں۔

---

[1] الزاوادین، السیطرہ الغامضۃ، 158۔

[2] Nikoloas Van Dam, Destroying A Nation (London, Bloomsbury Publishing, 2017), 120.

[3] سابقہ مرجع، 126۔

[4] سامح العائد، الزاوادین، السیطرہ الغامضۃ، 58۔

4. فوج کو شہری و مدنی مسائل سے الگ رکھا جائے۔
5. فوری طور پہ بشار حکومت ملک کی اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ مذاکرات شروع کرے جس میں اس مسئلے کے حل کے ممکنہ اقدامات اٹھانے کے لیے مشترکہ لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ مذاکرات میں اپوزیشن کی تمام جماعتوں کی نمائندگی ضروری ہو اور اس بات چیت میں جن مفروضوں پر اتفاق کیا جانے چاہیے وہ یہ ہوں: تشدد کو مسترد کیا جائے گا۔ فرقہ واریت کو جگہ نہیں ملے گی اور باہر کی قوتوں کو مداخلت کی اجازت نہیں ہوگی۔
6. عرب لیگ عام و آزادانہ انتخابات کے قیام تک بشار حکومت کے ساتھ معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کام کرتی رہے گی۔

ان تمام امور کی درست و منطقی انجام دہی کے لیے وقت اور دورانیے کو طے کر لیا جائے گا۔
اس سارے عمل میں عربوں کا ایک وفد نگرانی کرنے میں شریک رہے گا۔
شامی بحران کے حل کے لیے اب تک جتنے اقدامات کیے گئے عرب لیگ کی جانب سے پیش کردہ یہ حل اور اٹھایا گیا یہ اقدام منطقی اور سب سے بہتر تھا مگر اس پر عملدرآمد کے لیے کوششیں نہیں ہوئیں۔ عالمی برادری سے سرمہری کا مظاہرہ کیا اور ایک ایسے حل کی پرزور حمایت نہیں کی جس میں ان کی مداخلت کے لیے جگہ باقی نہ رہتی ہو۔ یہ منصوبہ واقعاتی اصولوں پر قائم تھا اور اس میں فوری طور پہ بشار الاسد کی معزولی کا آپشن بھی نہیں تھا۔ یہ حل سب کے لیے قابل قبول ہوتا اور بشار حکومت کو بھی مجبور کیا جا سکتا تھا کہ وہ اسے قبول کرے مگر ایسا ممکن نہیں ہوا۔ [1]

عرب لیگ کی کوشش:

عرب لیگ کے سامنے عراق میں عالمی قوتوں کی مداخلت کا نتیجہ سامنے تھا۔ اس کے علاوہ 2011ء ہی میں لیبیا کے اندر بھی ان کی مداخلت نے کیا منفی اثرات مرتب کیے وہ بھی مخفی نہیں تھے۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ خلیج میں ایک اور مزید ملک میں باہر کی قوتوں کی مداخلت کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ ان کے اپنی ریاستوں میں اس کے اثرات ظاہر ہوں گے اور ان پر دباؤ بڑھے گا۔ [2]
عرب لیگ مسلسل یہ کوشش کرتی رہی کہ شام کے بحران کے حل کے لیے عالمی قوتوں کی مداخلت کا جواز نہ رہے۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنی طرف ہر ممکن کوشش کی اور بشار کی حکومت کے لیے ایسے مواقع پیدا کیے کہ جن سے ملک میں خون خرابہ بھی رک جائے اور حکومت اپنی ماضی کی پیش کردہ اصلاحات کی سعی کے وعدوں پر عمل پیرا

---

[1] محجوب زویری، العرب وایران، مراجعۃ فی التاریخ، 232۔
[2] سیار الجمیل، تکوین العرب الحدیث، 175۔

ہوتے ہوئے اس مسئلہ کو حل کرلے۔ مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ ایک طرف شام کی حکومت مذاکرات کی صف میں شامل رہی اور دوسری طرف ملک میں فوجی آپریشن اور مسلح کاروائیاں بھی کرتی رہی۔ اکتوبر 2011ء میں ایک بار پھر عرب لیگ کا وفد شام میں بشار الاسد سے ملاقات کے لیے گیا۔ اس کے بعد اسی ماہ شام کا ویزر خارجہ ولید المعلم دوحہ میں گیا اور عرب لیگ کے وفد سے بات چیت کی۔ اس سے اگلے ماہ 2 نومبر کو شام کے وزیر خارجہ اور عرب لیگ کے وفد کے مابین ایک اور معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس میں جن امور کو نمایاں کیا گیا وہ درج ذیل تھے: [(1)]

1. ملک میں فوری طور پہ شامی عوام کا خون بہانا بند کیا جائے۔
2. حالیہ بحران کے بعد جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا انہیں رہا کیا جائے۔
3. شہروں میں امن کے قیام کے لیے ان سے تشدد کی دعوت دینے والے تمام استعارات و علامات کو مٹایا جائے۔
4. عرب لیگ کے نمائندوں اور صحافیوں کو شام کے گلی کوچوں آزادانہ جائزہ لینے کی اجازت دی جائے۔
5. اس دوران یہ بھی طے کیا گیا دو ہفتوں کے اندر ایک مشترکہ سیمینار منعقد کیا جائے گا جس میں شام کے بحران پر نظر ڈالی جائے گی اور معاہدوں کی پاسداری کو پرکھا جائے گا۔

لیکن ان معاہدوں کے باوجود بھی شام میں حکومت نے اپنی پرتشدد کاروائیاں بند نہیں کیں۔ دس دنوں کے بعد 12 نومبر کو باالآخر عرب لیگ کے مشترکہ اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بشار حکومت کو ملک میں مظالم بند کرنے پر مجبور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شام پر پابندیاں عائد کردی جائیں۔ 16 نومبر 2011ء کو تمام عرب ممالک نے اپنے سفیر دمشق سے واپس بلا لیے۔ سوائے یمن اور لبنان کے انہوں نے اس فیصلے کو مسترد کردیا۔ لیکن اس کے باوجود عرب لیگ نے شام کے ساتھ مذاکرات اور بات چیت کے دروازے بند نہیں کیے۔ جنوری 2012ء میں ایک بار پھر ان کا وفد شام گیا جہاں دو ہفتوں بات چیت کے عمل کے بعد ناامید ہو کر واپس آگیا۔[(2)] کیونکہ پہلے کی طرح اب بھی شامی حکومت ایک طرف مذاکرات کر رہی تھی اور دوسری عوام کے خلاف مسلح کاروییائیاں بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔

عرب لیگ نے شام کی حکومت کو یہ آپشن بھی دیا تھا کہ بشار حکومت کو معزول کرنے کی بجائے اسے یہ بھی تسلیم ہے کہ ملک میں بشار اپنا نائب و قائم مقام صدر منتخب کردے جو عرب نمائندں کے ساتھ مل کر شام میں اصلاحات کے

---

[1] محجوب زویری، العرب وایران، مراجعة فی التاریخ، 235۔

[2] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 236۔

لیے کوشش کرے۔ لیکن شام نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔[1] عرب لیگ شام میں براہ راست اور بیک وقت تبدیلی کے خواہاں نہیں تھی بلکہ اسے ایک تدریجی عمل کے ساتھ آگے بڑھانا چاہتی تھی جو شامی حکومت کو پسند نہیں تھا۔ دراصل بشار حکومت نظام میں تبدیلی چاہتی ہی نہیں تھی چاہے اس کی جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

اب مگر صورتحال یہ بن گئی ہے کہ شام میں امن و سکون اور انسانیت کا تحفظ محض ایک خواب بن کر رہ گیا ہے - شام نے جہاں ایک طرف خانہ جنگی اور پراکسی وار کا سامنا کیا ہے وہیں اقتصادی، سماجی اور سیاسی بحران کا سامنا بھی کر رہا ہے - اس وقت شامی مسلمان ناگفتہ بہ حالات سے گزر رہے ہیں اور شام کے کئی علاقے زمینی اور فضائی حملوں کی وجہ سے کھنڈرات کے مناظر پیش کر رہے ہیں - یونائیٹڈ سٹیٹس انسٹیٹیوٹ آف پیس (USIP) کی حالیہ رپورٹ کے مطابق گزشتہ 10 سالوں میں تنازعہ شام کے نتیجے میں 5 لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً 13 ملین افراد بے گھر ہوئے جن میں سے 6.2 ملین شامی افراد داخلی طور پر بے گھر ہوئے ہیں جبکہ 5.6 ملین شامی مہاجرین ہیں جن کی زیادہ تر تعداد لبنان، اردن اور ترکی میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔[2]

شامی مسلمانوں کو خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ موجودہ کورونا وباء (COVID-19) کا بھی سامنا ہے جس نے اس وقت دنیا کے مختلف خطوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے جس سے کثیر تعداد میں اموات ہو رہی ہیں مگر ان کی صحیح تعداد کا ہی دنیا کو علم نہیں ہے۔

عالمی قوتوں کے مفادات:

عالمی قوتیں اپنے مفادات کے تحت کام کر رہی تھیں۔ بجائے اس کے کہ وہ شروع سے عرب لیگ اور شام کی دیگر پرامن سیاسی تحریکوں کا ساتھ دیتے ہوئے کوئی فیصلہ کرتیں اور ایک ایسے نظام کی تشکیل میں معاون بنتیں جو شامی شہریوں کے لیے سود مند تھا، وہ دیر تک خاموش رہیں اور شام کے بحران کو خرابی کی جانب گامزن ہونے دیا۔ جب عرب لیگ مایوس ہو گئی اور شام میدان جنگ بن گیا تو اقوام متحدہ اور مغربی ممالک قراردادیں لے کر آگے آئے۔ فروری 2012ء میں جب عرب ممالک نے اقوام متحدہ میں بشار حکومت کے خلاف قرارداد پیش کی تو اسے روس و چین نے ویٹو کر دیا۔[3] ان دونوں ملکوں نے بشار الاسد کی آمریت اور جبر کو سہارا فراہم کیا۔

---

[1] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 257

[2] Nikoloas Van Dam, Destroying A Nation, London Bloomshoury Publishing 2017, 120

[3] محمد بوعزہ، الانقلابات العسکریہ فی سوریا، 35۔

یہ وہ لمحہ تھا جب شام کا بحران مشرق وسطی کے بحران سے نکل کر ایک عالمی بحران بن گیا اور اس میں عالمی قوتیں فریق بن گئیں۔ ان قوتوں کے متضاد مفادات نے اسے ان کی جنگ کا اکھاڑا بنادیا۔ ایک سال بعد روس نے اس بات پر اتفاق کیا کہ شام میں نظام کی اصلاحات کی جانی چاہئیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ بشار الاسد کو معزول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کی جگہ قائم مقام صدر کا انتخاب کیا جائے گا جیسا کہ عرب لیگ نے مطالبہ کیا تھا۔[1]

ابتداء میں امریکا اس مسئلے کا فریق نہیں تھا بلکہ وہ خاموش رہا۔ اس دوران ملک میں روس کی عملداری قائم رہی اور وہ واحد بڑی طاقت کے طور پہ شامل رہا۔ یہ بھی ایک وجہ بنی کہ روس وچین کی مداخلت کے بعد مغربی قوتوں کی براہ راست عسکری مداخلت ایک جنگ کی صورت اختیار کر لیتی۔[2]

جولائی 2012ء میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے جنیوا کانفرنس میں یہ قرارداد پیش کی کہ شام بحران کے حل کے لیے وہاں ایک مشترکہ حکومت قائم کی جائے جس میں موجودہ حکومت اور اپوزیشن کی نمائندگی شامل ہو اور ایک قابل قبول مشترکہ منصوبے پر اتفاق کرتے ہوئے سیاسی نظام کی تبدیلی کو یقینی بنایا جائے۔[3] اس قرارداد کو بحران کے تمام فریقوں نے قبول کیا اور اس کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ قرارداد اصل میں عرب لیگ کی پیش کردہ اصلاحات کا چربہ تھی۔ اسے قبول توسب نے کر لیا تاہم روس نے اس کی الگ وضاحت کی اور امریکی بلاک نے اس کی الگ وضاحت کی۔ روس نے کہا کہ اصلاحات اور تبدیلی بشارالاسد کی معزولی کے بغیر ہوگی جبکہ امریکا کا کہنا تھا کہ بشار مائنس فارمولے کے تحت اس قرارداد پر عمل کیا جائے گا۔[4]

اس قرارداد کے بعد کوفی عنان بحران کے فریقوں سے بات چیت کرتے رہے۔ وہ متعدد بار بشار الاسد سے ملنے شام بھی گئے لیکن اس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا۔ یہ ایسے تھا کہ جیسے کوئی اس بحران کے حل میں دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ ہر ایک محض اپنے مفادات کے لیے وقت چاہتا ہے۔ 2012ء کے وسط میں برطانیہ نے ایک بار پھر اقوام متحدہ میں ایک قرارداد پیش کی جس میں وضاحت کے ساتھ شام کے انتقال اقتدار کے منصوبے کو بیان کیا گیا تھا لیکن روس اور چین نے اسے ایک بار پھر ویٹو کر دیا۔[5] روس کے ہر بار اس مسئلہ میں ویٹو کرنے سے یہ واضح ہو گیا کہ اسے شامی شہریوں

---

[1] محمد بوعزہ، الانقلابات العسکریہ فی سوریا، 336

[2] Raina Abouzied, No Turning Back (Newyork, W.W Norton, 2018), 163.

[3] The Syrian withdrawal: Where Things Stand(RAND Studies, 2017), 56.

[4] محارب محمود، اسرائیل والتغیرات الجیو الاستراتیجیہ، 212۔

[5] حسن طوالبہ، مناقشۃ الصراع علی العراق، 140۔

کے انسانی المیے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اس کے لیے شام کا بحران صرف ایک جیو سٹریٹجک قضیہ ہے جس میں روس کی بالادستی کا قیام اولین ترجیح ہے۔[1]

کوفی عنان کے بعد الاخضر ابراہیمی[2] 2 اگست 2012ء کو اقوام متحدہ کے نئے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنی مدت میں کوئی نتیجہ خیز منصوبہ پیش نہیں کیا اور نہ ہی روس وچین کے مزاحم کوئی طاقتور بلاک تشکیل دے سکے جو عملی سطح پر خطے میں ان پر دباؤ ڈال کر مسئلے کے حل میں پیش رفت کو یقینی بنا سکے۔ الاخضر ابراہیمی اپنے پیش رو کوفی عنان کی طرح بیانات کی حد تک کام کرتے رہے اور اس کے بعد رخصت ہوگئے۔[3]

شام کی تباہی میں بیرونی قوتوں کی مداخلت

شام کی خانہ جنگی میں ایران، سعودی عرب ،روس، امریکہ اور ترکی کا کردار نہایت اہم ہے- شام کے زبردست اتحادی ہونے کے ناطے روس کی امریکہ کے ساتھ اکثر چپقلش جاری رہتی ہے کیونکہ امریکہ شام کے شمالی اور مشرقی علاقوں میں موجود تیل اور گیس کے ذخائر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے جس کیلئے وہ سویلین آبادی کو بھی نشانہ بناتا ہے-کچھ عرصہ قبل اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں شام میں روس کے سیز فائر پلان کو مسترد کر دیا تھا- اسی طرح ترکی نے مارچ 2020ء میں شام کے صوبہ ادلب میں باغی کردوں کے خلاف آپریشن کیا تھا جس میں ترکی کے متعدد فوجی بھی شہید ہوئے تھے جس کے بعد ترکی اور روس کے درمیان ادلب سیز فائر معاہدہ طے پایا تھا یہ تمام عناصر کسی نہ کسی طرح شام کی خانہ جنگی کا حصہ ہیں-شام کو ان نامساعد حالات تک پہنچانے میں زیادہ تر بیرونی قوتیں ملوث ہیں جو شام میں پراکسی وار اور خانہ جنگی کے ذریعے اپنا مفاد سمیٹ رہی ہیں- مزید بر آں! شام کی اس صورتحال کی ایک بڑی وجہ اس معاملے کا عالمی سیاست کی بھینٹ چڑھ جانا ہے جس میں بڑی حد تک اپنوں کی غفلت بھی شامل ہے جو اپنی حکومتیں قائم رکھنے کیلئے چند بے رحم عناصر کو اپنے ہی گھر میں اپنوں کا خون بہانے کا کھلا اختیار دیے ہوئے ہیں- شاید یہی وجہ ہے کہ خطے کو درپیش مسائل کے دیرپا حل کے بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔[4]

اس وقت خطے کے ممالک، اقوامِ متحدہ اور انسانی حقوق کی دیگر تنظیموں کو شام میں جنگ بندی اور قیامِ امن کیلئے سنجیدہ کاوشیں کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید بر آں! کوئی بھی ملک کسی تیسرے ملک میں طاقت کا بے جا اور منفی استعمال کرتے وقت عالمی قوانین کا احترام کرے اور اگر ضرورت پڑنے پر کوئی ملک کسی دوسرے ملک سے مدد کی درخواست

---

[1] عمر اسکندر، شوریا ازمۃ نظام وثورۃ شعب (بیروت، مرکز امیہ للبحوث والدراسات، 2014ء)، 86۔

[2] http://urdu.alarabia.net.2013

[3] سابقہ مرجع، 255۔

[4] محمد بوعزہ، الانقلابات العسکریہ فی سوریا، 35۔

کرے بھی تو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مطابق اس کی مدد کی جائے تاکہ اس ملک کی خود مختاری اور انسانی اقدار پامال نہ ہوں- اسی طرح شامی مہاجرین کی آبادکاری اور انہیں بنیادی انسانی حقوق اور سہولتیں فراہم کرنے میں قریبی مسلم و غیر مسلم ممالک (جن میں سے چند ایک پہلے ہی ان مہاجرین کو پناہ دیے ہوئے ہیں) اپنا کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں- عرب لیگ اور OIC تنازعہ شام کے حل کیلئے اپنا مؤثر کردار کر سکتی ہے بشرطیکہ اس معاملے کو سیاست کی بھینٹ نہ چڑنے دیا جائے۔ برادر اسلامی ملک ہونے کے ناطے پاکستان کو تنازعہ شام کے حل کے لئے متحرک سفارتکاری اور غیر فرقہ وارانہ پالیسی اپناتے ہوئے مستقل حکمتِ عملی تشکیل دینے کی ضرورت ہے تاکہ انسانی حقوق کے بین الاقوامی فورمز پر اس مسئلے کو بھرپور طریقے سے اجاگر کیا جاسکے۔ یہ بھی واضح ہے کہ شام میں جنگ بندی اور انسانیت کے ناحق خون کو روکنے کیلئے اگر امتِ مسلمہ نے بین الاقوامی سطح پر متفقہ آواز بلند نہ کی یا اپنا کوئی واضح مؤقف اور دیرپا لائحہ عمل پیش نہ کیا تو یہ پوری امت کیلئے خطرے کی گھنٹی ہو گی اور شام میں تباہی پورے عالمِ اسلام میں تباہی کا باعث بنے گی۔ [1]

امریکی طرزِ عمل:

شام کے ساتھ امریکا کا تعلق دوطرفہ رہا ہے۔ ایک طرف معاندانہ تھا کہ شام اور اسرائیل کی مخاصمت میں امریکا اسرائیل کے ساتھ کھڑا رہا ہے اور دوسری طرف اس نے شامی حکومت کے ساتھ تعلقات کے دروازے پوری طرح بند بھی نہیں کیے۔ عرب بہار سے قبل امریکا کے شام کے ساتھ تعلقات زیادہ کشیدہ نہیں رہے سوائے 2005 سے 2007ء کے عرصے کے کہ جب شام پر پابندیاں عائد رہیں اور اسے عالمی تنہائی کا سامنا رہا۔ لیکن اس دوران ایران اور ترکی نے شام کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کیے رکھے اور اس کی گرتی معیشت کو قدرے سہارا دیا۔ رواں صدی کے پہلے عشرے میں امریکا نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کے بیانیے کے تحت کئی ملکوں کو شر کا محور قرار دیا اور ان کے خلاف کاروائیاں بھی کیں جیسا کہ ایران، عراق اور شمالی کوریا۔ لیکن شام کو نشانہ نہیں بنایا گیا حالانکہ شام اس دورانیے میں حزب اللہ اور حماس کے ساتھ بھی تعاون کر رہا تھا جو اسرائیل اور امریکا کے مخالف تھے۔ [2]

مشرقِ وسطیٰ میں امریکی پالیسی کا ایک محور اسرائیل بھی ہوتا ہے۔ اس تناظر میں امریکا جو بھی قدم اٹھاتا ہے اس میں یہ نکتہ مدِ نظر ہوتا ہے کہ اس کے اسرائیل کے مفادات پر کیا اثرات پڑیں گے۔ شامی بحران بھی اسی تناظر کے زاویے سے دیکھا گیا۔ چونکہ شام اور اسرائیل کی سرحدیں ملتی ہیں اور گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیلی قبضے کی وجہ سے

---

[1] محمد بوعزہ، الانقلابات العسکریہ فی سوریا، 64

[2] یوسف سیوفی، ذکری استقلال سوریا، 98۔

مسلسل ایک نوع کی کشیدگی رہتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ پچھلے سارے عرصے میں ظاہری اونچ نیچ کے باوجود شام نے عملاً گولان کی پہاڑیوں کی واپسی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسے میں اس موجودہ نظام کی بقا میں اسرائیل کا بھی فائدہ شامل تھا کیونکہ اس کے متبادل کے طور پہ جو طبقات سامنے آرہے تھے وہ اسرائیل کے سخت مخالف تھے۔ یہ پیغام شامی حکومت نے بھی امریکا اور اسرئیل کو بھجوایا کہ اگر اس کا سقوط ہوا تو اس کا متبادل اسرائیل کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے امریکا کی مداخلت شامی عوام، دنیا کے دباؤ اور انسانی حقوق کے چیمپین ہونے کی وجہ سے ایسی رہی کہ اس نے نہ تو نظام کو معزول کرنے کی کوشش کی اور نہ عوام کی مخالفت میں بیان دیا۔[1] اس کا فائدہ اسرائیل کو ہوا خطے کی دیگر قوتیں جیسے کہ روس اور چین نے آزادی کے ساتھ شام میں اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔ مگر اس سب کی قیمت عوام کو چکانی پڑی ہے۔

روسی مداخلت:

روس کی سیاست پر نظر رکھنے اور شام کی روس کے لیے جغرافیائی اہمیت کا ادراک رکھنے والوں کے لیے روس کی 30 ستمبر 2015 کو شام میں مداخلت کوئی اچنبھے کی بات نہیں، روس باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ خطے اور عالمی منظرنامہ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے، اور اپنے لیے بہت سے امکانات واہداف کو سامنے رکھ کر میدان میں اترا ہے، روسی ماہرین کے نزدیک درج ذیل مقاصد کے حصول کے لیے روس نے شام میں مداخلت کی:[2]

1: عوامی بغاوتوں کے ذریعہ نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کو روکنا، روس کی نظر میں عراق میں صدام حکومت اور لیبیا میں قذافی حکومت کو گرانے میں درحقیقت امریکی ہاتھ ہے، روس امریکا کو یہ باور کروانا چاہتا ہے کہ کسی بھی ملک میں مداخلت کر کے اس کا نظام گرانا صرف امریکہ کی پسند وناپسند سے نہیں ہو سکتا۔

2: داعش جیسی دہشتگرد تنظیموں کی سرکوبی، روس کے نزدیک وہ تمام تنظیمیں دہشتگرد ہیں جو اسدی نظام سے برسرپیکار ہیں، داعش میں توسینکڑوں روسی بھی شامل ہو چکے ہیں جو روس کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں اور جنہیں امریکا اپنے مفاد کے لیے استعمال کر سکتا ہے اس لیے اس تنظیم کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا جائے، یہ درست ہے کہ روس نے داعش کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ روس کے حملوں کا رخ داعش سے زیادہ شامی اپوزیشن اور نہتے شہری ہوتے تھے جو کہ جنگی جرائم میں شمار ہوتا ہے۔

3: سوویت یونین کے سقوط کے بعد روس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا اور روس کی داخلی حالت تباہ کن ہو گئی تھی، ولادی میر پیوٹن نے آکر روس کو استحکام بخشا اور دوبارہ ایک عظیم قوت کے طور پر اجاگر کیا، 2014 میں جزیرہ نما

---

[1] The Syrian withdrawal: Where Things Stand(RAND Studies, 2017), 56.

[2] سابقہ مرجع، 59۔

کریمیا کو روس میں شامل کرنا، اس کے بعد یوکرائن اور پھر شام میں مداخلت درحقیقت امریکا اور نیٹو کے لیے پیغام ہے کہ روسی ریچھ اب بھی تازہ دم ہے اور اپنے برفانی غار سے نکل آیا ہے۔

4: شام میں مداخلت سے روس کو مشرق وسطی میں پاؤں رکھنے کے لیے جگہ مل گئی جس کے ذریعہ وہ بحر متوسط کے گرم پانیوں کے ساتھ ساتھ اسرائیل، لبنان، عراق، اردن اور ترکی کی سرحدوں پر بھی نظر رکھ سکتا ہے۔

سوویت یونین کے بعد روس کی کسی بھی دوسرے ملک میں ایک ہی عسکری بیس تھی اور وہ تھا شام، جس کا دفاع کرنا اور امریکا کے سامنے اپنے آپ کو خطے کی بڑی طاقت کے طور پر پیش کرنا ضروری تھا۔ جس میں روس کو کامیابی ملی اور روس ایک بڑی طاقت کے طور پر سامنے آیا، شام میں جنگ بندی کے لیے حالیہ انٹرنیشنل کانفرنسوں میں بھی روس کا کردار امریکا سے کہیں بڑھ کر تھا۔

5: شام کی گرتی ہوئی اقتصادی صورتحال کو کنٹرول میں لانا، یہ مقصد روس سے زیادہ شام کا تھا جو کہ حاصل نہیں ہو سکا، بلکہ روس کی آمد کے بعد شام کی معیشت مزید ابتری کا شکار ہوئی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 30 ستمبر 2015 کو جب روس نے شام میں عسکری کاروائیاں شروع کیں تو شامی لیرہ کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں 330 لیرہ تھی جو کہ دو ماہ بعد نومبر کے آخر میں 390 لیرہ تک پہنچ گئی تھی، 2016 میں لیرہ کی قیمت اور بھی تیزی سے گری اور 15 مارچ کو روسی فوج کے انخلاء کے دن 460 لیرہ تک پہنچ گئی۔

6: روس کا ایک مقصد اپنی جنگی مہارت کو پرکھنا بھی تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ روسی فضائیہ اپنی سرزمین سے باہر کسی جنگ میں شریک ہوئی، روس کو شامی عوام پر اپنے جدید اسلحہ کا عملی تجربہ کرنے کا موقع بھی ملا۔

اسی منظر نامے میں روس کی ایران اور چین کے ساتھ بڑھتی ہوئی قربت کو بھی دیکھا جا سکتا ہے، روس کے سیاسی حلقوں نے بھی کھل کر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ایران کے بغیر روس کی شام میں مداخلت ممکن نہیں تھی، دوسری طرف روس اور چین کے درمیان طے پانے والے شنگھائی معاہدے کا مشترکہ مقصد بھی نیٹو اور مغرب کا مقابلہ کرنا ہے، اسی ضمن میں روسی بحریہ اور شامی بحریہ کی بحر متوسط میں جنگی مشقیں بھی عمل میں آئیں۔ روسی مفکر الیگزینڈر ڈوگین کے مطابق شامی حکومت کو سہارا دینا روس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے کیونکہ شام کے سقوط کا مطلب یہ ہو گا کہ ایران کے سقوط کا مرحلہ شروع ہو گیا جس سے نیٹو روس کی گردن اور چین کے کندھے پر پہنچ جائے گا۔[1]

[1] حسام ہرہوری، تصورات الاحزاب المغربیہ للاصلاح السوری، 27۔

"روس کا ایک اور اہم مقصد ترکی کو شامی اپوزیشن کی حمایت سے دور رکھنا بھی تھا، کیونکہ یہ ترکی ہی تھا جس کی حمایت نے اسدی فوج کو نڈھال کر دیا تھا اور قریب تھا کہ شامی فوج سرنڈر کر دے اور مذاکرات پر آمادہ ہو جائے، ایسی صورت میں شامی حکومت ایک کمزور فریق کی حیثیت سے سامنے آتی اور نتیجہ بھی اس کے خلاف جاتا، عین اسی وقت موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے روسی فوج میدان میں آگئی، جس نے ایک طرف ترکی کی حمایت یافتہ قوتوں کو نشانہ بنایا تو دوسری طرف ترکی کو دفاعی پوزیشن پر لانے کے لیے ترک سرحد کے قریب شامی کردوں کو بھڑکایا اور انہیں اسلحہ سے لیس کر کے خود ان کی فضائی نگرانی شروع کر دی، ترکی نے زچ ہو کر تنگ آمد بہ جنگ آمد کا مصداق روسی طیارے کو مار گرایا جس کا ترکی پر منفی اثر پڑا، ترکی جو کہ نیٹو میں ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا اسے دوبارہ امریکا اور نیٹو کی چھتری تلے پناہ لینی پڑی، اور پھر ترکی روسی فضائیہ کی زیر نگرانی بڑھتی ہوئی افواج کے لیے خاطر خواہ رکاوٹ نہیں پیدا کر سکا۔"[1]

خلیجی طاقتوں کی رسہ کشی:

2011 میں برپا ہونے والی "عرب بہار" سے پہلے شام کے عوام شدید قحط کا شکار تھے۔ تقریباً پندرہ لاکھ لوگ دیہاتوں سے نکل کر شہروں کی طرف آئے جس سے ان شہری علاقوں میں غربت اور سماجی بے چینی میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ "عرب بہار" کی حمایت میں ہونے والے کسی بھی قسم کے مذہبی جنونیت کا شکار نہ تھے لیکن اس کے بعد بشار الاسد کے حمایتیوں اور باغیوں کے درمیان ہونے والی خانہ جنگی مسلکی بنیادوں پر لڑی جا رہی ہے۔ باغی فوجیوں کی اکثریت کا تعلق "سنی مسلک" سے ہے جب کہ بشار الاسد اور اس کے حمایتیوں کا تعلق "علوی مسلک" سے ہے۔

شام میں ہونے والے فساد اور خانہ جنگی میں اس کے ہمسائیوں نے بھی اپنا بھرپور حصہ ڈالا ہے۔ ایک طرف بشار الاسد کی حمایت میں ایران، عراق کی حکومتیں اور لبنان کا مذہبی گروہ حزب اللہ سرگرداں ہیں تو دوسری طرف باغیوں کی مدد کے لئے ترکی، قطر اور سعودی عرب موجود ہیں۔ اپنے اپنے گروپوں کی حمایت کی خاطر پہلے اس جنگ میں امریکہ اور بعد میں روس بھی شامل ہو گئے۔[2] اس طرح ایک ملکی مسئلہ عالمی طاقتوں کی پراکسی جنگ میں تبدیل ہو گیا۔

" 2013 میں امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے صدر بشار الاسد کی باغیوں کی تربیت پر پانچ سو ملین ڈالر خرچ کئے۔ 2015 میں روس اس جنگ میں شامل ہوا اور اس کے فوجی طیاروں نے داعش اور اسد مخالفین کے ٹھکانوں کو نشانہ

---

[1] حسام ہرہوری، تصورات الاحزاب المغربیہ للاصلاح السوری، 91

[2] Rees Erlich, Inside Syria: The Backstory of Civil War (London, Prometheous Books, 2017), 246.

بنایا۔ روس نے صدر بشار الاسد کی حفاظت کے لئے اپنی سیکورٹی بھی مہیا کی۔ 2016 سے ترکی کی فوج داعش اور کرد مخالفین کو کچلنے کے نام پر شام کے کئی علاقوں میں مداخلت کر رہی ہے۔ ترکی کے علاوہ اسرائیلین ائیر فورس حزب اللہ کے ٹھکانے تباہ کرنے کے نام پر شام میں بمباری کر رہی ہے۔ 2017 میں شام کو کیمیائی ہتھیاروں سے روکنے کے نام پر امریکی ٹام ہاک میزائیلوں نے شام کی کئی فوجی تنصیبات کو نقصان پہنچایا"۔ (1)

شام میں جاری خانہ جنگی کو ختم کرانے اور امن قائم کرنے کی خاطر کئی کوششیں کی گئیں۔ جنیوا، آستانہ اور سوچی میں کئی بار مذاکرات کا ڈول ڈالا گیا لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

[1] Legal implications of armed conflict in Syria, (Harmoon Center for Contemporary Studies, 2016), 17.

باب چہارم

مسلم امہ پر اثرات

فصل اول   مسلکی اختلافات میں شدت

فصل دوم   معاشی اثرات

فصل سوم   نظریاتی و فکری اثرات

فصل چہارم   اسلام کو دہشت گردی کے ساتھ جوڑنے کی کوشش

فصل اول

مسلکی اختلافات میں شدت

مسلکی اختلافات اور اسلام

حالیہ شامی بحران کی جہاں بہت سارے مثبت اثرات اسلامی دنیا پر مرتب ہو رہے ہیں وہیں ان بحران کے اسلامی دنیا پر منفی اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ جو کہ بحثیت مجموعی اسلام اور عالم اسلام کے لیے نہایت نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ حالیہ شامی بحران کے نتیجے میں امت مسلمہ کا اتحاد خطرات سے دوچار نظر آتا ہے۔ حالانکہ امت مسلمہ کا اتحاد اسلام کی سربلندی اور ترقی کی ضمانت دیتا ہے۔ اور قرآن و حدیث میں "اتحاد امت" پر بہت زور دیا گیا ہے۔ حالیہ شامی بحران کے نتیجے میں "اتحاد امت" کے لیے خطرات کو جاننے سے پہلے قرآن و حدیث کی روشنی میں "اتحاد امت" کی اہمیت بیان کی جائے گی۔

"اتحاد امت" کی اہمیت قرآن کریم کی روشنی میں

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں "اتحاد امت" پر زور دیا ہے چنانچہ اسی سلسلے میں ارشاد ربانی ہے کہ

(یاایھا الذین آمنوا اتقو اللہ حق تقاتہ و لا تموتنّ الا و انتم مسلمون۔ و اعتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لا تفرقوا) [(1)]

ترجمہ: اے ایمان والو ڈرو اللہ سے جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو، اور تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں جدا نہ ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے ان دو آیات میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اصول بیان فرمائے ہیں۔

پہلا اصول: تقویٰ اور پرہیز گاری

مولانا مفتی محمد شفیعؒ تقویٰ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تقویٰ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے یعنی اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے بچنے کا مکمل اہتمام جو اللہ تعالیٰ کے حق کے مطابق ہو۔

---

[1] آل عمران، 3/102-103

دوسرا اصول: باہمی اتفاق

لوگوں کا باہمی اتفاق و اتحاد ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود و مطلوب ہونے پر دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی ملک اور زمانہ کے ہوں، کسی مذہب و مشرب سے تعلق رکھتے ہوں سب کا اتفاق ہے اس میں دو راہیں ہونے کا امکان ہی نہیں دنیا میں شاید کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ نکلے جو لڑائی جھگڑے کو بذاتہ مفید اور بہتر جانتا ہو، اس لیے دنیا کی ہر جماعت، ہر پارٹی لوگوں کو متفق کرنے کی دعوت دیتی ہیں، لیکن دنیا کی حالات کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اتفاق کے مفید اور ضروری ہونے پر سب کے اتفاق کے باوجود ہو یہ رہا ہے کہ انسانیت فرقوں گروہوں، پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے، پھر ہر فرقے کے اندر فرقے اور پارٹی کے اندر پارٹیوں کا لا محدود سلسلہ ایسا ہے کہ صحیح معنیٰ میں دو آدمیوں کا اتحاد و اتفاق بھی ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے، غور کیا جائے تو اس کا سبب یہ معلوم ہو گا کہ ہر گروہ و ہر فرقہ اور ہر شخص لوگوں کو اپنے خود ساختہ پروگرام پر متحد و متفق کرنا چاہتا ہے۔ اور جب کہ دوسرے لوگ خود اپنا بنایا ہوا کوئی نظام و پروگرام رکھتے ہوں تو وہ ان سے متفق ہونے کے بجائے ان کو اپنے پروگرام پر متفق ہونے کی دعوت دیتے ہیں، اس لیے لازمی طور پر ہر دعوت اتحاد کا نتیجہ افراد میں باہمی افتراق و انتشار ہی نکلتا ہے، ان آیات میں صرف اتحاد و اتفاق اور تنظیم و اجتماع کا وعظ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کی حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا ایک ایسا عادلانہ اصول بھی بتلادیا جس کے ماننے سے کسی گروہ کو اختلاف نہیں ہو سکتا اور وہ نظام اور پروگرام قرآن کریم ہے اور یہی ایک ایسا نظام حیات ہے جو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے لیا ہے۔ اس لیے قیامت تک اس میں کسی قسم کی تحریف و تفسیر کا بھی امکان نہیں اس لیے اگر مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں قرآن کریم کے نظم پر متفق ہو جائیں تو ہزاروں گروہی و نسلی اور وطنی اختلافات ایک لحظہ میں ختم ہو سکتے ہیں جو انسانیت کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، اور قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس افتراق کو مٹانے کا نسخہ اکسیر اس طرح بتلایا کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو، اور اس رسی سے مراد قرآن کریم ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(کتاب اللہ ھو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض)

"یعنی کتاب اللہ، اللہ تعالیٰ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے"

حاصل یہ کہ قرآن کریم کے اس ایک جملہ میں حکیمانہ اصول بتلائے گئے

ایک یہ کہ ہر انسان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات یعنی قرآن کریم پر مضبوطی سے عامل ہو،

دوسرا یہ کہ سب مسلمان مل کر اس پر عمل کریں جس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ مسلمان سب باہم متفق و متحد اور منظم ہو جائیں گے۔اس لیے قرآن کریم نے مرکز وحدت حبل اللہ یعنی (قرآن کریم) اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کو بنایا جس کا اختیار کرنا اختیاری امر ہے کوئی مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، گورا ہو یا کالا، عربی زبان بولتا ہو یا ہندی و انگریزی، کسی قبیلہ کسی خاندان کا ہو ہر شخص اس معقول اور صحیح مرکز وحدت کا اختیار کر سکتا ہے اور دنیا بھر کے پورے انسان اس مرکز وحدت پر جمع ہو کر بھائی بھائی بن سکتے ہیں، قرآن کریم کی یہ آیت ہر وقت اور ہر جگہ مسلمانوں کو باآواز بلند یہ دعوت دے رہی ہے کہ یہ جاہلانہ امتیازات اور ان کی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت کوئی معقول وحدت نہیں اس لیے اعتصام بحبل اللہ کی وحدت اختیار کریں جس نے ان کو پہلے بھی ساری دنیا میں غالب اور فائق اور سر بلند بنایا اور اگر پھر ان کی قسمت میں کوئی خیر مقدر ہے تو وہ اسی راستہ سے مل سکتی ہے۔[1]

پیر محمد کریم شاہ الازہری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔زندگی کی اس رزم گاہ حیات میں جہاں شکست و ریخت، تعمیر و تخریب اور فنا و بقا کا ایک نہ ختم ہونے والا چکر چل رہا ہے کوئی قوم عزت و وقار سے زندہ و سلامت نہیں رہ سکتی جب تک اس کے افراد میں اتفاق و اتحاد نہ ہو، اور اتحاد پائندہ و پائیدار نہیں ہو سکتا جب تک محکم اور حقیقی بنیادوں پر اس کی عمارت نہ تعمیر کی گئی ہو۔امت مسلمہ جو کہ دولت رشد و ہدایت کی امین اور رحمت خداوندی کی قاسم بنا کر بھیجی گئی ہے۔جسے ہر باطل سے ٹکرانا ہے اور ٹکرا کر اسے پاش پاش کرنا ہے، جسے قلب و نظر کے سارے صنم کدے مسمار کرنے ہیں جسے ہر دل کو بیت اللہ اور ہر نگاہ کو اس کا شناسا بنا ناہے اس قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے لیے نہ سہی اپنے بلند اور پاکیزہ مقاصد کے لیے زندہ رہے اور عزت و وقار سے زندہ رہے تاکہ اس کی آواز سنی جائے اور مانی جائے اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کے افراد میں اتفاق و اتحاد ہو اور وہ اتفاق و اتحاد سطحی نہ ہو جسے کوئی تند و تیز بہا کر لے جا سکے بلکہ حقیقی اور پائیدار ہو۔اس لیے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متحد ہونے کا بھی حکم دیا اور ان کے لیے وہ مستحکم بنیاد مقرر فرمائی جس سے محکم تر کوئی اور بنیاد نہیں ہو سکتی۔وہ قرآن کریم ہے قرآن کریم پر عمل کرنے کے لیے

[1] مولانا مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ص۔2/122-123 ط، ربی بک ڈپو دھلی، 1996

اس کا صحیح سمجھنا ضروری ہے اور اس کی صحیح سمجھ اس ذات اقدس و اطہر کے بیان اور تفسیر کے بغیر ناممکن ہے جسے قرآن نازل کرنے والے خدا نے بھیجا ہی قرآن کو صحیح صحیح سمجھانے کے لیے تھا۔رحمت عالم ﷺ کی تشریف آوری سے قبل عرب کے جزیرہ نما کی کیا حالت تھی وہ آپس میں انس و محبت اور شفقت و رحمت کرنے والے انسانوں کا ملک نہیں تھا بلکہ ایک کوہ آتش فشاں تھا جس سے ہر لحظہ اور ہر لمحہ بغض و عناد کی آگ برستی رہتی تھی اور دور دور تک آبادیاں جل کر خاکستر ہو جایا کرتی تھیں۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے بر سرِ پیکار تھا۔ہر علاقہ دوسرے علاقہ سے جنگ آزما رہا تھا جذبات اتنے مشتعل اور بے قابو تھے کہ ذرا ذرا سی بات پرخون کی ندیاں بہہ جایا کرتی تھیں۔۔ایک بار اگرجنگ کی آگ سلگ پڑتی تو صدیوں تک اس کے شعلے بھڑکتے رہتے تھے اوس اور خرج میں لڑائی کا سلسلہ ایک سو بیس سال تک جاری رہا کسی کی جان کسی کا مال محفوظ نہ تھا یہاں تک کہ اسلام کا بادل آیا اور رحمت خداوندی بن کر برسا۔ حضور سراپا نور و سرور کا ظہور ہوا تو عرب کے اجڑے دیار میں بہار آگئی۔عداوت کی جگہ محبت نے، وحشت کی جگہ انس نے، انتقام کی جگہ عفو نے، خود غرضی کی جگہ اخلاص و ایثار نے اور غرور و تکبر کی جگہ تواضع و انکسار نے لے لی۔یہ وہ انقلاب تھا جس نے عرب کی کایا پلٹ دی جس کی برکت سے عرب صحرا نشینوں نے تاریخ عالم کا رخ موڑ دیا۔اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے اسی احسان عظیم کی یاد تازہ کرا رہا ہے کہ کس طرح اس نے اپنے محبوب کریم ﷺ کی برکت اور فیض نگاہ سے تمہارے ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیئے اور تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ذلت و رسوائی کی پستیوں سے نکال کر ترقی و عزت کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔تم دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے۔بس آنکھ بند کرنے کی دیر تھی اور تم اس گڑھے میں گر پڑتے لیکن رحمت الٰہی نے تمہاری دستگیری کی اور تمہیں آتش جہنم میں گرنے سے بچالیا ان احسانات کو یاد کرو اور یاد رکھو۔اور اسلام کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہواور اپنی صفوں میں انتشار کو جگہ نہ دو۔[1]

علامہ قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اعتقاد اور عملاً کتاب و سنت کی رسی مضبوطی سے پکڑ لیں۔ہمارے اتحاد کا صرف یہی سبب ہے اور صرف اسی طرح اتفاق و اتحاد کی نعمت میسر آ سکتی ہے جس سے ہمارے دین و دنیا کے حالات سنور سکتے ہیں۔

[1] پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، ص۔1/ 208-209ط ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور، ایڈیشن پنجم۔1402ھ

۴) (واطیعو اللہ و رسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین)[1]

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور تم آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور تم صبر کرو بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم فرما رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ باہمی اختلاف اور انتشار سے بچنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔ کیونکہ باہمی اختلافات کے باعث امت محمدیہ ﷺ کی ہوا اکھڑ جائے گی اور اس کا رعب و دبدبہ ختم ہو جائے گا اور دنیا میں عزت و وقار سے زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا لہٰذا امت مسلمہ تمام قسم کے عناد و تعصبات کو بھلا کر آپس میں باہم متحد ہو کر رہیں کیونکہ اتحاد میں ہی خیر و برکت ہے اور اللہ تعالیٰ کی معیت بھی باہم ساتھ رہنے میں ہے۔

۵) اسی طرح ایک اور جگہ پر فرمایا:۔

(ان الّذین فرّقوا دینھم و کانوا شیعا لّست منھم فی شیءٍ)[2]

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور وہ کئی گروہ میں بٹ گئے (اے محمد ﷺ) آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دینی امور میں اپنی خواہشات کی پیروی اہل ایمان کو اختلاف و انتشار کا شکار کر دے گی اور باہمی اتحاد و یکجہتی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ پیر کرم شاہ الازہریؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "اس سے پہلے دین کی غیر متبدل اصولوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: **وان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ**۔ یہ ہے میرا راستہ اس کی پیروی کرو، اور اپنی خواہشات کی پیروی نہ کرو، ورنہ تمہاری یکجہتی ختم ہو جائے گی تمہارا شیرازہ منتشر ہو جائے گا، اب اس آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے جو اپنی پسندی کے باعث دین کو وحدت کا پارہ پارہ کرنے میں کوشاں ہیں انہیں صاف صاف بتا دیا کہ ان سے اللہ کا رسول ﷺ بری ہے اور اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں، اور جن کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کا کوئی تعلق نہ ہو ان کا اسلام سے کیا تعلق باقی رہے گا۔[3]

---

[1] سورۃ الانفال، 8/46

[2] سورۃ الانعام، 6/159

[3] ضیاء القرآن، ج۔1، ص۔618

اتحاد امت کی اہمیت احادیث مبارکہ کی روشنی میں

1۔ حضرت ابو ہریرہؓ آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں

(قال رسول ﷺ من خرج من الطاعة و فارق الجماعة فمات میتة جاهلیة)(1)

ترجمہ:۔سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص اپنے امیر کی اطاعت سے نکلتا ہے اور جماعت سے جدا ہو جاتا ہے اوراسی حال میں فوت ہو جائے تو وہ گمراہی و ضلالت کی حالت میں فوت ہوا۔

تشریح:۔اس روایت کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں کامیابی و کامرانی کا دارومدار افراد امت کی وحدت میں مضمر ہے اختلاف و انتشار میں نہیں، بلکہ اختلافات کے انجام اور نقصانات سے آگاہ فرمایا کہ جو بھی امت کا فرد اپنے سربراہ کی اطاعت سے نکل جاتا ہے اور جماعت سے الگ ہو جاتا ہے اور اسی حال میں اسے موت آ جاتی ہے تو وہ گمراہی کی حالت میں فوت ہوا، اس لیے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے امیر اور سربراہ کی اطاعت میں رہے اور جماعت کے ساتھ جڑا رہے۔

2۔ قال رسول اللہ ﷺ: ید اللہ علی الجماعة و من شذ شُذ فی النار۔(2)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہوتا ہے اور جو جماعت سے الگ ہو گیا وہ جہنم میں گرا دیا گیا۔

تشریح:۔ اس حدیث مبارکہ میں رسول کریم ﷺ نے واضح الفاظ میں افتراق اور اختلاف سے منع فرمایا ہے اور جماعت و وحدت کی اہمیت بیان فرمایا ہے۔گویا امت مسلمہ باہمی اتحاد و یگانگت کے باعث اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتوں کے سائے میں رہتی ہے ان کیفیات میں اللہ تعالیٰ ان پر اپنی خصوصی نوازات اور مہربانیوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔تو وہ دنیوی اور اخروی زندگی میں کامیاب و کامران ہو جاتے ہیں اور جو افراد جماعت سے الگ ہو جاتے ہیں اور افتراق و تعصبات کو ہوا دیتے ہیں امت کے سکون کو برباد کر دیتے ہیں، ان کا یہ گھناؤنا کردار انہیں جہنم کی دہکتی آگ میں ڈال دیتا ہے۔

---

[1] الامام ابو الحسین مسلم بن حجاج، صحیح مسلم کتاب الامارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین عند ظهور الفتن، حدیث نمبر 1848، ج3، ص1476

[2] علاؤالدین علی متقی، کنزل العمال فی سنن الاقوال، باب فی اعتصام بالکتاب والسنة، ص۔ 1/ 406

3۔ (قال رسول اللہ ﷺ ایّما رجل خرج یفرق بین امتی فاضربو اعنقه)[1]

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بھی شخص اس نیت سے نکلے کہ وہ میری امت میں فتنہ و فساد اور تفرقہ پیدا کرے تو تم اس کی گردن اڑادو۔

تشریح:۔اس حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ کے فرمان کی تفصیل یہ ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ سے اخوت، بھائی چارے کے داعی اعظم تھے اور آپ کی تعلیمات آج بھی لوگوں کو اخوت و محبت کے زیور سے آراستہ کر سکتی ہیں، اس کے برعکس تعصب و اختلافات کو آپ ﷺ سخت ناپسند فرماتے تھے اور جو شخص اس جرم شنیع کا مرتکب پایا جائے اس کی سزا قتل تجویز فرمائی یعنی جو شخص جماعت سے بغاوت کرتے ہوئے امت کی وحدت پارہ پارہ کرتا ہے اس کا سدباب لازم ہے۔

4۔ (قال رسول اللہ ﷺ المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضاو شبک بین اصابعه)[2]

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لیے ایک عمارت کی مانند ہے جس ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے اور آپ ﷺ نے اپنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل فرما کر وحدت کا اظہار فرمایا۔

تشریح:۔اس حدیث طیبہ میں آپ ﷺ نے ملی وحدت کی اہمیت و افادیت کا اظہار فرمایا اور امت کو ایک مستحکم عمارت سے تشبیہ دیتے ہوئے واضح فرمایا کہ امت کا ہر فرد ایک مقام اور حیثیت رکھتا ہے۔جس طرح عمارت کی ایک اینٹ دوسرے اینٹ سے متصل اور ملی ہوئی ہو تو عمارت کا استحکام ممکن ہے اسی طرح امت محمدیہ ﷺ کا ہر فرد عمارت کی اینٹ کی طرح ہے کہ ہر فرد کا دوسرے افراد کے ساتھ متصل و مربوط ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ عمارت کی ہر ہر اینٹ کا دوسری اینٹوں سے اور آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل فرمائیں اور بھینچ کر فرمایا کہ امت کا ہر فرد دوسرے افراد سے اس طرح گھل مل کر رہے اور تمام قسم کے اختلافات و انتشار کو ختم کر کے باہم متحد ہو جائے۔

عن ابی ذر قال، قال رسول اللہ ﷺ: من فارق الجماعة قید شبر فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه۔[3]

ترجمہ:۔ حضرت ابو ذرؓ سے مروی ہے کہ جو شخص ایک بالشت جتنا بھی مسلم جماعت سے علیٰحدہ ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار دیا۔

---

[1] علاؤالدین علی متقی، کنزل العمال فی سنن الاقوال، باب فی اعتصام بالکتاب والسنۃ، ص۔1/406

[2] الامام عبدالرحمن احمد بن شعیب النسائی، سنن النسائی، باب قتل من فارق الجماعۃ، ج7، ص۔1999

[3] الامام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ، سنن ترمذی، باب شفقۃ المسلم علی المسلم، ج۔4، ص۔352

تشریح:۔اس حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے اپنی امت کو اختلاف و انتشار سے منع فرمایا ہے اور باہمی اتفاق و اتحاد کی تلقین فرمائی ہے۔امت کا بقاء اسی میں ہے کہ اس کے تمام افراد باہم متحد و متفق رہیں اور اسی وحدت کو قائم رکھنے کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کرتے رہیں تاکہ امت کی جمعیت باقی رہے۔لیکن امت کا جو فرد بھی اس وحدت کو قائم نہیں رکھے گا اور وہ امت میں فتنہ و فساد کا باعث بنے گا تعصبات پھیلائے گا تو وہ امت سے خارج تصور کیا جائے گا اس حدیث میں سخت وعید ہے ان لوگوں کے لیے جو اس قسم کے گھناؤنے افعال میں شریک ہیں اور امت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں پیش پیش ہیں۔

مسلکی اختلافات کو ابھارنے کا ذمہ دار:

عرب بہار کے بعد شام بحران کے جہاں داخلی وخارجی سطح پر متنوع اثرات رونما ہوئے وہیں یہ چیز بھی سامنے آئی اس سرزمین سے اٹھنے والے مسلکی اختلافات اور فرقہ واریت کے شراروں نے مسلم امہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ایسا ممکن نہ ہوتا اگر شام بحران کی جڑوں میں ہی مسلکی وفرقہ وارانہ اختلافات کو نہ سینچا گیا ہوتا۔30مارچ 2011ء کو جب بشارالاسد عوام سے خطاب کرنے ٹی وی پر آیا تو اس نے کہا تھا کہ "یہ ایک فرقہ وارانہ فتنہ ہے۔"[1]

اس نے اپنے خطاب میں متعدد بار اس اصطلاح کا استعمال کیا۔اس کا مقصد یہ تھا کہ عوامی وشہری اساس پر سامنے آنے والے مظاہروں کو حقوق کی آواز قرار دینے کی بجائے اسے مسلکی اختلاف اور فرقہ واریت کے عفریت سے تعبیر کیا جانا بہتر ہو گا۔کیونکہ حقوق کے نام پر ہونے والے احتجاج کا مطلب یہ تھا کہ عوام آمریت کے استحصال کے خلاف کھڑے ہوئے ہیں اور یہ نظام تبدیل ہونا چاہیے۔یہ ایک جائز مطالبہ ہے جسے ساری دنیا تسلیم کرتی ہے۔تاہم بشارالاسد نے اسے حقوق اور شہریت کی آواز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ملک کے اندر دبی ہوئی مسلکی اختلاف و فرقہ واریت کی آگ کو ہوا دیتے ہوئے عوام کو ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑا کرنے کی کوشش کی۔[2]

---

[1] Sectarianism and Sectarian System in Syria, (Arab Center for Research and Policy Studies, 2018), 33.

[2] Legal implications of armed conflict in Syria, (Harmoon Center for Contemporary Studies, 2016), 17.

شامی صدر کی طرف سے جو مسلکی اختلاف کی شدت کو بڑھاوا دیا جاتا رہا۔ اس سے یہ تاثر ملا کہ کہ حکومت اپنے دعوے کے برعکس قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے پر تلی ہے اور اس کا مقصد اس سیاسی نظم کو بچانا ہے، چاہے اس کی قیمت خانہ جنگی کی صورت میں ہی کیوں نہ نکلے۔

عزمی بشارہ کے مطابق "بشارالاسد کو اس بات کا پوری طرح ادراک تھا کہ اس کے خاندان کا قائم کردہ نظام ہی مسلکی اختلاف اور فرقہ واریت کی اساس پر قائم ہے۔ کیونکہ حافظ الاسد اور بعد میں بشار الاسد نے نظام کی جڑوں میں علوی فرقے کے افراد کو متعین کر رکھا تھا جن پر وہ زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ اس کے برخلاف سنی اکثریت آبادی کے نمائندوں کو اہم معاملات اور نمایاں عہدوں سے دور رکھا جاتا تھا۔ لہٰذا اکثریت آبادی رکھنے والے اس طبقے کے اندر کہیں نہ کہیں یہ احساس موجود تھا کہ ایک خاص فرقہ انہیں دبا کر رکھتا ہے اور ان کے حقوق کا استحصال کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس لیے عرب بہار کے شروع ہونے کے بعد جب شام کا بحران پیچیدہ ہونے لگا اور بشار کی حکومت خطرہ لاحق ہوا تو اسے اس بات کا قوی شعور تھا کہ اگر یہ انقلاب کامیاب ہوتا ہے تو استبدادیت کے حامل ایک طبقے کو کٹہرے میں لایا جائے گا۔ اس لیے اس نے اپنے اقتدار اور نظام کو سہارا دینے کے لیے ان پڑوسی ممالک کے تعاون کو بھی حاصل کیا جو اس کے مسلک کی جانب میلان رکھتے تھے۔"[1] اور شامی حکومت کی طرف سے مسلسل یہ کہا جاتا رہا کہ یہ انقلاب شہری وانسانی حقوق کے لیے نہیں ہے بلکہ فرقہ وارانہ ہے۔ یوں یہ آگ سرکاری سرپرستی میں پھیلتی چلی گئی اور سب سے پہلے پڑوسی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لیا۔[2] اس کے بعد پوری مسلم دنیا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

مسلکی اختلافات اور شامی مظاہرین کا کردار:

بحران کی ابتداء میں عوام کے اندر مسلکی اختلافات کی شدت نہیں تھی۔ جو مظاہرے ہوئے ان میں شیعہ سنی دونوں شریک تھے۔ ان میں مذہبی، لبرل اور سوشلسٹ ہر طرح کے افراد حصہ تھے۔ جب بشار الاسد نے ان مظاہروں کو فرقہ وارانہ کہا تو اس کے جواب میں مظاہرین کے نمائندگان کی جانب سے اس کی تردید کی گئی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ ان کے شہری حقوق کے لیے ہونے والے احتجاج کو فرقہ وارانہ نہ کہا جائے۔ "اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ شروع میں مظاہرین نے سیاسی نظام میں اصلاحات کی بات کی تھی اور اس میں صدر بشار الاسد کو اس کے عہدے سے ہٹانے کا

---

[1] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات، 140۔

[2] سابقہ مرجع، 149۔

مطالبہ شامل نہیں تھا۔ بلکہ اس سے یہ تقاضا کیا جارہا تھا کہ ماضی میں کیے گئے وعدوں کے مطابق ملک میں اصلاحات متعارف کرائی جائیں اور آزادی اظہار پر قدغن کو ختم کیا جائے"۔[1]

مسلم دنیا کا ردعمل:

ملک کے اندر اور نتیجتاً اس سے باہر مسلکی اختلافات کو ہوا دینے میں جہاں شامی حکومت نے کردار ادا کیا وہیں اس کے بعد ساری مسلم دنیا میں بھی بعض شخصیات نے اس ناہمواریت اور عوام کی حکومت کے ساتھ مڈ بھیڑ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی۔ ان میں بعض ایسے افراد بھی تھے جو شام سے باہر انقلاب کی رہنمائی کر رہے تھے۔ یا اس کی نمائندگی کے دعویدار کے طور پہ سامنے آئے تھے۔ اگرچہ ان کی طرف سے اس طرح کی بیان بازی کا سبب ملک کے اندر کی صورتحال اور پڑوسی ممالک کا مسلکی بنیادوں پر شامی حکومت کی حمایت اور عوام کے خلاف کھڑا ہونا تھا۔ مثال کے طور پہ مامون الحمصی شامی انقلاب کی نمائندہ شخصیت تھے اور شام سے باہر تھے۔ انہوں نے ٹی وی پر مسلسل شامی نظام کو علوی اور شیعی نظام کہا۔[2] اس کی وجہ سے بھی رفتہ رفتہ شامی بحران فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرتا گیا۔ بعض مفکرین کے مطابق اس میں ایک کردار میڈیا کا بھی رہا ہے۔ شام سے باہر کا میڈیا بھی چاہے وہ سنی طبقات کا ہو یا شیعہ گروہوں کا، دونوں کی جانب سے شام کی صورتحال کو منفی تاثر دیا جاتا رہا۔ پاکستان سمیت عرب دنیا کے میڈیا میں بعض حلقے اس کو شیعہ سنی لڑائی قرار دے رہے تھے۔[3] خلیجی ممالک اور عرب دنیا میں شیخ عدنان العرور کا شمار صف اول کی علمی شخصیات میں ہوتا ہے اور ان کا دائرہ اثر بھی بہت وسیع ہے۔ انہوں نے شروع سے ہی صفا اور وصال ٹی وی پر اس انقلاب کو سنی اور شیعہ مسالک کی لڑائی قرار دیا اور عوام کے اندر یہ بات راسخ کرتے رہے کہ وہ اس بحران کو انسانی و شہری حقوق کے تناظر میں دیکھنے کی بجائے مسلکی دائروں میں پرکھیں۔[4]

مساجد کا کردار

شام کے معاملے میں داخلی اور خارجی دونوں سطح پر مسجد کا کردار بہت اہم رہا۔ مساجد اجتماع گاہ تھے۔ شام میں منعقد کیے جانے والے مظاہرے مساجد سے نکلتے تھے اور بالخصوص جمعہ کے بعد ان کی تنظیم انتہائی مؤثر ہوتی تھی۔ چونکہ شام کی اکثر آبادی سنی مسلک سے تعلق رکھنے والوں پر مشتمل ہے اس لیے منطقی طور پہ یہ ہوا کہ سنی مساجد مظاہروں کی تنظیم کے مراکز بن گئیں۔ اس کو دیکھتے ہوئے بشار حکومت نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ انقلاب فرقہ

---

[1] Sectarianism and Sectarian System in Syria,25

[2] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات، 31۔

[3] عروہ التاج، الاستقلال الثانی نحو مبادرۃ الاصلاح السیاسی فی العالم العربی، 150۔

[4] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 420۔

وارانہ ہے،اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کی تنظیم کے مراکز سنی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔جب حکومت نے ان مظاہروں کو کچلنا شروع کیا تو اس دوران مساجد کو بھی نشانہ بنایا جانے لگا۔[1] مسجد کی حرمت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اس چیز کو دیکھتے ہوئے بعد میں مظاہروں کی تنظیم کو مساجد سے ہٹا دیا گیا اور عوام احتجاج کے لیے دیگر مقامات کا رخ کرنے لگی۔[2] لیکن جو چنگاری بھڑکائی جا چکی تھی اسے بجھانا ممکن نہیں رہا تھا۔

اس کے بعد ایک خانہ جنگی کی صورت غالب آگئی۔ملک کے مختلف شہروں میں لوگ جتھوں کی صورت میں ایک دوسرے کی بستیوں کو نشانہ بنانے لگے۔بسوں کو روک کر لوگوں کو قتل کیا جانے لگا اور کاروبار تباہ کیے جانے لگے۔ان واقعات میں اضافے کے بعد اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کوفی عنان کے دباؤ اور شامی حکومت کے ساتھ مذاکرات کے بعد 25 مارچ 2012ء کو امن کا معاہدہ کیا گیا۔ اس کے بعد مسلکی بنیادوں پر وقوع پذیر ہونے والے پر تشدد واقعات میں کمی آگئی۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چلا۔25 مئی 2012ء کو الحولۃ نامی شہر میں فرقہ واریت کے نام پر قتل وغارت کا ایک بڑا واقعہ رونما ہوا جس میں ایک سو افراد مارے گئے تھے جو سنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔اس سے اگلے دن مختلف مقامات پر علوی خاندانوں کو نشانہ بنائے جانے کے واقعات رپورٹ ہوئے جس پر حکومت نے رد عمل دیتے ہوئے کہا کہ اس کے پیچھے القاعدہ تنظیم کا ہاتھ ہے۔[3] یہ پہلی دفعہ تھا کہ جب ملک کے اندر کے مسلکی بنیادوں پر رونما ہونے واقعات کا ذمہ دار کسی ایسی جہادی تنظیم کو قرار دیا گیا تھا۔

فرقہ ورانہ بنیادوں پر شروع ہونے والے قتل کا سلسلہ یہیں نہیں رکا بلکہ اس سے آگے بڑھتا چلا گیا اور خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ملک میں مقامی سطح کی کئی ایسی جہادی تنظیمیں وجود میں آگئیں جو ایک دوسرے کو مسلک کی بنیاد پر مار رہی تھیں۔ان تنظیموں کو صرف داخلی سطح پر ہی تعاون میسر نہیں تھا بلکہ انہیں باہر کے متعدد مسلم ممالک سہارا دے رہے تھے۔یا ان کے پیچھے مغربی قوتیں تھیں۔[4] تاہم ان کا کردار فرقہ وارانہ تھا۔

شام کے اندر جو مسلح تنظیمیں کام کر رہی تھی ان میں لڑنے والے افراد صرف شامی نہیں تھے بلکہ دیگر مسلم ممالک سے بھی ہجرت کر کے آئے تھے۔وہاں کوئی سنی خلافت کا نعرہ لگا رہا تھا تو کوئی شیعہ امامت کا۔اس سے یہ چیز واضح ہوئی کہ شام کے اندر بھڑکنے والی فرقہ واریت اور مسلکی اختلاف کی آگ صرف اسی ملک تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اس کی لپیٹ میں دیگر مسلم ملک بھی آگئے ہیں۔

---

[1] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ،390

[2] محمد المبارک، ترکیب المجتمع السوری،123۔

[3] سمیر قصیر، دیموقراطیۃ سوریا،113۔

[4] Sectarianism and Sectarian System in Syria,26

مثال کے طور پہ پاکستان میں یہ مسئلہ وقتاً فوقتاً اجاگر کیا جاتا رہا کہ یہاں شام میں لڑنے کے لیے نوجوان جارہے ہیں۔ یہ مسئلہ اگرچہ میڈیا میں اتنا زیادہ ہائی لائٹ نہیں ہوا لیکن ہلکی پھلکی رپورٹس پیش کی جاتی رہیں جن سے علم ہوا کہ یہاں سے لڑاکے شام منتقل ہورہے ہیں۔ اس کے علاوہ چند واقعات ایسے بھی رونما ہوئے جن سے پتہ چلا کہ شام میں لڑائی کے بعد واپس کچھ لوگ پاکستان آئے ہیں۔ [1] پاکستان سے شام کی طرف جانے والے نوجوانوں کا تعلق کسی ایک فرقے سے نہیں تھا بلکہ سنی اور شیعہ دونوں مسالک کے نوجوان وہاں جاتے رہے۔ اس لیے اس ریکروٹمنٹ پر دونوں خاموش رہے کیونکہ دونوں مسالک کے لوگ اس میں ملوث تھے۔ [2] اس کی واضح دلیل سوشل میڈیا کے وہ پیجز تھے جو اب بھی متحرک ہیں۔ ان میں سے بعض شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض کا تعلق سنی مسلک سے ہے۔

مسلم ممالک سے شام کی طرف ہجرت کرکے جانے والے نوجوانوں کی بڑی تعداد اور یہ منظرنامہ اس بات کو مزید عیاں کرتا ہے کہ کس طرح شام کے مسلکی اختلافات کے اثرات مسلم امہ کے اوپر پڑے ہیں اور دیگر مسلم ملک اس لڑائی کے براہ راست یا بالواسطہ حصہ دار بن گئے اور اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

شام کی فرقہ وارانہ لڑائی میں محض مسلم ممالک ہی حصہ دار نہیں تھے بلکہ مغربی ملکوں سے بھی مسلمان نوجوانوں نے بہت زیادہ حصہ لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شام کی مسلکی اختلاف کی شدت سے صرف مسلم جغرافیوں کے حامل ملک ہی متأثر نہیں ہوئے بلکہ مجموعی طور پہ ساری مسلم امہ پر اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ سال 2018ء سے پہلے تک آئے روز مغربی میڈیا میں انکشافات ہوتے تھے کہ ان کے شہری شام کے لئے نکلے ہیں اور وہاں لڑرہے ہیں۔ ان میں صنف کی کوئی تفریق نہیں تھی بلکہ مرد وخواتین دونوں نے اس خطے میں سفر کیے۔ [3]

مسلکی اختلافات کی اساس پر تشدد ایک صنعت کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ مسلم دنیا میں 80 اور 90 کی دہائی میں یہ فرقہ وارانہ تشدد اور منافرت بہت زیادہ محسوس کی گئی تھی لیکن کسی نہ کسی درجے میں اس پر قابو پالیا گیا تھا۔ اس کے بعد عراق پر امریکی حملہ ہوا تو اس کے بعد جب انتقال اقتدار کا مرحلہ آیا تو اس وقت بھی ملک کے اندر یہ تشدد دیکھنے کو ملا اور نچلی سطح پر اس کے اثرات مسلم دنیا میں بھی دیکھے گئے مگر یہ اتنے زیادہ نہیں تھے۔ [4] لیکن شام بحران سے جس طرح کی مسلکی رقابت اور اس کی بنیاد پر پر تشدد کاروائیاں ہوئیں اس کی مثال نہیں ملتی۔

---

[1] Sectarianism and Sectarian System in Syria,26

[2] ایلیا دسوقی، المقاومہ الاھلیہ فی سوریا، 156۔

[3] ادھم آل جندی، تاریخ الثورات السوریہ، 66۔

[4] سابقہ مرجع، 31۔

پاکستان سے اگرچہ مسلکی بنیادوں پر لڑائی کے لیے نوجوان شام کی طرف جاتے رہے ہیں لیکن یہاں عملی طور پہ اس کا اثر دیکھنے کو نہیں ملا۔ یہاں باہمی رقابت کے بیج پہلے سے موجود ہیں لیکن شام کے منظرنامے کے بعد جس طرح بعض دیگر مسلم ملک اس سے براہ راست متأثر ہوئے ایسا پاکستان میں نہیں ہوا۔ مثال کے طور پہ لبنان میں سنی اور شیعہ تنظیموں نے ایک دوسرے کے مسلک کو ملک کے اندر بھی بہت زیادہ نشانہ بنایا۔ طرابلس میں 2014ء کے دوران علویوں اور سنیوں کے مابین کئی جھڑپیں ہوئیں اور متعدد لوگ مارے گئے۔ اسی طرح بیروت میں حزب اللہ کے مرکزی دفتر کو جبھۃ النصرہ نامی شامی سنی تنظیم نے نشانہ بنایا اور اس کی عمارت کو شدید نقصان پہنچایا۔ کتائب عبداللہ عزام نامی تنظیم جو شام میں بھی فعال ہے اس نے 2016ء میں حزب اللہ کے اجتماعات پر حملے کیے۔ اسی طرح حزب اللہ جو کسی وقت میں ایک ایسی تنظیم سمجھی جاتی تھی جس کی سنی اور شیعہ دونوں حمایت کرتے تھے کیونکہ اس کا مقصد اسرائیل کے خلاف جہاد یا اس کی کاروائیوں کا جواب دینا تھا۔ لیکن شام بحران کے اثرات نے اس کی شبیہ بدل کر رکھ دی ہے۔[1] اب یہ ایک ایسی جماعت متصور کی جاتی ہے جو بشارالاسد یا ایرانی مذہبی اشرافیہ کے زیر تسلط کام کرتی ہے اور اس کا اولین ہدف اسرائیل کی بجائے اب سنی مسلک کے لوگ ہو چکے ہیں۔

شام بحران کے بعد لبنان ہی کے مثال میں حزب اللہ کے صدر حسن نصراللہ کے بیانات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے خلیج میں شیعہ سنی چپقلش کو ہوا دینے میں ذرا بھی تردد نہیں کیا۔ شامی بحران نے مسلم دنیا میں سب سے زیادہ براہ راست لبنان کو متأثر کیا ہے۔ جہاں وہ تمام تنظیمیں باقاعدہ موجود ہیں جو شام کے اندر ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔

ایک طرف جہاں شام کی طرف قتال کے لیے جانے والوں کی دلچسپی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں شام کی فرقہ واریت کے اثرات پہنچ چکے ہیں وہیں اس کے ساتھ یہ خدشہ بھی بڑھ گیا ہے کہ جب یہ لوگ رفتہ رفتہ اپنے ملکوں کی طرف واپس آئیں گے تو اس سے ان ممالک کے اندر بھی مسلح شدت پسندی بڑھے گی۔[2] واپس آنے والے لوگ نہ صرف شدت پسندی کی تربیت لے کر واپس آرہے ہیں بلکہ مسلح شدت پسندی کا حصہ بنے رہنے کی وجہ سے ان میں تجربہ اور اعتماد بھی زیادہ ہو چکا ہوگا۔ اس لیے شام میں مسلکی اختلافات کی اساس پر جاری لڑائی صرف اسی خطے تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس سے براہ راست دیگر مسلم ممالک بھی متأثر ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی مثال میں لبنان کو پیش کیا گیا ہے۔

---

[1] سیار الجمیل، تکوین العرب الحدیث، 113۔

[2] سیار الجمیل، تکوین العرب الحدیث، 142۔

مسلکی اختلافات سے فلسطین کا مسئلہ نظر انداز:

شامی بحران کے مسلکی اختلافات میں شدت اور امت مسلمہ میں اس کے اثرات کا ایک برا نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ مشرق وسطی میں سب سے بڑا مسئلہ فلسطین کا سمجھا جاتا تھا اور اس کے حقوق کے لیے جدوجہد کی جاتی تھی۔ یہ پالیسی بالکل واضح اور دوٹوک تھی۔ فلسطین واسرائیل کا قضیہ مشرق وسطی کا بنیادی قضیہ تھا مگر جب سے شامی بحران شروع ہوا اور مسلکی اختلافات نے شدت اختیار کی تو اس کے بعد سے یہ قضیہ منظر عام سے غائب ہو گیا۔[1] اس کے متبادل کے طور پہ دہشت گردی اور مشرق وسطی کا امن انتہائی اہمیت حاصل کر گیا۔ اسمیں فرقہ وارانہ کشیدگی نے بڑا کردار ادا کیا۔ صرف یہی نہیں کہ مشرق وسطی سے ہی فلسطین کا مسئلہ غائب ہوا بلکہ ساری مسلم دنیا میں اس کی حساسیت میں کمی واقع ہوئی۔ کیونکہ اس کی جگہ فرقہ ورانہ کشیدگی اور مسلکی اختلافات نے لے لی ہے۔

عرب بہار نے یوں تو متعدد ممالک کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا لیکن ان کا رخ وہ نہیں ہوا جو شام میں نظر آیا۔ شام میں خالص فرقہ وارانہ خانہ جنگی کی صورتحال بن گئی۔ مصر میں صدر حسنی مبارک کے خلاف جب مظاہرے ہوئے تو سمجھا جارہا تھا کہ اس نظام کی تبدیلی سب سے زیادہ مشکل ہوگی کیونکہ حسنی مبارک تیس سال سے مصر پر حکومت میں تھے اور اس سے قبل بھی آمریتیں رہی ہیں۔ وہاں فوجی طاقت اور ان کی اداروں پر گرفت بہت زیادہ مضبوط تھی۔ لیکن حسنی مبارک زیادہ دیر تک اقتدار میں نہ ٹھہر سکے اور استعفی دے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مقدمات کا سامنا بھی کیا۔ اسی طرح تیونس میں اقتدار کی تبدیلی زیادہ بھیانک نتائج لے کر نہیں آئی۔ لیبیا میں حالانکہ ابتداء سے خانہ جنگی شروع ہوگئی اور وہاں خلیجی ریاستوں سمیت مغربی ملکوں کی دخل اندازی بھی جاری ہے۔ وہی عالمی قوتیں جو شام میں موجود ہیں وہ لیبیا میں بھی فعال ہیں۔ لیکن وہاں خانہ جنگی کا رخ فرقہ وارانہ اور مسلکی نہیں ہوسکا۔ تاہم یمن میں صورتحال اب مسلکی اختلافات کی لپیٹ میں ہے۔ لیکن شروع میں یہ منظرنامہ نہیں تھا۔ یمن میں اب جو فرقہ وارانہ تشدد نظر آتا ہے وہ شام کے راستے سے آیا ہے اور اس کی شاخیں وہیں جا کے ملتی ہیں۔[2]

شام کے بحران کے بعد وہاں سے ہجرت کرنے والے شہری سینکڑوں کی تعداد میں پڑوسی ممالک میں منتقل ہوئے ہیں۔ یہ خیموں میں رہائش پذیر ہیں اور ایک سخت بے چین زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ میزبان حکومتوں کے پاس یہ بوجھ سنبھالنے کے لیے وسائل بہت زیادہ نہیں ہیں۔ بالخصوص موجودہ عالمی معاشی بحران کے بعد مہاجر شامیوں کی دیکھ بھال اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وسائل کی کمی ہے۔ ایسے موقع پر فرقہ وارانہ شدت پسند تنظیموں کے افراد ان خیموں میں رہنے والے لوگوں سے رابطہ کرتے ہیں اور انہیں اپنی صفوں میں شامل ہونے کے

---

[1] حمزہ المصطفی، المجال العام الافتراضی فی الثورۃ السوریہ، 65۔

[2] ایضاً، 65۔

بدلے مالی معاونت پیش کرتے ہیں۔ ایسی رپورٹس موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے مہاجر خیموں سے مختلف مسلح تنظیموں کی جانب سے بھرتیاں کی جاتی ہیں جو نہ صرف میزبان ممالک کے امن کے لیے خطرہ ہے بلکہ دیگر ملکوں میں بھی ان کے ذریعے بدامنی کو فروغ دیا جاتا ہے۔[1]

مسلکی اختلافات میں شدت کے حوالے سے جامعہ الازہر کے امام کی رائے

مصر کی جامعہ الازہر کے امام احمد الطیب جو کہ مسلمانوں میں ایک قابل قدر شخصیت مانی جاتی ہے انہوں نے نجی ٹیلی ویژن کو اپنے تازہ ترین انٹرویو میں مسلکی اختلافات میں شدت کے حوالے سے جو کہا اس کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

The Arab Spring revolutions are a western plot to "Destroy and divide muslim countries" west presented the clash of civilizations theory in order to provoke a clash with islamic civilization."[2]

"عرب بہار مسلمان ملکوں کو تقسیم اور تباہ کرنے کا مغربی سازش کا حصہ ہے۔ جس کا مقصد عام لوگوں کو اس بات پر ابھارنا ہے کہ وہ اسلامی سویلین کے ساتھ لڑیں"۔

جامعہ الازہر کے امام کا مزید کہنا تھا کہ

"اگر یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو امت مسلمہ بکھر جائے گی مسلمان ہی مسلمان کو خون بہا رہا ہے جلد سے جلد اس سلسلے کو روکنا ہو گا۔ اور اس کے پیچھے جو سازش امریکہ اور اس کے حواریوں نے کی ہے اس کو سمجھنا ہو گا۔"

موجودہ صورت حال میں علماء اور حکمران دونوں کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ اور انہیں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے عملی طور پر میدان میں آنا ہو گا۔ اور اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔ اسی انٹرویو میں مزید کہا کہ:۔

تمام شدت پسند تحریکوں کو تشدد سے گریز کرنا ہو گا اور ساتھ ہی بشار الاسد پر بھی زور دیا کہ وہ معصوم لوگوں کی جانوں سے کھیلنا چھوڑ دے اور پر امن طریقے سے اپنے معاملات حل کریں۔"

---

[1] کمال دیب، تاریخ سوریا، 248۔

[2] ایریل بن سلیمان، دی یوروشیلم پوسٹ، 31 مئی، 2014

اس سے اس بات کو تقویت مل رہی ہے کہ "عرب بہار کے بعد مسلمان اتحاد مزید خطرات سے دوچار ہوتا جا رہا ہے۔اسی عرب بہار کی وجہ سے مسلمان ممالک کا آپس کے تعلقات بھی کشیدہ ہو تے جا رہے ہیں حالانکہ اتحاد امت مسلمہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب 'مسلمان ممالک" ایک پلیٹ فارم پر اکھٹے ہو جائیں۔لیکن زمانہ قریب میں ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔عراق آئے روز سعودی عرب پر مداخلت کے الزامات لگا رہا ہے۔شام کی اپوزیشن کی طرف سے ایران اور لبنان پر مداخلت کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔یہاں تک کہ پاکستان میں جب بھی فرقہ وارانہ صورتحال سامنے آتی ہے تو لوگوں کی انگلیاں سعودی عرب اور ایران کی طرف اٹھتی ہیں ایسے میں اتحاد امت کیونکر ممکن ہے؟حالیہ شامی بحران کے بعد مسلمان ملکوں کے درمیان تناؤ کی جو صورت حال ہے اس کو زیر بحث لاتے ہیں۔

ایران اور سعودی عرب تنازعہ مسلکی اختلافات کا باعث

یوں تو ایران اور سعودی عرب کے تعلقات ماضی میں بھی آئیڈل نہیں رہے ہیں۔لیکن پھر بھی اتنے خراب شاید پہلے کبھی نہیں تھے جو موجودہ شامی بحران کے بعد ہوئے ہیں۔واشنگٹن پوسٹ میں ایک رپورٹ چھپی تھی جس میں موجودہ شامی بحران کے بعد سعودی عرب اور ایران کے تعلقات کو واضح کیا گیا ہے۔

"Iranian support for embattled syrian president Bashar Assad is producing a violent backlash against Tehran's interests in the Middle East and Fueling a poroxy war with Saudi Arabia that threatens to further destabilize the region."[1]

"شامی صدر بشار الاسد کے لیے ایرانی حمایت خلیجی ممالک میں تہران کی سابقہ پالیسی کے برخلاف تشدد کو اکسا سکتا ہے اور سعودی عرب کے ساتھ پراکسی وار کو مزید ہوا دے گا جو کہ خطے کے لیے بہت نقصان دہ ہو گا۔"

اخبار مزید لکھتا ہے کہ:۔

"The situation is a source of growing concern among US intelligence officials and regional analysts who say tension between Saudi Arabia's Sunnia-led monarchy and Iran's Shiite-controlled theocracy has become a dangerous

---

[1] اشیش کمار سین، "Proxy war between Iran and Saudi Arabi Playing out in Syria" دی واشنگٹن پوسٹ،26فروری2014

subtext of Syria's civil war and poses an existential threat to regional neighbors particularly lebanon."[1]

سعودی عرب اور ایران اسلامی دنیا کے دو اہم ممالک ہیں اگر یہ دونوں باہم ایسے دست و گریبان ہونگے تو اسلامی دنیا کا اتحاد کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

مسلکی بنیاد پر مسلم ممالک کی تقسیم

حالیہ شامی بحران نے اسلامی دنیا کے اتحاد کو تقسیم در تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ مسلم ممالک الگ الگ گروپ میں بٹ چکے ہیں۔ جو کہ اتحاد امت مسلمہ کے لیے بہت رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ ترکی اور ایران کے تعلقات بھی ان تحریکوں کے بعد کافی حد تک کشیدہ ہو چکے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر الزامات لگا رہے ہیں۔ شام اور عراق میں ایران کے حمایت یافتہ حکمران ہیں۔ CNN نے اپنی ایک رپورٹ میں ان ممالک کی حالیہ کشیدگی کو کچھ یوں بیان کیا ہے۔

"Turkey, whose regime change policy in Syria has been undermined by Iran, has entered the fertile crescent competition, throwing its support behind the Syrian and Iraq MB parties. This move has cast Ankara and Damascus as enimies, and also cooled ties between Ankara and Baghdad, where the government is run by Shiites that Turkey considers Iran's peons."[2]

"ترکی جس کی پالیسی شام کی وجہ سے خطے میں تبدیل ہوئی ہے۔ ایران کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے اور ایران ترکی کے مد مقابل ہے ترکی نے عراق اور شام میں حزب مخالف بر سر اقتدار پارٹیوں کی حمایت کرتی ہے۔ اس بات نے انقرہ اور دمشق کو دشمن بنا دیا ہے۔ اور اسی طرح انقرہ اور بغداد کو بھی۔ جہاں پر شیعہ حکومت کرتے ہیں جن کو ترکی ایران کا بغل بچہ سمجھتا ہے۔"

حالیہ عرب بحران کے نتیجے میں عرب ممالک خود ہی ایک پیج پر دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ جس کی تازہ مثال قطر اور سعودی عرب کی تعلقات ہیں۔ جس میں پہلی دفعہ دراڑ پڑتی دکھائی دے رہی ہے۔ "اتحاد امت مسلمہ" کے خاطر مسلم حکمرانوں کو وسیع تر مسلم مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے کرنے ہونگے نہ کہ

---

[1] اشیش کمار سین، "Proxy war between Iran and Saudi Arabi Playing out in Syria" دی واشنگٹن پوسٹ، 26 فروری 2014

[2] " Middle East Reconfigured Turkey vs, Iran vs, Saudi Arabia, CNN News, Sep 13, 2013

مسلک اور نسل کی بنیاد پر۔ مسلمان حکمرانوں کو اپنی ذاتی عناد کو چھوڑ کر مسلم اتحاد کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔جو کہ اتحاد امت مسلمہ کے لیے بنیادی شرط ہے۔

فصل دوم

معاشی اثرات

شام کی خانہ جنگی نے جس طرح امت مسلمہ کے مختلف طبقات کے مابین مسلکی اختلافات کی شدت کو بڑھاوا دیا اور مسلح فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوا، اسی طرح شامی بحران کے مسلم ممالک کی معیشت پر بھی منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یہ جنگ جس کا دائرہ قدرے کم ہوا ہے لیکن ختم نہیں ہوئی، کئی سطح پر ایک چیلنج بن کر سامنے آئی جس میں ایک چیلنج اقتصادی نمو میں خسارے کا بھی رہا ہے۔ ابھی جولائی 2020ء کے شروع میں عالمی بینک نے ایک تفصیلی رپورٹ جاری کی ہے جس میں بتایا گیا کہ ملک شام کے بحران اس کے پڑوسی مسلم ممالک کی معیشت کو کس طرح متأثر کیا ہے اور وہ اس کے لیے کیا اقدامات کر سکتے ہیں۔[1]

شامی بحران کے مسلم ممالک، بالخصوص پڑوسی ریاستوں کی معیشت پر جو منفی اثرات مرتب کیے ہیں ان کا ایک سبب تو مہاجرین کی مہاجرت ہے۔ جس کے باعث ان ملکوں میں بے روزگاری کے اندر اضافہ ہوا۔ جب اتنی زیادہ تعداد میں لوگ ان سرحدوں کو عبور کر کے داخل ہوئے تو ان کے روزگار کا مسئلہ بنیادی تھا جس کا بوجھ معیشت پر پڑا۔ دوسری وجہ دفاعی اخراجات میں اضافہ بھی جس سے اقتصادی بحران نے جنم لیا۔ پڑوسی مسلم ممالک چونکہ اس بحران سے براہ راست متأثر ہو رہے تھے۔ یہ خطہ جہاں ایک طرف فرقہ وارانہ آگ میں جھلس رہا تھا وہیں اس کے ساتھ یہ علاقہ عالمی طاقتوں کی باہمی رقابت کی آماجگاہ بھی بن گیا تھا۔ اس لیے پڑوسی ممالک اپنی سرحدوں اور دفاعی نظام کے متعلق بھی فکر مند تھے اور کسی ممکنہ نقصان سے بچنے کے لیے وہ سکیورٹی کا نظام فعال وزیادہ مضبوط بنانے کے لیے مجبور ہوئے۔[2] ان اقدامات کی خاطر بھی انہیں بھاری پیسہ لگانا پڑا جس سے ان کی معیشت متأثر ہوئی۔

لبنان اور پڑوسی ممالک پر معاشی اثرات

عالمی بینک کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس بحران کے باعث پڑوسی مسلم ممالک کو بھاری معاشی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ ان کے بیرونی قرضوں میں اضافہ ہوا، غربت اور بے روزگاری کا گراف اوپر گیا ہے اور تجارت میں مندی واقع ہوئی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صرف شامی بحران کے سبب پڑوسی مسلم ممالک کی شرح نمو میں حیرت

---

[1] Impact of Syrian Crisis (The World Bank Report, April, 2014), 5-9.

[2] The Ripple Effects of Syria Conflict in Mashreq Region (The World Bank Report, June, 2020), 12.

انگیز طور پہ گراوٹ آئی ہے۔ پچھلے دس سالوں کے دوران عراق میں ہر سال 1.2 فیصد تک شرح نمو میں کمی واقع ہوئی، اردن میں 1.7 فیصد، اور لبنان میں 1.6 فیصد تک شرح نمو میں سالانہ کمی آئی ہے۔ اس کے علاوہ عراق میں اس بحران کی وجہ سے 6 فیصد تک بے روزگاری میں اضافہ دیکھنے کو ملا ہے، اردن میں یہ اضافہ 3.9، جبکہ لبنان میں 7.1 فیصد تک بے روزگاری کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ (1)

شام سے مہاجرت کا تناسب اتنا بڑا ہے کہ اسے دوسری عالمی جنگ کے بعد سب سے بڑی مہاجرت قرار دیا گیا ہے۔ اس قدر وسیع پیمانے پر مہاجرت نے کئی مسلم ملکوں کی معیشت کو دھچکا دیا ہے۔ اگرچہ ان مسلم ممالک نے مہاجرت کے اس بحران اور اس سے پیدا ہونے والے معاشی چیلنج سے نمٹنے کے لیے بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ عالمی تنظیموں اور امیر ممالک کی جانب سے امداد بھی ملی ہے لیکن جس پیمانے پر یہ چیلنج رہا ہے اور اس کی وجہ سے ضرورتیں بڑھیں ان کو پورا کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس بات کو عالمی بینک نے بھی تسلیم کیا ہے کہ شامی بحران نے جس سطح پر معاشی بحران پیدا کیا اس سے نمٹنے کے لیے پڑوسی مسلم ممالک نے اپنا مکمل کردار ادا کیا لیکن یہ جس طرح مختلف سطح کا تھا جو امداد و تعاون اس کے لیے درکار تھے وہ پوری طرح میسر نہیں آسکے۔ (2)

دفاعی اور روزگار کے مسائل کے علاوہ خیموں کی سہولت کے لیے بجلی، پانی اور خوراک کی فراہمی بھی ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔ شروع میں کم امداد اور فوری مہاجرت کے سیلاب کی وجہ سے حکومتوں نے عارضی وسائل کا سہرا لیا تھا جس سے زیادہ پیسہ خرچ ہوا۔ عالمی بینک کے مطابق مہاجرین کی بچوں کی تعلیم بھی ایک بڑا مسئلہ رہا ہے جس پر بہت سارا خرچ آیا۔ (3)

اس سے پہلے کے بحرانوں میں جو مہاجرت ہوئی یا اس کی وجہ سے پڑوسی ممالک کو دفاعی سطح بھی چیلنج درپیش ہوئے وہ اتنے گمبھیر نہیں تھے جتنے جیسا کہ شامی بحران کے دوران ہوا۔ مثال کے طور پہ پاکستان میں بھی اسی کی دہائی میں افغانستان سے ایک بڑی ہجرت ہوئی تھی۔ اس مہاجرت کے بھی پاکستان کی معیشت پر اثرات پڑے مگر اسے عالمی قوتوں کی مدد کے ساتھ سنبھال لیا گیا تھا۔ مزید برآں افغان مہاجرت ایک منظم عمل تھا جس کی پہلے منصوبہ بندی کرلی گئی تھی۔ لہذا جب پاکستان کی طرف افغان خاندانوں کا انتقال ہوا تو پاکستان کو اتنا بڑا چیلنج درپیش نہیں تھا کیونکہ پہلے سے ہی کافی اقدامات کرلیے گئے تھے۔ (4) اسی طرح افغان مہاجرت اس لیے بھی بڑا معاشی چیلنج نہیں بنی کہ

---

[1] Impact of Syrian Crisis,The world bank report, Apxe, 2014, 34

[2] سابقہ مرجع، 36۔

[3] سابقہ مرجع، 36۔

[4] سمیر یوسف، الموقف السوری من الوجود السیاسی، 46۔

وہاں سے آنے والے بچوں میں سے بڑی تعداد مدارس میں داخل ہو گئی تھی اس لیے تعلیم کے انتظامات اور ان کے درس و تدریس کے اخراجات کا حکومت کے اوپر بڑا بوجھ نہیں پڑا تھا۔[1] اسی طرح افغان مہاجرت نے اس لیے بھی پاکستانی معیشت کو زیادہ دھچکا نہیں دیا تھا کیونکہ یہاں پہلے سے ہی بہت سارے افغانوں کے رشتہ دار موجود ہیں جنہوں نے ان کے آنے کے بعد ان کی مالی مدد کی اور ان کے اخراجات اٹھائے۔ ایک وجہ مشترکہ ثقافتی و تاریخی پس منظر بھی تھا جس نے افغانوں کو پاکستان میں اجنبیت کا ماحول نہیں دیا بلکہ انہیں یہاں اپنے ملک جیسی اپنائیت میسر آئی تھی۔ انہوں نے یہاں کاروبار کیے، تعلیم حاصل کی اور ملازمتوں میں بھی حصہ پایا۔[2] یہ وہ چند اسباب ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شام کا موجودہ بحران کتنا بڑا اور سنجیدہ ثابت ہوا کیونکہ اس کے پڑوسی ممالک کی معیشت کو وہ ماحول میسر نہیں آیا جو دیگر مواقع کی مہاجرتوں کے دوران میزبان ممالک کو حاصل رہا ہے۔

عالمی بینک نے یہ بھی کہا ہے کہ دنیا کو شام کے بحران سے جو سیکھنا چاہیے اس میں ایک چیز یہ بھی ہے کہ عالمی رفاہی تنظیمیں اور امیر ممالک خود کو ایسے ممکنہ حالات کے لیے ادارہ جاتی حیثیت میں تیار رکھیں۔ بجائے اس کے کہ انفرادی سطح پر مالی معاونت کی جائے ضروری ہے کہ اس کام کو مجموعی طور پہ ادارہ جاتی حیثیت مہیا کی جائے۔ جب اس طرح کے بحران سامنے آتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بحران زدہ ملک اور اس سے متأثرہ دیگر ملکوں کی معیشت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس لیے ایسے بحرانوں سے نمٹنے کے لیے سب کو مل کر عالمی سطح پہ ایک ادارہ جاتی حیثیت میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ عموماً ایسے وقت میں جو اقدامات بھی کیے جاتے ہیں وہ وقتی ہوتے ہیں اور اس سے معیشت کو سہارا نہیں ملتا۔ اس لیے نتیجے میں رفاہی امور سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور مہاجرت کا شکار ہونے والے لوگ خودانحصاری کی طرف بھی نہیں جا پاتے۔

ترکی کی معیشت پر اثرات:

ترکی کے اندر پناہ گزینوں کی سرکاری تعداد کا اندازہ 2.5 ملین لگایا گیا ہے۔ اقوام متحدہ نے ترکی پر زور دیا تھا کہ وہ 3 ملین شامی شہریوں کو اپنے ملک کے اندر پناہ دے تاکہ ان کی معاونت کی جا سکے مگر ترکی اس سے زیادہ کو پناہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ کیونکہ پناہ گزینوں پر جتنی رقم خرچ ہو رہی ہے عالمی اداروں کی جانب سے اس کے تناسب میں بہت کم مدد ملتی ہے جس کا اکثر خرچ خود ترکی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پہ ایک رپورٹ کے مطابق ترکی نے

---

[1] The Fallout of War (The World Bank Report, July, 2020), 24.

[2] The Fallout of War (The World Bank Report, July, 2020), 27.

2015ء میں ان پناہ گزینوں پر 6 ارب ڈالر خرچ کیے تھے جبکہ اسے عالمی اداروں کی جانب سے 4 سو ملین ڈالر موصول ہوئے تھے۔[1]

حالانکہ ترکی نے 2011ء سے ہی پناہ گزینوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے تھے۔ اور اس پالیسی کی وجہ سے اسے شدید تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ کیونکہ سروے کے مطابق 62 فیصد ترک شہریوں کا خیال ہے کہ ترکی میں داخل ہونے والے شہریوں میں ایک بڑی تعداد جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث ہے اور ان کی وجہ سے شہروں میں تشدد کے کئی واقعات بھی رونما ہو چکے ہیں۔[2]

اس کے علاوہ ترک شہریوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر اتنی بڑی تعداد میں دوسرے ملک کے شہری آباد ہوں گے تو اس سے ترکی کی شناخت اور اس کی تہذیبی وثقافتی پہچان کے متأثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ ترکی کی بعض خبروں میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ پناہ گزینوں میں سے 2 لاکھ شامی شہریوں نے حکومت کی رجسٹریشن سے انکار کر دیا ہے جس کے باعث حکومت کو مشکلات کا سامنا ہے۔ رجسٹریشن سے انکار کی وجہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کچھ شامی شہری ترکی سے یورپ میں داخل ہونا چاہتے ہیں اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ ان کی رجسٹریشن کی جائے۔ کیونکہ اگر ترک حکومت کے پاس ان کی رجسٹریشن ہو گی تو اس کے نتیجے میں ان کا یورپ میں داخل ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کچھ شامی شہری اس لیے بھی اس عمل سے انکار کرتے ہیں کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ کہیں انہیں ان کی مرضی کے بغیر شام واپس نہ بھیج دیا جائے۔ جب تک شام میں بشار الاسد کی حکومت قائم ہے اس وقت تک شامی شہری واپس جانے سے گھبراتے ہیں۔ تیسرا سبب یہ بھی ہے کہ ان میں سے بعض کو یہ خوف ہے کہ رجسٹریشن کے بعد مستقبل میں ترکی انہیں کہیں کیمپس میں محدود نہ کر دے۔ اس سے وہ ایک طرح کی قید کی زندگی میں آجائیں گے۔[3]

ترکی کی حکومت ان پناہ گزینوں کے بچوں کو تعلیم بھی دے رہی ہے۔ اس کا خرچ بھی بہت زیادہ ہے۔ پہلے ان بچوں کے لیے علیحدہ عارضی سکول قائم کیے گئے تھے جن میں شامی بچے اپنے ملک کی سطح کی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں لیکن بعد میں حکومت نے ان سکولوں کو براہ راست اپنی وزارت تعلیم کے ماتحت کر دیا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ان سکولوں میں شدت پسندی کی تعلیم نہ دی جائے۔[4]

---

[1] The Fallout of War (The World Bank Report, July, 2020), 40.

[2] The Syrian withdrawal: Where Things Stand (RAND Studies, 2017), 59

[3] سابقہ مرجع، 61۔

[4] محمد المجذوب، دراسات فی السیاسہ والاحزاب، 39۔

رپورٹس کے مطابق مشرق وسطی کے ملک جو شامی شہریوں کو پناہ دے رہے ہیں وہاں ان کے لیے ہر طرح کی سہولت فراہم کرنے کی کوششیں بھی کر رہے ہیں لیکن عالمی ادارے ان کو اتنی امداد نہیں دیتے جتنی کہ ان مغربی ممالک کو دے رہے ہیں جنھوں نے شامی شہریوں کو پناہ دی ہے۔[1] عالمی اداروں کی اس پالیسی کی وجہ سے مسلم دنیا کے ان ملکوں کی معیشت کو نقصان پہنچا ہے جو شامی شہریوں کے لیے معاونت پیش کر رہے ہیں۔

اردن کی معیشت پر اثرات

اسی طرح کی صورتحال کا سامنا اردن کو بھی کرنا پڑا ہے۔ اس وقت اردن کی پناہ گزین کیمپس میں تقریبا 1.6 ملین شامی پناہ لیے ہوئے ہیں جن کے اخراجات اور ان کی وجہ سے درپیش دیگر معاشی مسائل کی وجہ سے ملک کی اقتصادی حالت کمزور ہوئی ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق اردن میں شامی پناہ گزینوں کے لیے پانی کے انتظام اور اس کی فراہمی میں سالانہ 602 ملین دینار کا خرچ آرہا ہے۔ شامی بچوں کی تعلیم کے لیے اردن نے 200 سکول کھولے ہیں۔ ان میں 3870 اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ ان بچوں کی تعلیم کے اخراجات کا اندازہ 250 ملین دینار سالانہ لگایا گیا ہے۔ اس کے علاو صحت کے شعبے میں ان کے لیے عارضی ہسپتالوں کا قیام عمل میں لایا گیا جس پر سالانہ 271 ملین دینار صرف کیے جارہے ہیں۔[2]

شامی خانہ جنگی کی وجہ سے اردن کی معیشت کو اس لیے بھی نقصان پہنچا ہے کہ اردن شام کے راستے سے لبنان اور ترکی تک رسائی حاصل کر رہا تھا۔ اس بحران سے 30 فیصد ایکسپورٹ اور 11 فیصد امپورٹ متاثر ہوئی ہے۔[3] اس کا مطلب یہ ہے کہ شامی خانہ جنگی نے براہ راست اردن کی اقتصادی حالت پر کاری ضرب لگائی ہے۔

شامی بحران سے قبل اردن کی معیشت میں شرح نمو 6.5 فیصد تھی۔ یہ انتہائی حوصلہ افزاء اور بہترین اعشاریہ ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ اردن کی معیشت طاقتور ہو رہی تھی۔ لیکن جونہی یہ بحران شروع ہوا تو اس کے بعد حالت خراب ہونے لگی اور 2016ء میں شرح نمو گر کر 2.5 پر آگئی۔ اردن اپنے سیاحت کے شعبے سے بھی سالانہ ایک غیر معمولی فائدہ اٹھاتا تھا جس سے اقتصادیات کو سہارا ملتا لیکن اس بحران نے سیاحت کے شعبے کو بھی بڑی زک لگائی کیونکہ شام کی سرحد ملنے کی وجہ سے لوگوں نے اردن آنا بھی کم کر دیا۔[4]

---

[1] حمد المجذوب، دراسات فی السیاسہ والاحزاب، 62

[2] سامی الحداد، مبادرہ العریضہ الشعبیہ، 92۔

[3] The Ripple Effects of Syria Conflict in Mashreq Region,42

[4] The Fallout of War,33

فصل سوم

نظریاتی و فکری اثرات

عرب بہار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شام بحران سے قبل مسلم دنیا میں نظریاتی و فکری مباحث کے زاویے قدرے مختلف تھے، اور اس کے بعد کچھ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جو نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ مسلم دنیا میں وقوع پذیر ہونے والی ان تبدیلیوں کے اثرات عالمی بھی ہیں اور محدود نوعیت کے بھی۔ ان میں سے بعض کا ذکر ذیل میں دیا جاتا ہے:

مغربی دنیا پر عدم اعتماد میں اضافہ:

مسلم دنیا میں مغرب اور اس کی اقدار پر پہلے بھی اتنا اعتماد نہیں پایا جاتا تھا۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں جن میں سے ایک استعماری دور میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے مظالم شامل ہیں۔ عرب دنیا ہو یا غیر عرب، جہاں جہاں بھی مغربی استعمار نے کچھ وقت کے لیے اپنی حکومت قائم کی وہاں انہوں نے جبر استبداد کی مثالیں قائم کیں۔ وہ عہد جمہوریت اور جمہوری اقدار کے لیے نیا تھا، اور مغربی دنیا خود کو اس کا علمبردار کہتی تھی۔ لیکن جہاں انہوں نے استعمار بن کر حکومت کی وہاں جمہوریت اور جمہوری اقدار کی شدید خلاف ورزیاں کیں۔ ان وجوہات کی بنا پر مسلم دنیا میں ان کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی اور ان سے آزادی کی تحریکیں چلیں جو رفتہ رفتہ کامیاب ہوئیں۔ مسلم امت میں استعمار کا چہرہ اور اس کی تاریخ اب تک زندہ تھی لیکن دوسری عالمی جنگ اور پھر انسانی حقوق کے عالمی اداروں کے وجود میں آنے کے بعد مغرب نے ساری دنیا کو ان جدید اقدار کے قبول کرنے پر زور دیا۔ کچھ ممالک نے انہیں پوری طرح قبول کیا اور بعض نے تردد کا مظاہرہ کیا، مگر اس سب کے دوران عدم یقین اور عدم تحفظ کا احساس باقی رہا۔"[1]

پھر نائن الیون کے بعد ساری دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ چھیڑی گئی جس میں مسلم ممالک کو نشانہ بنایا گیا۔ اس وجہ سے بھی کچھ عدم تحفظ میں مزید اضافہ ہوا۔

---

[1] زیادہ رضوان، الاسد والصراع علی الشرق الاوسط، 145۔

"لیکن شام بحران کے بعد مغربی ممالک اور انسانی حقوق کی علمبر دار عالمی تنظیموں نے جو رویہ اختیار کیا اور شامی عوام کے دکھوں پر نمک پاشی کی اس کا اثر یہ نکلا ہے کہ اب مغرب اور اس کی قیادت پر مسلم دنیا کے اندر عدم اعتماد میں بہت زیادہ اضافہ دیکھنے کو ملا ہے"۔[1]

اپریل 2017ء کے ایک سیمینار میں امریکی دانشور وولفانگ جونز نے خطاب کرتے ہوئے تنبیہ کی کہ اس وقت دنیا میں جو بے یقینی کی صورتحال ہے یہ ویسی ہے جس طرح دوسری عالمی جنگ کے بعد نظر آئی تھی۔ اس میں کئی اسباب بطور عوامل کام کر رہے ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ مغربی ممالک میں سے کئی ایسے ہیں جو تحفظ پسندی کی طرف جارہے ہیں اور انسانی حقوق کی عالمی اقدار سے دوری اختیار کر رہے ہیں یا ان میں بے توجہی بڑھ رہی ہے۔ جمہوریت، انسانی حقوق اور شہریت جیسے الفاظ اب اپنی اہمیت اس لیے کھو رہے ہیں کہ اس کے علمبر دار ان اقدار کے بر خلاف کھڑے ہیں یا پھر باقی دنیا میں جو ہو رہا ہے اس میں انہیں دلچسپی نہیں رہی۔[2]

شامی بحران سے مسلم دنیا میں فکری طور پہ یہ بات راسخ ہو گئی ہے کہ انہیں اپنے مسائل کے حل کے لیے مغرب پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ جب یہ بحران شروع ہونا تھا تو مسلم دنیا میں اس بات کی امید تھی کہ مغربی طاقتیں عوام کے ساتھ کھڑی ہوں گی اور بشار حکومت کو معزول کر دیا جائے گا یا اسے اصلاحات کے نفاذ کے لیے مجبور کیا جائے گا، لیکن معاملات اس کے بر خلاف رخ کی جانب بڑھے۔ مغرب نے بشار حکومت کے مظالم سے صرف نظر کیا اور اس کی ساری توجہ اس پر رہی کہ اس ملک میں انارکی اور مسائل کا سبب بننے والی جہادی جماعتیں ہیں اور وہی اس کی تخریب کا اصل سبب ہیں۔[3]

مغربی میڈیا نے جس طرح شامی بحران میں کردار ادا کرنے والی مسلح اپوزیشن کی تصویر پیش کی اس سے اسلام اور مسلمان بدنام ہوئے۔ اس کے علاوہ جب شامی مہاجرین مغربی ممالک میں داخل ہوئے تو اس پر وہاں کی دائیں بازو کی جماعتوں نے اعتراضات کیے اور کہا کہ یہ لوگ امن کے لیے خطرہ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یورپ جو توسع پسندی کا مظہر جانا جاتا تھا وہاں یہ تصور زور پکڑ گیا کہ اگر ان بحرانوں کے بعد مہاجرت کا سلسلہ جاری رہا تو یورپی یونین ٹوٹ سکتی ہے۔[4] مغربی ممالک میں اس بحران کے بعد اسلاموفوبیا میں بھی اضافہ ہوا۔

---

[1] مسعد ناجی، مستقبل التغییر فی الوطن العربی، 212۔

[2] عمر اسکندر، شوریا ازمۃ نظام وثورۃ شعب، 56۔

[3] سابقہ مرجع، 221۔

[4] جمال باروت، الاحزاب والجماعات الاسلامیہ، 211۔

ان تمام وجوہات کے سبب مسلم دنیا میں فکری سطح پر یہ خیال پختہ ہوا ہے کہ مسلم دنیا کے بحرانوں کے حل میں مغرب پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

عوام الناس میں خوف وہراس:

کہا جاتا ہے انقلاب کے نتائج مرضی کے نہیں آتے۔ لیکن انقلاب یا حکمران کے خلاف بغاوت کے نتائج اتنے بھیانک ہو سکتے ہیں اس کا تصور نہیں کیا گیا تھا۔ شام میں جب بشار حکومت کے خلاف عوام سڑکوں پر نکلے تو انہیں یہ امید تھی تیونس اور مصر کی طرح یہاں بھی حکومت کو معزول کر دیا جائے گا۔ یا پھر لیبیا کی طرح عالمی قوتیں مداخلت کریں گی تو حکمران کو ہٹا دیا جائے گا۔ لیکن شام کی بغاوت کے نتائج انتہائی بھیانک ثابت ہوئے۔ اس سے عوام میں اتنا شدید خوف پیدا ہوا کہ لوگ اب یہ سوچتے ہیں کہ اگر حکومت کے خلاف بغاوت کا نعرہ نہ لگایا جاتا تو شاید یہی بہتر تھا۔[1] اس کی مثال عرب دنیا کی دیگر آمریتیں یا بادشاہتیں بھی ہیں جہاں پہلے شدید مظاہرے ہو رہے تھے۔ لیکن جوں جوں شام کی صورتحال بگڑتی گئی تو وہاں بھی یہ رجحان پیدا ہوا کہ امن امان کی خاطر بہتر یہ ہے کہ بغاوت کا خیال ترک کر دیا جائے۔[2]

شامی بحران نے جتنی ہولناکیاں دکھائی ہیں اس سے مسلم دنیا میں حکمرانوں کے خلاف اور اسٹیٹس کو کے خلاف آواز اٹھانے کی فکری باتیں کم ہو گئی ہیں۔ کم از کم عوام ذہنی طور پہ یہ سوچتی ہے کہ اگر بغاوت کی گئی تو ملک کا انجام شام یا لیبیا جیسا ہو سکتا ہے۔[3]

حتیٰ کہ اب صورتحال یہ بھی ہے کہ مسلم دنیا کی ایسی جمہوریتیں جہاں جمہوریت صرف انتخابات اور ووٹ ڈالنے کی حد تک ہے، اصل میں اسٹیٹس کو کا نظام غالب ہے، وہاں عوام اسٹیٹس کو کو بھی چیلنج کرنے سے کتراتے ہیں۔ کیونکہ انہیں خوف ہے کہ اس کا خمیازہ تباہی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ خلیجی ممالک اور بعض دیگر عرب بادشاہتوں میں سروے کرائے گئے جہاں عوام سے سوال کیے گئے کہ حکمرانوں کے خلاف بغاوت یا حقوق کے نام پر سڑکوں پر آنے کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے تو اکثریت نے یہ جواب دیا کہ انہیں موجودہ حالت میں رہنا پسند ہے بجائے اس کے کہ وہ آمریت یا اسٹیٹس کو کو چیلنج کریں اور کسی تباہی سے دوچار ہوں۔[4]

---

[1] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 410۔

[2] سابقہ مرجع، 432۔

[3] سابقہ مرجع، 459۔

[4] علی آزاد محمد، خلفیات الثورۃ السوریہ، 26۔

مذہبی سیاست کی جانب رجحان:

مذہب وسیاست کے مابین تعلق کی کیا حیثیت ہے، یا یہ مذہب و سیاست الگ الگ ہیں یا دونوں ساتھ چلتے ہیں۔ یہ سوال نیا نہیں ہے۔ مسلم تاریخ اور تہذیب میں سیاسی فقہ کی کتب میں اس پر بات کی گئی ہے اور اس کے جوابات بھی دیے گئے ہیں لیکن جب سے جمہوری نظام متعارف ہوا اور مغربی دنیا میں اس پر اصرار بڑھتا گیا کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے تو یہ بحث مسلم دنیا میں بھی نئے سرے سے شروع ہوگئی۔ اس پر بے شمار کتب تصنیف کی گئیں اور مختلف جوابات سامنے آئے۔ لیکن عملا استعماری عہد کے بعد سے مسلم دنیا میں جو نظام رائج رہا اور جس طرز سیاست کو غلبہ حاصل ہوا وہ مذہبی نہیں تھی۔ اگرچہ مذہب پر قدغن نہیں تھی لیکن بطور نظام کے ریاست میں لبرل حلقوں کو رسوخ حاصل ہوا اور انہوں نے ہی حکومتیں کیں۔ چاہے وہ عرب دنیا کی بادشاہتیں ہوں انہوں نے بھی مذہبی سیاست کو زیادہ پھلنے پھولنے نہیں دیا اور حکومتیں اس بیانیے کو فروغ دیتی رہیں کہ مذہب کا سیاست میں عمل دخل نہیں ہوتا، مذہب صرف اخلاقی تربیت وپاکیزگی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔[1] یا پھر اگر کسی حاکم نے مذہبی طبقے کو اپنے قریب کیا بھی تو اس کا مقصد اپنے اقتدار کو طول دینا تھا، عملی طور پہ بطور ایک تنظیم مذہب کو سیاست میں نہیں آنے دیا گیا۔[2]

لیکن عرب بہار اور بالخصوص شامی بحران کے بعد نوجوانوں میں مذہبی سیاست کی طرف رجحان میں اضافہ دیکھنے کو ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بشار الاسد سمیت ان حکمرانوں کے طرز عمل کو دیکھا جنھوں نے سیکولرزم کے نام پر ان کی آزادیوں اور حقوق پر قدغنیں عائد کیے رکھیں۔ اس لیے نوجوانوں نے مذہبی سیاست پر اعتماد کیا، یا سیاست میں مذہبی تعلیمات کو شامل کرنے میں فکری طور پہ تیار ہوئے۔[3] کیونکہ ان کے خیال میں اسلام جو شہری حقوق مہیا کرتا ہے اور لوگوں پر مظالم ڈھانے سے روکتا ہے اس کی ہدایات پر عمل ناگزیر ہے۔ ان کے خیال میں اگر سیاست میں مذہبی ہدایات کو ترجیح دی جائے تو سماج میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

اسد خاندان نے ملک میں مذہبی سیاست اور مذہبی جماعتوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ حافظ الاسد نے اخوان المسلمون کے خلاف بدترین کریک ڈاؤن کیا تھا جس میں مذہبی سیاست سے ہمدردی رکھنے والے سینکڑوں افراد کو

---

[1] islamists religion and revolution in Syria,47

[2] Legal implications of armed conflict in Syria,39.

[3] عمر اسکندر، شوریا ازمۃ نظام وثورۃ شعب، 63۔

لقمہ اجل بنا دیا گیا تھا۔ بشار الاسد نے بھی یہی طرز عمل جاری رکھا اور مذہبی سیاست کو پابند سلاسل رکھا۔ اسی جبر کا نتیجہ رہا کہ جب اس نظام کے خلاف بغاوت ہوئی تو لوگوں نے مساجد اور مذہبی طبقے کی طرف رخ کیا تھا۔[1]

اس رجحان کی نظیر یہ بھی ہے کہ عرب بہار کے نتیجے میں جب دیگر چند ممالک میں حکمرانوں کا تختہ الٹا گیا تو وہاں لوگوں نے مذہبی سیاست کو خوش آمدید کہا اور ان لوگوں کو حکومت میں لائے جو مذہب و سیاست کے تعلق کو لازم ملزوم سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ مصر اور تیونس میں ہوا تھا۔ اس تبدیلی کی ایک وجہ شامی بحران کا بڑھنا بھی تھا جو غیر مذہبی سیاست کا علمبردار تھا۔

فکری پختگی اور اتحاد کی اہمیت میں اضافہ کا فقدان:

شامی بحران نے مسلم دنیا میں نظریاتی طور پہ ایک اس چیز کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے کہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ جو کچھ شام میں ہوا اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہاں حکومتی آمریت کے خلاف اپوزیشن کی صفوں میں اتحاد قائم نہیں تھا۔ مسلح اپوزیشن ہو یا سیاسی، دونوں کے اندر کشمکش اور باہمی افتراق کی وجہ سے حکومتی نظام کو فائدہ ہوا۔[2] اپوزیشن کی جماعتوں میں اس حد تک افتراق تھا کہ وہ آپس میں گتھم گتھی ہو گئیں۔ اس سے شامی بحران شدید تر ہوتا چلا گیا۔

دوسرا اہم نکتہ یہ سامنے آیا کہ انقلاب سے قبل فکری پختگی اور ادارہ جاتی حیثیت میں قیادت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ شام میں نوجوان حکومت کے خلاف سڑکوں پر تو نکلے لیکن ملک میں کوئی منظم قیادت اور منصوبہ بند پالیسی موجود نہیں تھی۔ انقلاب محض سڑکوں پر نکلنے سے کامیاب نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے پہلے فکری و ذہنی ریاضت اور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ انقلاب، جدوجہد اور خون اسی طرح ضائع ہو جاتے ہیں جس طرح کہ شام میں ہوا۔

---

[1] سابقہ مرجع، 67۔

[2] مسعد ناجی، مستقبل التغییر فی الوطن العربی 88۔

فصل چہارم

اسلام کو دہشت گردی کے ساتھ جوڑنے کی کوشش

اسلام ایک پر امن مذہب ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کا دعوی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے جس کی گواہی مسلم تاریخ اور اس کی تہذیب و ثقافت دیتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک طویل عرصے سے مسلمانوں کو دہشت گردی کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی اور رفتہ رفتہ یہ تعلق اب اسلام کے ساتھ جوڑا جارہا ہے۔ جب ماضی میں بعض مستشرقین یہ کہتے تھے [1] کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور اب بھی کچھ مغربی فکر سے متاثرہ اذہان یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تھا تو گویا وہ دین اسلام پر تہمت لگاتے ہیں کہ اس میں خدائی روحانیت و کشش نہیں تھی کہ اسے لوگ خود قبول کرتے اس لیے اسے زبردستی نافذ کیا گیا۔

اب جدید دور میں یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام دہشت گردی کی تعلیم دیتا یا اس پر ابھارتا ہے، تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اس میں مجموعی طور پہ اقدار کی کشش نہیں ہے نہ اس میں امن کا پیغام دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کی غلط تشریحات بھی کی جاتی ہیں۔

دہشت گردی کیا ہے؟

دہشت کے معنی ڈر، خوف اور خطرہ کے ہیں، اور اسی طرح دہشت گردی کا معنی ہے"خوف و ہراس پھیلانا۔" [2]

عربی زبان میں اس کے لیے رھبۃ، رہبیٰ اور رہباء کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس میں ڈر اور خوف کا معنی پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں عوام کو خوفزدہ کرنے والے حاکم کو عربی میں 'الارھابی' کہا جاتا ہے۔ جبکہ "الحکم الارھابی" کا معنی ہوتا ہے"خوفزدہ کرنے کا حکم" [3]

انگریزی زبان میں دہشت کے لیے لفظ Terror استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی ہر زبان میں دہشت یا خوف و خطر کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ ضرور دستیاب ہے مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ دور حاضر میں دہشت گردی کی اصطلاح جس پس منظر میں استعمال کیجا رہی ہے اس کی حدود و قیود، معنی و

---

[1] عبد الفضل، العرب والتجربہ الآسویہ، 90۔

[2] مصباح اللغات، مولانا عبد الحفیظ بلیاوی، ص:256، مکتبہ القدوس، لاہور۔

[3] مصباح اللغات "رھب" ص:318

مفہوم اور متفقہ تعریف کیا ہے؟ دو ٹوک الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ دہشت گردی کی کوئی واضح اور متفق علیہ تعریف موجود نہیں۔11 ستمبر 2001کے بعد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ہونے والی بحث بھی دہشت گردی کی تعریف متعین کرنے میں ناکام رہی۔اس سلسلہ میں آکسفورڈ ڈکشنری آف پالیٹکس کا مندرجہ اقتباس قابل غور ہے۔

دہشت گردی۔۔۔حکومتوں یا اہل علم تجزیہ نگاروں کے درمیان اس کی کوئی متفق علیہ تعریف نہیں۔ بالعموم جانی نقصان پہنچانے والی سرگرمیوں کو بیان کرنے کے لیے یہ بلا استثنا، برے مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے جو خود ساختہ نیم سرکاری گروہ سیاسی مقاصد کی خاطر انجام دیتے ہیں۔لیکن اگر یہ سرگرمیاں کسی مقبول مقصد کے حصول کے لیے کی جائیں۔مثال کے طور پر فرانس کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے مارکویس کی کوشش۔تو پھر لفظ دہشت گردی کے استعمال سے عام طور پر احتراز کیا جاتا ہے اور اس کی جگہ زیادہ دوستانہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔مختصراًیہ کہ ایک شخص کسی کے خیال میں دہشت گرد اور دوسرے فرد کے نزدیک آزادی کا سپاہی ہوتا ہے۔

بعض اوقات دہشت گردی نیم سرکاری اداروں کی بجائے حکومتوں کے لیے بھی برے مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے مثال کے طور پر ریاستی دہشت کی اصطلاح بعض اوقات گسٹاپو اور مشرقی جرمنی کے سٹیٹ سائی اور ان جیسے دوسرے اداروں کے بارے میں بھی استعمال کی جاتی ہے جنہیں سرکاری طور پر خود اپنے ہم وطن شہریوں میں سے اختلاف کرنے والے یا نسلی اقلیتوں کے خلاف کاروائیوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔دوسرے ریاستوں میں اس پالیسی کے تحت بلاواسطہ انجام دی جانیوالی پر تشدد کاروائیاں یا ان میں بالواسطہ مدد کو بھی ریاستی دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے۔موجودہ دور میں مختلف رجحان رکھنے والے ممالک انہیں کاموں کے لیے دوسرے ملکوں کی سخت مذمت کرتے ہوئے، اسی طرح کی سرگرمیوں میں خود بھی ملوث رہے ہیں۔مثال کے طور پر رونالڈریگن کے دور صدارت میں خود امریکہ نے مختلف حکومتوں، خاص طور پر لیبیا کو موردالزام ٹھہرایاجب کہ اس وقت نکارا گوا کے خلاف نیم سرکاری تشدد کی کھلے عام پشت پناہی امریکہ نے کی۔حالانکہ نکارا گوئع کی حکومت کے ساتھ اس کیے مکمل سفارتی تعلقات قائم تھے۔اس طرح کی کھلے عام عدم مطابقت سے شاید ہمیں زیادہ حیرت زدہ نہیں ہونا چاہیے اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ امریکی ڈالر پر سیاسی مقاصد کے لیے نیم سرکاری تشدد کرنے

والی ایک مشہور و معروف شخصیت یا دہشت گرد ی یا آزادی کے سپاہی یعنی جارج واشگٹن کی تصویر ہوتی ہے۔[1]

مذکورہ طویل اقتباس کا لب لباب یہی ہے کہ دہشت گردی کی کوئی مسلمہ و متفقہ تعریف موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک ہی شخص بعض کے نزدیک محب وطن یا آزادی کا سپاہی یا اسلام کا مجاہد ہو اور دوسروں کے نزدیک وہی دہشت گرد اور مجرم ہو۔ یہی بات ایک مرتبہ نیلسن منڈیلا نے اقوام متحدہ میں کہی تھی کہ "میں ایک زمانے میں دہشت گرد تھا اور اس کے بعد سربراہ مملکت۔۔۔کون دہشت گرد ہے اور کون نہیں، کس کو معلوم نہیں۔[2]

دہشت گردی کی تعریف کے تعین کی کوشش

دہشت گردی کی اصطلاح جدید دور کی اختراع ہے۔ قدیم دور اور بالخصوص اسلام کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ واضح رہے کہ اسلام جس چیز کا معنی و مفہوم اور حدود و قیود واضح طور پر بیان کرتا ہے اسے اس چیز کی شرعی تعریف یا شرعی اصطلاح قرار دیا جاتا ہے مثلااسلام میں صلاۃ سے مراد مخصوص اوقات اور مخصوص شرائط و کیفیات کے ساتھ ادا کی جانے والی خاص عبادت ہے۔ زکوۃ سے مراد مخصوص مالی نصاب میں سے مخصوص وقت پر مخصوص حصہ راہ خدا میں پیش کرتا ہے۔(اسی طرح دیگر بہت سی چیزیں ہیں)اور یہی صلاۃ و زکوٰۃ کی شرعی تعریفیں ہیں مگر دہشت گردی کی کوئی اصطلاحی تعریف اور حدود و قیود اسلام نے پیش نہیں کیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلام قیامت تک کے لیے کامل و مکمل اور محفوظ ترین آسمانی دین ہے جس میں انسانی زندگی کا کوئی گوشہ و پہلو تشنہ نہیں بلکہ ہر طرح کی الہامی ہدایات اسلام میں موجود ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دہشت گردی کی اصطلاح متعارف کروانے والے اسے کس حد تک واضح کر کے پیش کرتے ہیں۔ پھر ان کی ممکنہ تعریفات کے مطابق ہم قرآن و سنت اور تاریخی و عملی واقعات کی روشنی میں دہشت گردی کا جائزہ لیں گے۔ اور یہ بات ذہن نشین رہے کہ دہشت گردی کی اصطلاح مغرب نے اجاگر کی ہے۔ اس لیے اس کی تعریف کے تعین کے لیے تقریباً مغربی مفکرین ہی کے بیانات و اقتباسات پر اکتفا کیا جائے گا۔ دہشت گردی کی اصطلاحی تعریف کے حوالہ سے انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ:۔

---

[1] آکسفورڈ کنسائزڈ ڈکشنری آف پالیٹکس۔ ص:492-493

[2] مسلم دنیا کی بے اطمینانی، پروفیسر خورشید احمد، ص:344

"Terrorism, The systematic use of terror or unpredictable violence against governments, public or individuals to attain a political objective. Terrorism has been used by political organizations with both rights and leftist objectives by nationalistic and ehtnoic gorups, by revolutionories and by the armies and secret police of governments themselves." (1)

"دہشت گردی کسی سیاسی مقصد کے حصول کے لیے حکومت،عوام یا کسی فرد کے خلاف باقاعدہ و منظم طور پر خوف و ہراس یا ناقابل تصدیق تشدد کے استعمال کا نام ہے۔سیاسی تنظیمیں اپنے قدامت پسندانہ اور جدت پسندانہ اہداف کے حصول کے لیے دہشت گردی کرتی ہیں۔اسی طرح قوم پرست، نسلی و لسانی گروہ، انقلاب پسند گروہ اور خود حکومتی فوج اور خفیہ پولیس بھی دہشت گردی کا ارتکاب کرتی ہے۔"

ورلڈ انسائیکلو پیڈیا میں دہشت گردی کے حوالہ سے یہ معلومات درج ذیل ہیں۔

"Terroism is the use or threat of violence to create fear and alarm. Terroists murder and kidnap people set off bombs, hijack air planes. Set fires and comit other serious crimes. But the goals of terroists differ form those of ordinary criminals . Most criminels want money or some other form of personal gain. But most terrorists commit crimes to support political causes."(2)

"خوف و دہشت اور خطرے کا ماحول پیدا کرنے کا نام دہشت گردی ہے۔دہشت گردی لوگوں کو قتل و غارت اور اغوا کا نشانہ بناتے ہیں۔بم دھاکے کرتے ہیں۔ہوائی جہاز ہائی جیک کرلیتے ہیں۔آگ لگاتے ہیں ااور اسی طرح کے شدید ترین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔لیکن دہشت گردوں کے اغراض و مقاصد عام مجرموں کی بنسبت مختلف ہوتے ہیں۔اکثر و بیشتر مجرم مال و دولت یا کسی اور ذاتی منفعت کے لیے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں جب کہ عام طور پر دہشت گرد صرف سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔"

ریاست ہائے امریکہ کی سرکاری انٹیلی جنس ایجنسی ایف بی آئی کے نزدیک بین الاقوامی دہشت گردی کی تعریف یہ ہے کہ:۔

---

[1] The New Encyclopedia britannica P, 11/650

[2] The World book encyclopedia P, 19/178

"طاقت کا غیر قانونی استعمال یعنی افراد کے خلاف یا پراپرٹی کو تباہ کرنے یا حکومت شہری آبادی یا اس کے حصہ پر دباؤ ڈالنے یا سیاسی و سماجی مقاصد کے حصول کے لیے کسی ایسے گروپ یا فرد کی طرف سے تشدد کا ارتکاب جس کا تعلق کسی ملکی طاقت سے ہو یا جس کی سرگرمیاں قومی حدود سے تجاوز کر جائیں۔" (1)

بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی سکالر نوم چومسکی نے دسمبر 2001 کو دہشت گردی کے حوالہ سے جو تقریر کی، فرنٹ لائن کے مطابق اس کی رپوٹنگ اس طرح کی گئی کہ:۔

"چومسکی نے دہشت گردی کے تصورات کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے۔ ایک لغوی اور دوسرا پروپیگنڈے والا۔ دہشت گردی کا لغوی تصور جو امریکہ کے سرکاری دستاویزات میں بھی اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "دہشتگردی۔ تشدد کی دھمکی کا نپا تلا استعمال ہے جو دباؤ ڈال کر اور جبر یا خوف پیدا کر کے سیاسی، مذہبی یا نظریاتی نوعیت کے اہداف حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ چومسکی نے تسلیم کیا کہ امریکہ کی استعماری پالیسی نے لغوی تعریف کو پروپیگنڈے والی تعریف کے حق میں دستبردار کر دیا ہے۔ نوم چومسکی کے مطابق جو کوئی بھی امریکہ کے خلاف ہے اور اس کے دوستوں یا حلیفوں کے خلاف ہے، وہ دہشت گرد ہے۔ (2)

مندرجہ ذیل اقتباسات کی روشنی میں دہشت گردی کی درج ذیل مختلف صورتیں اور تعریفیں سامنے آتی ہیں۔

1۔ سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے تشدد اور قوت کا استعمال

2۔ خوف و ہراس پھیلانے کے لیے بے گناہ شہریوں، سول آبادیوں اور نجی و سرکاری عمارتوں کو تخریب کاری کا نشانہ بنانا اور وسیع پیمانے پر قتل عام کرنا۔

3۔ امریکہ کی پالیسیوں اور اس کے حامیوں کی مخالفت کرنا (امریکہ کے نزدیک یہ بھی دہشت گردی ہے)

امریکی نظام اور امریکی پالیسیوں کی مخالفت میں چونکہ مجاہدین ہی پیش پیش ہیں، اس لیے اب ایک عرصہ سے جہاد کو دہشت گردی کے مترادف قرار دینے کا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کو ان کا دین اسلام ہی جہاد پر ابھارتا ہے، اس لیے مغربی میڈیا اسلام کو بطور دہشت گرد

---

[1] روگ اسٹیٹ، ولیم بیلم، ص54

[2] فرنٹ لائن دسمبر 2001، ص25-26

مذہب کے متعارف کروانے کی خدمات انجام دے رہا ہے۔پہلے اس مقصد کے لیے مسلمانوں کیخلا ف بنیاد پرست کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی مگر اس میں لفظی طور پر کوئی ایسی تاثیر نہ تھی کہ جس سے مسلمانوں کی برائی ظاہر ہوتی اور ویسے بھی اس اصطلاح کے مستحق اصولی طور پر پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھنے والے وہ عیسائی تھے جو عیسائیت کے بنیادی اصولوں پر زور دیتے تھے۔چنانچہ اب بنیاد پرستی کی جگہ دہشت گردی کی اصطلاح بڑی تیزی سے متعارف کروائی جا رہی ہے کیونکہ اول تو اس میں لفظی طور پر خوف و ہراس کا تصور پایا جاتا ہے اور دوم یہ کہ اس وقت دنیا بھر میں تقریبا مسلمان ہی مختلف خطوں میں آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور سوم اس لیے بھی کہ مغرب کو اگر دنیا بھر میں کسی قوم سے خطرہ ہے تو وہ مسلمان ہیں اور یہ خطرہ محض مادی و سیاسی سطح ہی پر درپیش نہیں ہے بلکہ مغرب کو معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی سطح پر بھی اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے خطرہ لاحق ہے۔

جہاد اور دہشت گردی میں فرق

اس وقت مغربی میڈیا نہایت چالاکی اور عیاری کے ساتھ جہاد کو دہشت گردی سے موسوم کرنے پر کمر بستہ ہو چکا ہے۔اس سلسلے میں پروپیگنڈہ مہم اس کامیابی سے چلائی جا رہی ہے کہ مسلم مفکرین، صحافی اور دانشور بھی اس مسموم فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور فی الواقع جہاد کو دہشت گردی کے مترادف خیال کیا جانے لگا ہے۔حالانکہ جہاد کو دہشت گردی قرار دینا حقائق کے منافی ہے کیونکہ جہاد اور دہشت گردی میں تعریف،مقاصد،آداب اور نتائج ہر پہلو سے زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

جہاد اور دہشت گردی میں تعریف کے لحاظ سے فرق

دہشت گردی کی مختلف تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے خوف و ہراس کی فضا پیدا کرنا،تشدد و قوت اور قتل عام کے ذریعے دہشت پیدا کرنا، بے گناہ لوگوں کو قتل کرنا، بم دھماکے کرنا، سول آبادیوں اور نجی و سرکاری عمارتوں کو تخریب کاری کا نشانہ بنانا۔جبکہ جہاد کی تعریف اس کے برعکس کچھ یوں ہے کہ:۔

ایک صحابی نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ سب سے افضل ہجرت کون سی ہے ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بہترین ہجرت جہاد کی ہجرت ہے، صحابی نے پوچھا کہ جہاد کیا چیز ہے؟ رسول ﷺ نے فرمایا کہ جہاد یہ ہے کہ تم بوقت مقابلہ کفار سے لڑو اور اس راستے میں خیانت نہ کرو اور بزدلی نہ دکھاؤ۔ [1]

چاروں آئمہ، فقہاء اور سلف و صالحین نے اس سے کیا سمجھا؟ جہاد کسرہ جیم کے ساتھ لغت میں بمعنی مشقت ہے اور اصطلاح شریعت میں کفار سے لڑنے میں اپنی پوری طاقت کو استعمال کرنے کا نام جہاد ہے۔ جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے ہر ممکنہ کوشش کرنا، علاوہ ازیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ہر طرح کی جارحیت کا مقابلہ کرنا بھی جہاد ہے۔ معلوم ہوا کہ جہاد اور دہشت گردی اپنی تعریفوں کی روشنی میں اسی طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں جس طرح یہ دونوں لفظ اپنے وجود، اشتقاق اور بناوٹ کے لحاظ سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔لہذا ان دونوں کو ایک ہی چیز قرار دینا عدل و انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔

جہاد اور دہشت گردی میں مقاصد کے لحاظ سے فرق

دہشت گردی کا بنیادی مقصد دراصل مادی اغراضی مقاصد کا حصول ہے۔ اس لیے کسی خاص گروہ یاملک کی معیشت پر کنٹرول کرنا، یا انہیں اپنا تابع فرمان یا حامی بنانا، یا انہیں غیر مستحکم بنانا یا انہیں اپنا آلہ کار بنانا یا ان پر مسلسل خوف طاری رکھنا یا بدامنی کی فضا پیدا کرنا، یا وہاں اپنا سیاسی اثر و رسوخ پیدا کرنا۔ یہ سب دہشت گردی کے اغراض و مقاصدمیں ایسی کوئی بدمعاشی اور غیر اخلاقی حرکت شامل نہیں بلکہ جہاد انتہائی نیک مقاصد اور ان ناگزیر صورتوں میں کیا جاتا ہے جن صورتوں میں ہتھیاراٹھانے پر دنیا کی کوئی قوم قدغن نہیں لگا سکتی۔

جہاد اور دہشت گردی میں نتائج کے لحاظ سے فرق

دہشت گردی کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا میں بد امنی، خوف و ہراس، فتنہ و فساد اور وحشیت و دہشت پھیلتی ہے جبکہ جہاد کے نتیجہ میں دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف قائم ہوتا ہے، فتنہ و فساد، ظلم و تشدد، خوف و ہراس اور وحشیت بربریت کا خاتمہ ہوتا ہے اور مظلوم انسانیت سکھ اور چین کا سانس لیتی ہے۔اگرچہ میدان جہاد میں بھی خون بہتا ہے سروں کے مینار اور لاشوں کے انبار لگتے

[1] صحیح مسلم، حدیث نمبر:3848

ہیں مگر میدان جہاد میں اللہ کے سپاہیوں کا بہنے والا خون اتنا مقدس ہوتا ہے کہ اس کے پہلے قطرے ہی پر اللہ تعالیٰ شہید ہونے والے کے تمام گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔اور اللہ کے باغیوں اور ظالموں کا خون اتنا زہریلا اور گندا ہوتا ہے کہ اسے بہانا ہی دنیاوی امن و امان اور اخروی اجروثواب کا پیش خیمہ ہے۔گویا دہشت گردی کے ذریعے معصوم و بے گناہ لوگوں کا خون بہتا ہے تو جہاد کے ذریعے اصل مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جاتا ہے۔دہشت گردی کے ذریعے اگر خوف و ہراس کی فضا پیدا ہوتی ہے تو جہاد کے ذریعے امن وامان قائم ہوتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

(ولو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض) (1)

"اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے نہ روکتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔"

دہشت گردی اور جہاد کے ان نتائج ہی کی وجہ سے دہشت گرد اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بہت بڑا مجرم ہونے کی وجہ سے سنگین ترین سزا کا مستحق ہے جبکہ جہاد کرنے والا اللہ تعالیٰ کا منظور نظر ہونے کی وجہ سے عام مسلمانوں سے کہیں زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہے۔

دہشت گردوں کی سزا

(انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون فی الارض فسادا ان یقتلو او یصلبو او تقطع ایدیھم و ارجلھم من خلاف وینفوا من الارض ذلک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم) (2)

"ان کی سزا جو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑیں اور زمین میں فساد کرتے پھریں یہی ہے کہ وہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں یا مخالف جانب سے انکے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے۔یہ تو ہوئی ان کی دنیوی ذلت و خواری اور آخرت میں ان کے لیے بڑا بھاری عذاب ہے۔"

(ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاؤہ جھنم خالداً فیھا و غضب اللہ علیہ و لعنہ واعد لہ عذابا عظیماً) (3)

"جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کرڈالے اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔اس پر اللہ کا غضب ہے اور اس کی لعنت ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

---

[1] البقرہ:251/2

[2] المائدہ5، آیت33

[3] النساء:93/4

مجاہدین کا اجر و ثواب

(لا یستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر و المجاهدون فی سبیل الله باموالهم و انفسهم فضل الله المجاهدین باموالهم و انفسهم علی القعدین درجة و کلاّ وّعد الله الحسنیٰ و فضّل لله المجاهدین علی القٰعدین اجرا عظیما) [1]

”مسلمانوں میں سے جو بیٹھ رہنے والے ہیں حالانکہ وہ کوئی عذر نہیں رکھتے اور جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑنے والے ہیں، یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔اللہ تعالیٰ نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت بخشی ہے اور گو نیک وعدہ سب سے ہے لیکن اجر عظیم میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بزرگی دی ہے۔“

جہاد اور دہشت گردی میں آداب و ضوابط کے لحاظ سے فرق

دہشت گردی بذات خود ایک گھناؤنا جرم ہے اس لیے دہشت گردی کے حوالہ سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ اس کے اغراض ومقاصد کی تکمیل میں اخلاقی ضابطوں اور انسانی قدروں کا پاس کیا جاتا ہو گا۔کیونکہ دہشت گردی کا سب سے بڑا ضابطہ ہی یہ ہوتا ہے کہ ”مقصد کی تکمیل ہونی چاہیے“خواہ اس کے لیے کتنا ہی گھناؤنا ذریعہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے اور ذرائع کا گھٹیا ہونا بھی مقاصد کے گھٹیا ہونے پر دلالت کرتا ہے جبکہ جہاد میں اخلاقی قدروں کا پاس کرتے ہوئے شریعت نے بے شمار آداب و ضوابط مقرر کر رکھے ہیں تاکہ بوقت لڑائی صرف انہی ظالموں،سرکشوں اور شوریدہ سروں کا خون بہا جائے جو قرار واقعی سزا کے مستحق ہیں اور معصوم و بے گناہ لوگوں کی جانیں محفوظ رہیں۔علاوہ ازیں ان آداب و ضوابط کی پاسداری کو یقینی بنانے کے لیے شریعت نے جہاد کے اجر و ثواب کو انہی آداب و ضوابط اور حدود و قیود پر موقوف ٹھہرا دیا ہے۔

جنگ سے قبل مد نظر رکھے جانے والے آداب

دنیاوی اغراض ومقاصد سے پرہیز

اسلام میں محض دنیاوی مال و متاع اور صرف مادی اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے اقدامی جہاد کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ ان چیزوں کو ضمنی طور پر ان فوائد میں شمار کیا گیا ہے کہ جو جہاد کے نتیجے میں غالب آنے والے مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں مگر صرف انہیں بنیاد بنا کر جہاد کرنے کو اسلام نے

---

[1] النساء:95/4

گوارا نہیں کیا بلکہ اسلام میں (اقدامی) جہاد کا مقصد غلبہ دین اور حکم خداوندی کی تنفیذ ہے جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس ایک دیہاتی آدمی آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ

(الرجل یقاتل للمغنم و الرجل یقاتل لیذکرو الرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللہ؟ فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ)[1]

"ایک شخص مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص نام کے لیے لڑتا ہے اور ایک شخص ریا کاری کے لیے لڑتا ہے، ان میں سے جہاد فی سبیل اللہ کا مصداق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے لڑتا ہے اس کی لڑائی فی سبیل اللہ ہے۔"

آنحضرت ﷺ کی بعثت و رسالت سے پہلے اہل عرب بھی دنیاوی اغراض و مقاصد کے لیے جنگیں لڑا کرتے تھے چنانچہ ایک مسلمان شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ "اگر کوئی شخص جہاد کا ارادہ رکھتا ہو اور اسکے ذریعے دنیا کا مال و متاع بھی حاصل کرنا چاہتا ہو تو اسکے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'لا اجر لہ' اسکے لیے اللہ کے ہاں کوئی اجر و ثواب نہیں۔ جب لوگوں نے اس آدمی سے آنحضرت ﷺ کی یہ بات سنی تو بڑے حیران ہوئے اور اسے کہنے لگے کہ تم اللہ کے رسول ﷺ سے یہی سوال دوبارہ کرو کیونکہ ممکن ہے تم پہلے اپنے سوال کو واضح نہ کر سکے ہو اسنے دوبارہ اللہ کے رسول سے یہی سوال کیا تو آپ ﷺ نے وہی جواب دیا کہ ایسے شخص کے لیے کوئی اجر و ثواب نہ ہو گا۔ لوگوں نے اس آدمی سے تیسری مرتبہ یہی بات کہی کہ تم اللہ کے رسول ﷺ کے پاس جا کر پھر یہی سوال کرو۔ اس نے تیسری مرتبہ پھر یہ سوال کیا مگر اللہ کے رسول ﷺ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ 'لا اجر لہ' ایسے شخص کے لیے کوئی اجر و ثواب نہیں ہے۔"[2]

شہرت، ناموری اور بہادری دکھانے کے لیے لڑنے کی ممانعت

اسلام نے شہرت نام و نمود، ریاکاری اور فخر و تکبر کا مظاہرہ کرنے کے لیے لڑائی کرنے سے منع کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

(و لا تکونو کالذین خرجوا من دیارھم بطرا و رئاء الناس و یصدون عن سبیل اللہ و اللہ بما یعملون محیط)[3]

---

[1] بخاری: کتاب الجھاد: باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا، حدیث نمبر، 2810

[2] ابوداؤد، کتاب الجھاد: باب فی من یغزو ویلتمس الدنیا، حدیث نمبر، 2516

[3] الانفال: 8/47

"اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے گھروں سے نکل آئے اور وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور وہ جو کرتے ہیں اللہ اس پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔"

جنگ حنین میں محض اس وجہ سے مسلمانوں کو قدرے نقصان اٹھانا پڑا کہ افراد و وسائل کی فراوانی کی وجہ سے ان میں یک گونہ فخر کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔

میدان جنگ کے آداب

غیر مقاتلین کے قتل کی ممانعت

اسلام نے غیر مقاتلین سے لڑنے اور انہیں قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ غیر مقاتلین سے مراد وہ لوگ ہیں جو لڑنے کے لیے نہ خود میدان میں آئیں اور نہ ہی دیگر لڑنے والوں کی مدد کر رہے ہوں مثلا دشمن کے پچھلے کیمپوں اور بستیوں میں موجود مقاتلین کے بیوی، بچے، اسی طرح بوڑھے اور معذور یا زخمی لوگ اور عبادت خانوں میں موجود پرستش کرنے والے وہ لوگ جنہیں جنگ سے سروکار نہیں۔ یہ سب غیر مقاتلین میں شامل ہیں۔ اسلام نے ان سے لڑنے اور انہیں قتل کرنے کیاجازت نہیں دی تاوقتیکہ یہ خود میدان جنگ میں نہ اتر آئے ہوں یا پھر کسی مصلحت کی بناء پر انہیں نشانہ بنانے کی گنجائش ہے وگرنہ نہیں۔

جیسا درج ذیل دلائل سے ثابت ہے۔

1۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک غزوہ میں دیکھا کہ ایک عورت قتل کی گئی ہے تو آپ نے اسے ناپسند کیا اور بچوں اور عورتوں کے قتل سے منع کر دیا۔[1]

2۔ حضرت صفوان بن عسالؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں ایک غزوہ کے لیے روانہ کیا اور حکم دیا کہ **(لاتقتلو ولیدا)**[2] "کسی بچے کو قتل نہیں کرنا۔"

3۔ آپ ﷺ نے ایک آدمی کے ذریعے خالدؓ کو پیغام بھیجا کہ **(لاتقتلن امراۃ ولاعسیفا)**[3] "کسی عورت اور مزدور وغیرہ کو قتل نہ کرو۔"

---

[1] بخاری کتاب الجہاد: باب قتل الصبیان فی الحرب، باب قتل النساء فی الحرب، حدیث نمبر، 3015-3014

[2] مسند احمد 4/240، ابن ماجہ (2857)، السنن الکبری، 8873

[3] ابو داؤد کتاب الجہاد: باب فی قتل النساء، 2669

4۔حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول (جہادی لشکر) سے فرماتے:۔

(انطلقو باسم اللہ علی ملة رسول اللہ و لا تقتلو شیخا فانیا و لا طفلا و لا صغیرا و لا امراۃ و لا تغلو و ضمو غنائمکم و اصلحو او احسنو ان اللہ یحب المحسنین)[1]

"اللہ کا نام لے کر اور اللہ کے رسول کے طریقے پر کوچ کرو۔کسی عمر رسیدہ ضعیف کو قتل نہ کرو، کسی بچے کو نہ چھوٹے کو اور نہ ہی کسی عورت کو قتل کرو۔خیانت نہ کرو مال غنیمت ایک جگہ جمع کرو۔نیکی و احسان کرو بے شک اللہ نیکی کرنیوالوں کو پسند کرتے ہیں۔"

شامی بحران اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا:

جب سے عرب بہار شروع ہوئی اور اس کے بعد 2011ء ہی میں شامی بحران آیا تو اس وقت سے یہ صدا پوری شدت کے ساتھ لگائی جارہی ہے کہ " اسلام اور دہشتگردی کے مابین خاص تعلق ہے اور یہ کہ مذہب اسلام میں امن کا بیانیہ موجود نہیں ہے۔اس کی وجہ وہ شدت پسند جماعتیں ہیں جنہوں نے اسلام کے نام پر نامناسب اور غلط کاروائیاں کیں، ان کے ظلم کو دین اسلام کا پیراہن پہنایا گیا اور یہ کہا گیا کہ یہ جماعتیں اسلامی کی ترجمانی کرتی ہیں۔داعش جیسی تنظیموں نے نہ صرف یہ کہ شام میں اپنی پر تشدد سرگرمیاں جاری رکھیں بلکہ یورپی ممالک میں بھی انہوں نے کئی حملے کیے۔ایسی جماعتوں کی وجہ سے یورپ اور امریکا میں اسلاموفوبیا کو فروغ ملا"۔[2]

مغربی ممالک میں کئی ایسی تنظیمیں ہیں جو دائیں بازو خیال کی جاتی ہیں اور وہ اپنے ملکوں میں دیگر باشندوں کی آمد کی مخالف ہیں۔وہ گلوبلائزیشن کو درست نہیں سمجھتیں اور تحفظ پسندیت کے نظریے کی طرف مائل ہیں۔[3] ان حملوں کے بعد انہوں نے اپنی تحریک مزید پھیلایا اور عام آدمی کے ذہن میں بات راسخ کردی کہ مذہب اسلام امن کا دین نہیں ہے۔

ان کے مطابق " جو شامی مہاجر یا دیگر مسلم ان کے ملکوں میں آرہے ہیں وہ اصل میں دہشت گرد ہیں اور ان کی وجہ سے ملک کی سکیورٹی کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ان کا یہ پروپیگنڈا نہ صرف یہ کہ سماجی سطح پر اثر انداز ہوا بلکہ ان کی سیاست میں بھی یہ پہلو شامل ہو گیا۔اب شناخت کی سیاست یورپ کے اندر ایک اہم جزو ہے۔کوئی بھی سیاستدان

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد: باب فی دعاء المشرکین:2614

[2] حسن طوالبہ، مناقشة الصراع علی العراق،78۔

[3] لزاوادین، السیطرہ الغامضة،149۔

اس پر بات کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شناخت کی اس سیاست کی وجہ سے یورپ میں مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست تحریک شروع ہوئی جس میں کھلے عام مسلمانوں کو اور اسلام کو نشانہ بنایا جاتا ہے"۔ [(1)]

اسلام کو دہشت گردی کے ساتھ جوڑنے کی ابتداء نوے کی دہائی میں شروع ہوئی تھی، جب امریکا نے سرد جنگ میں روس کو شکست دیدی تھی تو اس کے مقابل کوئی اور بیانیہ موجود نہیں تھا جو اس کی استعماری ذہنیت و نظام کو چیلنج کرتا، سوائے اسلام کے۔ اس لیے سرد جنگ کے فوری بعد یہ بیانیہ پوری شدومد سے فروغ دیا گیا کہ اسلام دنیا کے لئے خطرہ ہے۔ یہ امن کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس نقصان یہ بھی ہوا کہ مغربی ممالک میں بھی جہاں جہاں مسلمان آباد تھے ان کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور ان کے ساتھ امتیازی رویہ برتا جانے لگا۔ [(2)]

اسلام کو دہشت گردی کے ساتھ جوڑنے سے بشار حکومت کو فائدہ:

نائن الیون کے بعد یہ پروپیگنڈہ وسعت اختیار کر گیا تھا۔ پھر جب شام میں مظاہرے شروع ہوئے اور بالآخر مسلح شکل میں تبدیل ہوئے تو اس میں رطب ویابس شامل ہو گیا۔ اس صورتحال کو شامی حکومت اور مغربی قوتوں نے ایک موقع سمجھا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ" شام میں دہشت گردی نمو پا رہی ہے۔ اس کے پردے میں شامی حکومت کے ظلم وستم اور اس کی حلیف مسلح جماعتوں کی سفاکیت کو بھی نظر انداز کر دیا گیا"۔ [(3)]

شام کے بحران کو صرف داعش کے مسئلے کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ شامی عوام کی شہری حقوق کے لیے شروع ہونے والی جدوجہد اور اس کے بعد سب قربانیوں کو بھلا دیا گیا۔

شام میں جو مظاہرے شروع ہوئے وہ مساجد سے منظم کیے گئے تھے۔ یہ سب مظاہرے پرامن تھے۔ ان میں کسی بھی طرح کی شدت پسندی کی طرف دعوت نہیں دی گئی تھی۔ لوگ بشار الاسد سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ماضی میں اصلاحات کے کیے گئے وعدے پورے کیے جائیں۔ لیکن جب بشار حکومت نے انکار کیا اور سخت لہجہ اپنایا تو اس کے بعد کچھ لوگوں نے مسلح کاروائیاں شروع کر دیں۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنی شروع ہوئیں۔ ان جماعتوں میں جبہۃ النصرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ شامی افواج کے خلاف کامیاب حملے کر رہی تھی۔ لیکن 2012ء میں امریکا نے اس پر یہ کہہ کے پابندی عائد کر دی کہ یہ دہشت گردی کو فرغ دینے والی تنظیم ہے اور اس کا تعلق القاعدہ سے ہے۔

---

[1] لزاوادین، السیطرہ الغامضۃ، 155

[2] زیادہ رضوان، الاسد والصراع علی الشرق الاوسط، 110۔

[3] لزاوادین، السیطرہ الغامضۃ، 157۔

اسی دوران داعش نام کی جماعت بھی وجود میں آگئی یہ جماعت بشار حکومت سے زیادہ ان مسلم مسلح تنظیموں سے برسرپیکار تھی جو شامی حکومت سے لڑ رہی تھی۔ ان میں جبہۃ النصرہ اور جماعت الاحرار نمایاں تھیں۔ جن علاقوں پر ان جماعتوں نے قبضہ کیا تھا اور شامی افواج کو شکست دی تھی داعش ان علاقوں کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے لڑتی رہی۔ اس دوران شامی حکومت نے بھی داعش کے خلاف کاروائیاں نہیں کیں کیونکہ وہ اس کے خلاف کوئی خطرہ نہیں بن رہی تھی بلکہ وہ شامی تنظیموں کی تکفیریت کر کے ان سے دست و گریبان تھی۔[1] داعش کا طریقہ کار انتہائی سفاکانہ اور ظالم تھا، اس کا میڈیا سیل بھی مضبوط تھا جو ان کاروائیوں کو براہ راست دنیا کو دکھارہا تھا۔ داعش فوری طور پہ اپنا رعب و دبدبہ بٹھانا چاہتی تھی۔ اس نے بشار حکومت کے خلاف بھی بعد میں کچھ کاروائیاں کیں لیکن اس کے ساتھ ملک کی اقلیتوں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ حالانکہ شامی بحران بشار حکومت کے خلاف شروع ہوا تھا لیکن داعش نے اس کا رخ اس سے زیادہ دیگر طبقات کی جانب رکھا۔ شام میں موجود کردوں کی آبادیوں پر حملے کیے، مسیحیوں کو نشانہ بنایا اور اہل تشیع کے عام لوگوں پر بھی مظالم ڈھائے۔[2] اس سب کے دوران شامی حکومت بھی ملک میں عوام کا خون بہا رہی تھی لیکن دنیا میں صرف داعش کے مظالم کو ہائی لائٹ کیا جانے لگا اور اس تنظیم کو خالص خلافت کی جماعت قرار دیا گیا جو کھوئی ہوئی اسلامی سلطنت کی بازیابی کے لیے کوشاں ہے۔[3] اس خیال کے تحت مغربی ممالک میں براہ راست اسلام کو دہشت گردی کا مذہب کہنے کی روایت پختہ تر ہوتی گئی۔ یہ ایک ایسی تحریک بنی کہ جس نے مذہب اسلام کو ساری دنیا میں بدنام کیا۔

عالمی ممالک کا ذمہ داریوں سے فرار کا جواز:

شام کی مسلح اپوزیشن کو مجموعی طور پہ دہشت گردی کے ساتھ جوڑنے کی وجہ سے امریکا اور مغربی ممالک نے اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کر لیا۔ بطور عالمی قوتیں اور دنیا میں انسانی حقوق کے علمبردار ممالک ہونے کی وجہ سے ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ شام کے بحران میں کردار ادا کرتے ہوئے بشار حکومت کے ظلم سے عوام کو نجات دلائیں اور اسی حیثیت کی وجہ سے دنیا بھر سے ان پر دباؤ بھی تھا، بالخصوص مسلم ریاستوں میں عالمی تنظیموں اور قوتوں کے خلاف یہ تاثر جاگزیں ہوتا گیا کہ وہ تعصب کا شکار ہیں۔ اپنے مفاد اور اسرائیل کے تحفظ کے لیے وہ اس طرح کے

---

[1]The Syrian withdrawal: Where Things Stand,36

[2]عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 288۔

[3]سابقہ مرجع، 290۔

اقدامات کر رہی ہیں۔[1] لیکن ان اداروں اور قوتوں نے ذمہ داری سے فرار کے لیے یہ راستہ اختیار کیا کہ مسلم دنیا اور شامی بحران کو دہشت گردی کے ساتھ نتھی کر دیا جیسے یہ لازم وملزوم ہوں۔
اس وقت کے امریکی صدر نے یہاں تک کہا تھا کہ ” ہمیں ان دہشت گرد تنظیموں سے خطرہ ہے جو مشرق وسطی اور افریقی ممالک میں موجود ہیں۔“[2]

شامی مہاجرت کے بعد مغرب میں دائیں بازو کی جماعتوں کی اٹھان:

شامی بحران اور اس کے نتائج کے دوران یورپ وامریکا میں سفید فام نسل پرستی میں بھی اضافہ ہوا۔ بعض مفکرین کے مطابق داعش جیسی تنظیموں کے مسلح لڑاکوں اور سفید فام نسل پرستوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ ”جہادیوں کی طرح سفید فام قوم پرست بھی ایسے خطرات سے لڑ رہے ہیں جنہیں وہ اپنی تہذیبی شناخت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ سفید فام بالادستی کے تصور کی بنیادیں اس یقین پر قائم ہیں کہ سفید فام نسل بالاتر اور برتر ہے اور اسی سبب اس کا یہ حق ہے کہ وہ باقی ماندہ قوموں پر حکمرانی کرے۔ دو طرح کے خوف اس تصور کی آبیاری میں مدد ومعاون ثابت ہو رہے ہیں، اولاً یہ کہ دیگر نسلی قومیتیں سفید فاموں سے زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں، جس سے اس بات کے قومی امکانات ہیں کہ سفید فاموں کو میسر مواقع سکڑنا شروع ہو جائیں، اور ثانیاً یہ کہ سفید فام نسل آبادیاتی اعداد وشمار کے مطابق عددی تنزلی کی جانب مائل ہے جس کی ایک وجہ مہاجرت بھی ہے۔ جیسا کہ شام کی طرف سے بڑی ہجرت دیکھنے کو ملی۔“[3]

سفید فام قوم پرست اپنے اقتدار اور آبادی، جو ان کی نظر میں سفید فام قومیت ہے، میں کمی کو ”سفید فام نسل کشی“ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی وجہ عالمی سطح پر ہونے والی کثیر نقل مکانی، جمہوریت اور نسائی تصورات کو قرار دیتے ہیں۔ یہ تمام خطرات واندیشے بالآخر ایمان کی صورت ایک ایسے بیانیے میں ڈھلتے ہیں جو اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ سفید فاموں کو اپنے استثنائی اختیارات کی حفاظت، سفید فام اکثریت کی بقا اور سفید فام قوم پرست ریاستوں کی تشکیل کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اقدامات اٹھانے چاہییں۔[4]

---

[1] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 311۔

[2] ہندی احسان، کفاح الشعب العربی، 24۔

[3] Marwan Hisham, Brothers of the Gun,119

[4] Rees Erlich, Inside Syria: The Backstory of Civil War ,158

”القاعدہ اور داعش کے خلاف کارروائی کرنا آسان ہے کیوں کہ یہ تنظیموں یا اداروں کی صورت میں موجود ہیں، لیکن سفید فام قوم پرستانہ رجحانات کے حامل افراد سماج بھر میں بکھرے ہوئے ہیں، ایسے غیر منظم اور منتشر افراد کے خلاف معلومات اکٹھی کرنا، سماج میں ان کی سرایت پذیری کے آگے بند باندھنا، ان کی جانب سے پیدا شدہ خطرے کے حجم کا اندازہ لگانا یا ان کی کسی بھی قسم کی کارروائی کو روکنا قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے جان جوکھوں کا کام ہے۔“(1)

ایسے میں یہ سوال ضرور اہم ہو جاتا ہے کہ کیا دنیا انسداد دہشت گردی کی ایک اور عالمی مہم کے لیے تیار ہے؟ اسلام پسند دہشت گردوں کی طرف سے پیدا شدہ خطرات کے خلاف جنگ پر جہاں مغربی حکومتیں، ذرائع ابلاغ، سلامتی کے ادارے اور سیاسی اشرافیہ یکسو اور باہم متفق ہیں، وہاں لیکن وہ سفید فام قوم پرستی کے حوالے سے منقسم نظر آتے ہیں۔ یہ عنصر بذاتِ خود سفید فام تشدد کے اس خطرے کو پروان چڑھانے اور بلاخوف آگے بڑھانے کا موجب بنے گا۔ فاکس نیوز کے ممتاز نمائندگان سمیت سابق سی آئی اے چیف اور موجودہ سیکرٹری آف اسٹیٹ مائیک پومپیو، سابق صدارتی مشیر اسٹیو بینن اور ریپبلکن رکن کانگریس اسٹیو کنگ جیسے امریکی حکومت کے موجودہ و سابقہ اراکین سمیت کئی مقتدر اور طاقتور شخصیات انتہا پسند جذبات کا پرچار کرتی نظر آئی ہیں۔(2)

2010 میں دہشت گردی کے حوالے سے منعقدہ ایک مباحثے میں ابھرتے ہوئے اس رجحان کی نشاندہی کی گئی تھی۔ Anti-Defamation League کی جانب سے جاری کردہ حقائق آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں، جن کے مطابق 2018 کے دوران امریکہ میں مقامی دہشت گردوں کے حملوں میں 50 افراد کو قتل کیا گیا، ان حملوں میں ملوث ہر ایک حملہ آور کا تعلق دائیں بازو کے ایک گروہ سے تھا۔ سفید فام قوم پرستی کو دہشت گردانہ خطرہ سمجھنے میں شش و پنج کی کیفیت اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ سفید فام قوم پرست ہنوز حکومتی نگرانیوں میں نہیں رکھے جائیں گے اور یہ چیز انہیں آزادانہ منصوبہ بندی اور اپنے منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کی کھلی چھوٹ دے رکھے گی۔

اسی طرح منتخب حکومتی نمائندوں کی جانب سے سفید فام قوم پرستانہ حملوں کو دہشت گردی سے تعبیر نہ کیے جانے کے باوجود مغرب کے قانون نافذ کرنے والے ادارے اور سکیورٹی افسران پر اس بات کا دباؤ ہے کہ ”وہ سفید فام قوم پرستی کو اس طرح سختی سے زیرِ تفتیش نہ لائیں جیسے وہ دیگر انتہا پسندانہ رجحانات کو لاتے ہیں۔ ان اداروں کے لیے یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ ان میں سفید فام قوم پرست عناصر سرایت نہ کر جائیں۔ گذشتہ ماہ میری لینڈ کے ایک پولیس افسر کو دائیں بازو کے ایک انتہا پسند گروہ کے لیے بھرتیاں کرتے پایا گیا۔ اسی ماہ میں ہی کوسٹ گارڈ کے ایک

---

[1] Rees Erlich, Inside Syria: The Backstory of Civil War ,161

[2] سابقہ مرجع، 164۔

لیفٹننٹ کو ایک بڑے اسلحہ خانے اور کئی سیاسی کارکنان اور ابلاغِ عامہ کے نمائندگان کے ناموں پر مشتمل فہرست کے ساتھ پکڑا گیا۔ اس فہرست میں شامل افراد کو قتل کیا جانا تھا"۔[1]

اسلاموفوبیا کو قانونی جرم تصور کیا جائے:

شامی بحران کے بعد مغربی ممالک کے اندر اسلاموفوبیا میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو پچھلے چند برسوں سے تشدد کی شکلیں اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہاں اسلامیت کے عنصر سے خوف یا اس سے دشمنی اب تنظیمی سماجی فکر کے دائرے سے نکل کر باقاعدہ سیاسی نظم کا حصہ بن چکی ہے۔ ان ممالک کا میڈیا بھی واضح طور پہ جانبدارانہ کردار ادا کرتا آیا ہے جس کے باعث مسلمانوں کو تکلیف دینے کے جرائم بڑھ رہے ہیں اور ان کی جذباتی وابستگی کو مجروح کرنے کے لیے قرآن کریم کو جلانے اور گستاخانہ خاکے بنانے کے واقعات بھی سامنے آ رہے ہیں۔

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جب اپنی سرزمین کو چھوڑ کر مغربی ممالک کا رُخ کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے سیاسی و انسانی حقوق کے نظم پر زیادہ اعتماد کرتی ہے اور اسی لیے وہ لوگ تمام اندیشوں سے بے خطر وہاں کے لیے سفر کرتے ہیں۔ اگر تیز رفتار مہاجرت کے بعض ڈیموگرافک اثرات کے خدشات بھی ہیں تو اس کا حل معاندانہ نظریات کی ترویج کی بجائے سیاسی و قانونی ہونا چاہیے۔ نفرت پر مبنی واقعات مسلم نوجوانوں کو اس پر بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ بنیاد پرست تنظیموں کا حصہ بنیں جو نہ صرف ان ممالک بلکہ پوری دنیا کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسلاموفوبیا جس طرح تشدد کی شکلیں اختیار کر رہا ہے اور ایک کمیونٹی کے لیے سخت عدم تحفظ کو جنم دے رہا ہے اسے ایک قانونی جرم شمار کیا جانا چاہیے تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑھتے ہوئے جرائم کے واقعات میں کمی ممکن ہو سکے۔

---

[1] Islamists religion and revolution in Syria,49

باب پنجم

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں موجودہ بحران کا حل

فصل اول

احادیث نبوی کی روشنی میں موجودہ بحران کا حل

اسلام اپنی فطرت میں امن و سلامتی کا دین ہے۔ یہ دین اس وقت نازل ہوا جب عرب قبائل میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت زوروں پر تھی اور قتل و قتال کو ایک معمولی چیز سمجھا جاتا تھا۔ انسانی جان کی حرمت کا تصور موجود نہیں تھا۔ اس بدامنی اور بے چینی کے ماحول میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی۔ آپ ﷺ اہل مکہ، تمام عرب، بلکہ ساری دنیا کے لیے اولین حیثیت میں امن کے داعی کے طور پہ مبعوث کیے گئے۔ آنحضور ﷺ نے لوگوں کو آپس میں لڑنے سے منع فرمایا اور ہمیشہ صلح جوئی کی ترغیب دی۔

اگر سیرت نبویہ کی روشنی میں شام کے بحران کا حل تلاش کیا جائے تو بعید نہیں کہ اس بحران پر جلد قابو لیا جائے۔ ''کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور آپ کے فرامین ایک ایسی زندہ دستاویز اور مینارہ نور ہیں جنہیں سامنے رکھتے ہوئے ہر قسم کے مسئلہ کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔لہذا آئندہ صفحات احادیث مبارکہ کی روشنی میں انسانی جان کی حرمت، باہمی اختلافات کے حل اور خانہ جنگی پر قابو پانے کے مسائل کو زیر بحث لایا جائے گا جس شامی بحران کی بھیانک صورتحال کو ایک پرامن منظر نامے میں بدلا جاسکتا ہے''۔[1]

انسانی جان کی حرمت اور شام کا بحران:

فقہاء نے اسلام کی جو ضرورات خمسہ بیان کی ہیں انہیں آنحضور ﷺ کی تعلیمات و ہدایات سے کشید کیا ہے۔ ان ضرورات خمسہ میں تحفظ جان ومال کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کی مشہور حدیث مبارکہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بہترین مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دیگر لوگ محفوظ رہیں۔[2]

اسی طرح قرآن پاک میں میں بھی آپ کی سیرت کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے کہ وماارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔[3]

ہم نے آپ کو دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ رحمت کا مطلب یہ ہے کہ ایسی ذات جو نرم خو اور مہربان ہو۔ آنحضرت ﷺ کا یہ وصف دلالت کرتا ہے کہ انسانی جان کی حرمت کو کتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

---

[1] زیادہ رضوان، الاسد والصراع علی الشرق الاوسط، 214۔

[2] مسلم ابن الحجاج، صحیح مسلم، حدیث نمبر:925

[3] الانبیاء، آیت:107

اگر اختصار کے ساتھ آنحضور ﷺ کی ذات کو سامنے رکھتے ہوئے اور آپ کی تعلیمات سے رہنمائی لیتے جنگی بحرانوں کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو چند امور آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ سے عیاں ہوتے ہیں، مثال کے طور پہ:[1] قتل کی حرمت، چاہے مسلمان کا قتل ہو یا غیر مسلم کا۔

حیوانات اور چرند پرند کو تکلیف دینے کی حرمت۔

فساد فی الارض اور ماحول کو خراب کرنے کے اقدامات کی حرمت۔

مقاصد شریعت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دنیا کے تمام افراد کے لیے جان کی حرمت کو یقینی بنانے کا کہا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ترغیب وترہیب کے ذریعے سے اس مقصد کو پورا کرنے کا فریضہ سونپا ہے جس کی رعایت رکھنا ہر انسان بالخصوص تمام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل انسانی عزت اور جان کی حرمت کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی تھی۔ لوگ ہجو اور شعر گوئی کے ذریعے ایک دوسرے کو تکلیف دیتے اور تہمتیں لگاتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر بعض اوقات خونریز جنگیں چھڑ جاتی تھیں جو سالہا سال تک جاری رہتی تھیں۔ لوگوں کی عزت وناموس پر انگلی اٹھانا اور ان کی زندگیوں کو متاثر کرنا ایک عام بات خیال کی جاتی تھی۔ مگر جب آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ نے اس رسم کو تبدیل کر دیا اور ایک دوسرے کے احترام پر زور دیا۔ مسلمانوں کو نصیحت کی وہ کسی پر بہتان نہ لگائیں، مل جل کر رہیں اور کسی کو تکلیف دینے سے احتراز کریں۔

خون بہانا، مال لوٹنا اور عزتوں پر حملے کرنا بعثت سے قبل عام بات سمجھی جاتی تھی۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے ان تمام باتوں منع فرمایا۔ خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ، وَأَمْوَالَكُمْ، وَأَعْرَاضَكُمْ، بَيْنَكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا، لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الغَائِبَ، فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسَى أَنْ يُبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْعَى لَهُ مِنْهُ۔[2]

سنو، تم سب لوگوں کے جان، مال اور عزت اسی طرح محترم ہیں جس طرح آج کا دن، یہ مہینہ اور یہ شہر محترم ہیں۔ جو یہ بات سن رہے ہیں وہ اسے غائب تک پہنچائیں، ممکن ہے کہ سننے والا کسی ایسے شخص تک بات کو پہنچائے جو اس کی قدر زیادہ بہتر انداز میں سمجھتا ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لیے ان کے باہمی جان ومال کی حرمت کو واضح کیا بلکہ غیر مسلموں کی جان و مال پر ناحق آنچ کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شام میں جو

---

[1] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات، 183۔

[2] مسلم ابن الحجاج، صحیح مسلم، حدیث نمبر: 72

مسلمان محض مسلکی اختلافات کی اساس پر ایک دوسرے کی جانوں کو ضائع کر رہے ہیں وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

من قتل نفسا معاهدا لم یرح رائحة الجنة وان ریحها لیوجد من مسیرة اربعین عاما۔[1]

جس نے بھی ایک ذمی شخص کو ناحق قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ پائے گا حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کے فاصلے سے سونگھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے:

ألا مَن ظلمَ مُعاهدًا أو انتقصَهُ أو كلَّفَهُ فوقَ طاقتِهِ أو أخذَ منهُ شيئًا بغيرِ طيبِ نفسٍ فأنا خصمُهُ يومَ القيامةِ۔[2]

سن لو، جس کسی نے بھی کسی معاہد اور ذمی پر ظلم کیا یا اس کی حق تلفی کی یا اس سے بغیر اس کی اجازت کے کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے دن اس کے لیے وکیل بنوں گا۔

ان احادیث مبارکہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک انسانی جان کی حرمت کیا ہوتی ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کو کسی ذمی کی جان یا اس کے مال کی حق تلفی نامنظور تھی تو خود مسلمانوں کا ایک دوسرے پر ظلم ڈھانا کتنا ناقابل قبول ہوگا۔ جیسا کہ شام میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ ظلم کو روا رکھا جارہا ہے۔

ایک حدیث مبارکہ میں وارد ہوا ہے کہ حیوانات کو بھی تکلیف دینے کی اجازت نہیں ہے۔ چہ جائیکہ انسان ایک دوسرے کے ساتھ ایسا کریں۔ حدیث میں وارد ہوا ہے، صحابہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ جارہے تھے راستے میں رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس دوران ہم نے دیکھا کہ کہ ایک چڑیا کے دو بچے وہاں ہیں جنہیں ہم نے وہاں اٹھالیا، رسول اللہ ﷺ واپس آئے تو چڑیا شور مچارہی تھی۔ آپ نے پوچھا کہ اس کے بچے کو کس نے اٹھایا ہے تو جواب دیا گیا کہ ہم نے اٹھایا ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بچے کو اسے واپس کرو۔[3]

اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے، صحابہ نے فرمایا: ہم ایک سفر پر تھے راستے میں ایک جگہ چیونٹیوں کی بستی تھی جسے ہم نے جلا دیا، جب آپ ﷺ کو علم ہوا تو سوال کیا کہ اسے کس نے جلایا ہے تو جواب دیا گیا کہ ہم نے جلایا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ آگ کے ساتھ جلانے کا حق صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے۔[4]

---

[1] ابو عیسی محمد ترمذی، سنن ترمذی، حدیث نمبر:11772

[2] ابو داود سلیمان ابن الاشعث، سنن ابی داود، حدیث نمبر:1361

[3] ایضاً، حدیث نمبر:574

[4] ابو عیسی محمد ترمذی، سنن ترمذی، حدیث نمبر:369

امن وامان، راحت اور عدالت ایسے مقاصد ہیں جن کی رعایت رکھنا سب کے لیے لازم ہے۔ انسان کے لیے تو بدرجہ اولی اس کا فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ معاشرے میں امن کے قیام اور عدالت و انصاف کی فراہمی کے کوشاں رہتے ہوئے سیرت نبوی ﷺ کو رہنما بنائیں۔ بالخصوص جب حالت جنگ میں ہوں یا ایک دوسرے کے لیے بدگمانی اس حد تک بڑھ جائے کہ مصالحت ممکن نہ رہے تو ایک لمحے کے لیے رک کر فرامین نبوی پر غور کرنا سیرت مبارکہ کی روشنی میں اپنے کاموں و اعمال کا جائزہ لینا چاہیے۔

قتل وغارت سے گریز کیا جائے:

بالفرض اگر کہیں حالت جنگ کا منظر نامہ تشکیل پا جائے تو اس وقت بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ کے دوران بھی قتل و قتال اولین ترجیح نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کو ختم کرنے اور مصالحت کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔ اس کے برخلاف اگر آج کی جنگوں اور مثال کے طور پہ شام کے بحران کی خانہ جنگی پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ قتل کرنے کی طرف راغب ہیں اور یہ تصور راسخ ہو چکا ہے کہ جس کے جان ومال کا زیادہ نقصان ہو گا اس کو شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس غیر انسانی اقدام اور رویے کی وجہ سے ہزاروں لوگ مارے جاچکے ہیں اور ہزاروں جانیں ضائع ہوتی نظر آرہی ہیں۔ جبکہ سیرت طیبہ ﷺ سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ جنگ اولین ترجیح نہیں ہوتی اور قتل سے گریز کرنا لازمی ہے۔ اس سے آپ ﷺ کے رحمۃ للعالمین کے مصداق ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ رویہ اس وقت شام کے بحران میں بھی مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

باحثین و مفکرین کے اندازوں کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے جتنی جنگیں لڑیں ان سب میں جتنے مسلمان شہید ہوئے یا کفار مارے گئے ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اگر اس تعداد کا موازنہ عالمی جنگ عظیم کے ساتھ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران شریک کل افواج کا 35 فیصد جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نبوی ﷺ عہد کی اور آج کی جنگوں کے مقاصد میں فرق تھا۔ رسول اللہ ﷺ جنگ کو ناپسند کرتے تھے۔ جنگوں کی طرف بامر مجبوری میلان ہوتا تھا ورنہ آپ معاملات کو مصالحت اور بات چیت کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ طاقت کے ہوتے ہوئے بھی غیر مسلموں پر دھاوا نہیں بول دیا جاتا تھا بلکہ اس سے قبل انہیں سرنڈر کرنے کی پیشکش کی جاتی اور انہیں امن کی یقین دہانی کرا جاتی تھی۔ ان کے جان ومال کے تحفظ کو بھی ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ اسی لیے فتوحات کے وقت قتل عام نہیں کیا جاتا تھا۔ بدترین دشمن کو بھی معاف کر دیا جاتا۔[1] جبکہ آج کے زمانے کی جنگوں میں انسانی جان کی حرمت کا پاس نہیں رکھا جاتا اور بری طرح انسانی جانوں کا ضیاع ہوتا

[1] جمال باروت، الاحزاب والجماعات الاسلامیہ، 21

ہے۔ فریق مخالف کا جتنا نقصان ہو اس کو فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس پر فخر کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح کی تباہی پر قومیں فخر کرتی ہیں اور اسے ایک امتیازی شان وشوکت متصور کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی جنگوں میں امن ترجیح نہیں ہوتی ہے۔ جس کے سبب انتہائی نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

شام بحران کے تناظر میں بھی یہ دیکھنے کو ملا ہے۔ مسلکی اختلاف کی اساس پر لڑی جانے جانے والی جنگ میں فریق مخالف کا زیادہ سے زیادہ نقصان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا مقصد مخالف پر رعب ودبدبہ بٹھانا اور طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں تشدد کے نت نئے طریقے بھی رائج دیے گئے اور ان کی کہانیوں کو سرعام بتایا گیا تاکہ اپنی طاقت کو پختہ کیا جاسکے اور نفسیاتی طور پہ دشمن کو کمزور کیا جاسکے۔[1]

جب آپ ﷺ ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچے تو اس وقت وہاں بھی خانہ جنگی کی صورتحال تھی۔ آپ نے جو وہاں سب سے پہلا خطبہ دیا اس میں فرمایا تھا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَفْشُوا السَّلاَمَ وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الأَرْحَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلاَمٍ۔[2]

اے لوگو: امن کو پھیلاؤ، اور جنت میں امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

اس کے بعد جب تاریخ انسانی کا پہلا مدنی دستور لکھا گیا تو آپ ﷺ نے اس میں مدینہ منورہ کے یہودیوں اور عیسائیوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا، ان کے کلیساؤں کو منہدم نہیں کیا اور انہیں اپنی عبادت کرنے کی مکمل آزادی دی گئی۔[3]

اخف الضررین پر عمل

رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کے کئی اہم مواقع پر مصالحت کو جنگ کے اوپر ترجیح دی۔ اس کی سب سے بڑی مثال صلح حدیبیہ کی ہے۔ اس مصالحت پر بہت سارے صحابہ کرام حیران تھے اور ان کی رائے تھی کہ اس طرح کی شرائط پر مصالحت نہیں کرنی چاہیے جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔ مگر آپ ﷺ نے پھر بھی صلح کو ترجیح دی۔[4] لہذا اگر خون آدمیت کا تحفظ مقصود ہو اور جان ومال محفوظ کیے جاسکتے ہوں تو پھر ضروری ہے کہ ایسی شرائط پر بھی صلح کرلی جائے جن میں اپنی کمزوری ظاہر ہوتی ہو اور پلڑا اجھکا ہوا نظر آتا ہو۔

---

[1] سابقہ مرجع،36۔

[2] ابو عیسی محمد ترمذی، سنن ترمذی، حدیث نمبر:373

[3] جمال باروت، الاحزاب والجماعات الاسلامیہ،67۔

[4] جمال باروت، الاحزاب والجماعات الاسلامیہ،98۔

اسی طرح انتقام کی خاطر جنگ کو طول نہیں دینا چاہیے بلکہ عفو و در گزر سے کام لیتے ہوئے جنگ بندی پر آمادہ ہونا چاہیے۔ اسلام نے معاف کرنے کو انتقام پر ہر طرح سے ترجیح دی ہے۔ جب آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں فتح کے بعد حجۃ الوداع کا خطبہ دیا تھا تو فرمایا تھا کہ:

أَلَا وَإِنَّ كُلَّ دَمٍ مِنْ دَمِ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ۔[1]

زمانہ جاہلیت کے تمام خون ساقط کیے جاتے ہیں۔

اسی طرح جنگ خندق کے دوران خیبر کے یہود نے مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا معاہدہ توڑ دیا تھا۔ جب اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اہل خیبر کی طرف روانہ کیا تو وہ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ہم گھوڑوں پر سوار ان کے ساتھ قتال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ ہماری طرح مؤمن ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے جواب دیا:

اطمنیان اور ٹھہراؤ کے ساتھ، جب تم ان کے گھروں کے پاس پہنچو تو پہلے انہیں اسلام کی دعوت دو اور انہیں بتاؤ کہ ان پر خدا کی طرف سے جنگ کرنا واجب ہے۔ اللہ کی قسم کسی ایک شخص کا ہدایت کو قبول کرنا سرخ گھوڑوں سے زیادہ بیش قیمت ہے۔[2]

اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ امن امان اور احترام انسانیت کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ سیرت رسول اس بات کی گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے طاقت کے ہوتے ہوئے بھی معاشرے میں امن کو ترجیح دی۔ جنگ سے قبل عموما سپہ سالار اپنے متبعین کو غصہ دلاتے ہیں اور دشمن پر بے رحمی کے ساتھ چڑھ دوڑنے کی ترغیب دلاتے ہیں لیکن آپ ﷺ ایسا نہیں کرتے تھے، آپ جنگ سے قبل بھی اس چیز کو یقینی بناتے کہ لوگوں کا قتل ناحق نہ ہو اور کم سے کم نقصان کے ساتھ امن کو بحال کر دیا جائے۔ شام میں اس وقت جو ہو رہا ہے اگر وہاں شریک مسلح و غیر مسلح جماعتیں آپ ﷺ کی زندگی سے سبق حاصل کریں تو خانہ جنگی کو جلد از جلد اپنے انجام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

شام کا مسئلہ اور احادیث کی روشنی میں قوانین جنگ و حرب:

مزید بر آں حالت جنگ کے لیے بھی آپ ﷺ نے جو قوانین واصول اپنی امت کو دیے وہ آج بھی مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ بچوں کو جنگ اور اس کے نقصانات سے دور رکھنے کی نصیحت فرمائی۔ کئی مواقع پر جب جنگ کے لیے بھرتی کرنے کا وقت آتا تو کم عمر لڑکے بھی جذبہ جہاد کے تحت شرکت چاہتے تھے مگر آپ ﷺ ان کو واپس بھیج دیتے۔ آج شام کے بحران میں جو مسلح تنظیمیں وجود میں آئی ہیں وہ بچوں کو بھرتی کرنے کو تو کوئی مسئلہ سمجھتی ہی نہیں، بلکہ الٹا بچوں کے بے دریغ اور وسیع پیمانے پر قتل میں ملوث ہیں۔ یہی عمل حکومتی

---

[1] ابو داود سلیمان ابن الاشعث، سنن ابی داود، حدیث نمبر: 1245

[2] ایضاً، حدیث نمبر: 657

افواج بھی دہرا رہی ہیں۔[1] کتاب مغازی کے ابواب کو پڑھا جائے تو اس میں جنگ کی تعلیمات کے متعلق جو خطبے نقل کیے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کس طرح آپ ﷺ اپنے صحابہ کو تلقین کرتے کہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، درختوں کو نہ جلانا اور جانوروں کو ایذا مت دینا۔[2]

ایسے ہی آپ ﷺ نے دشمن کی اولاد اور ان کے رشتہ داروں کو انتقام کے طور پہ مارنے کی اجازت نہیں دی۔ حضرت اسود بن سریعؓ فرماتے ہیں کہ ایک جنگ کے موقع پر میں آپ ﷺ کے ساتھ تھا، اس دوران دو بچے بھی قتل ہو گئے، جب آپ ﷺ کو علم ہوا تو فرمایا بعض لوگوں کو کیا ہو گیا کہ انہوں نے بچوں کو قتل کر ڈالا، کسی نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ﷺ وہ مشرکین کے بچے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بچوں کو قتل مت کرو، بچوں کو قتل مت کرو۔[3]

ان احادیث مبارکہ کی روشنی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ امن کو پسند کرتے تھے چاہے کمزور شرائط پر ہی کیوں نہ ہو۔ شامی بحران کی کشت و خون آگ کو بجھانے کے لیے نبی کریم ﷺ کی سیرت بہترین نمونہ ہے۔ اگر شامی حکومت اور مخالفین سیرت نبویؐ پر تھوڑا سا بھی عمل کریں تو کم از کم شام قتل و غارت گری سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام قتل ناحق کی کسی صورت بھی اجازت نہیں دیتا۔

---

[1] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات، 212

[2] علی باروت، مسارات السلطۃ والعارضہ فی سوریا، 17۔

[3] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات، 219۔

فصل دوم

علماء و مذہبی دانشوروں کا کردار

مسلم معاشروں میں علماء اور مذہبی دانشوروں کا کردار انتہائی اہم رہا ہے۔ حالانکہ دنیا کے سیاسی معاملات سے اب مذہب کا کردار سکڑ چکا ہے لیکن مسلم ممالک میں یہ اب تک باقی ہے اور شہریوں نے اسے مسترد نہیں کیا ہے۔ شام کے بحران کو بھی دیکھا جائے تو یہ اپنی اصل میں ایک نظریاتی اساس پر قائم کشمکش ہے جس میں دین اور دینی فکر کو بڑا عمل دخل حاصل ہے۔

" استعماری دور کے بعد سے مغربی دنیا کی طرح بعض مسلم ممالک میں بھی سیاست اور سیاسی قضایا سے مذہبی اور مذہبی فکر کو دور کرنے کی کوشش کی گئی لیکن مجموعی طور پہ اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔ اس لیے مسلم سماج میں مذہبی فکر کا عمل دخل اب بھی نمایاں ہے۔ اس بنا پر کوئی بھی پیچیدہ مسئلہ ہو اس میں علماء اور مذہبی دانشوروں کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی حال شام کے بحران کا بھی ہے جہاں پچھلے دس سالوں سے ایک خانہ جنگی کی صورت ہے اور کئی انسانی المیے جنم لے چکے ہیں۔ ایسے میں ضروری ہے کہ اس مسئلے میں علماء اور مذہبی مفکرین کے کردار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے"۔[(1)]

شام کی مذہبی قیادت اور دانشوروں کا کردار:

شام کے معاملے میں مذہب کے حوالے سے جو شبیہ زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی وہ جہادی جماعتوں کی ہے۔ بالخصوص داعش جیسی جماعتیں جو تکفیریت کی قائل ہیں اور انہوں نے تشدد کی کئی بھیانک مثالیں قائم کی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کہ شامی حکومت نے بے دریغ لوگوں کا قتل عام کیا اسی طرح داعش جیسی جماعتوں نے بھی بے دریغ خون بہایا۔[(2)] اس طرح کی صورتحال میں مذہب کو نقصان پہنچا۔ ساری دنیا میں یہ پیغام گیا کہ مسلم سماج کی مذہبی تعبیر قتل و غارت پر یقین رکھتی ہے۔ اس کے بعد مغربی دنیا میں اسلاموفوبیا کے اندر بھی اضافہ ہوا۔ مسلمانوں سے نفرت بڑھی اور یورپ میں کئی بار مسلم مساجد اور مسلم شہریوں کو نشانہ بنانے کی کوشش بھی کی گئی۔ یعنی کہ شام میں مذہبی فکر کی نمائندہ جماعتوں نے اس بحران کو مزید پیچیدہ بنایا۔

---

[1]سعیفان سمیر، تاریخ التدخل فی سوریا، 123۔

[2]سابقہ مرجع، 144۔

ایسا نہیں ہے کہ شام میں عرب بہار کے بعد کوئی ایسا فورم تشکیل نہیں دیا گیا جو معتدل مذہبی فکر کی بنیاد پہ اس مسئلے کا حل چاہتا ہو، بلکہ وہاں متعدد ایسے فورم سامنے آئے لیکن انہیں یا تو معاونت نہیں ملی اور میڈیا کوریج نہیں فراہم کی گئی، یا پھر یہ کہ انہوں نے خود کو اس طرح پیش نہیں کیا جیسے کہ ضرورت تھی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شام سے باہر کی بڑی مذہبی جماعتوں نے اس مسئلے کو انسانی بنیادوں پر نہیں اٹھایا۔ اس دنیا میں کئی ایسی مذہبی تنظیمیں کام کر رہی ہیں جنہیں عالمی سطح کی پذیرائی حاصل ہے لیکن ان کی فکر کا زاویہ مسلکی اختلاف کی اساس پر استوار ہونے کی وجہ سے شام کے بحران میں ان کی رائے وزان دار ثابت نہیں ہو سکی۔

شام کے اندر اس انقلاب کے کے بعد سے کئی طائفے وجود میں آئے جو دینی فکر کی بنیاد پر اس بحران کو حل کرنے کا منصوبہ رکھتے تھے اور اس میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔ جن میں سے بعض کے نام ہیں:[1]

علماء و دعاة الثورة السوریه

2013 میں تشکیل۔ سربراہ: شیخ ممدوح جنید

هيئة الشام الاسلاميه

2011 میں تشکیل. سربراہ ابو محمد الجولانی

رابطة علماء الشام

تشکیل 2012۔ سربراہ شیخ اسامہ عبدالکریم الرفاعی

الملتقی الاسلامی السوری

تشکیل 2012 سربراہ شیخ زہران علوش

هيئة الهلماء الاحرار

تشکیل 2013. سربراہ شیخ فیصل الحسن

المجلس الشرعی

تشکیل 2015۔ سربراہ محمد یاسر ابو کتیبہ

رابطة العلماء السوريين

یہ تمام جماعتیں وہ مذہبی فکری فورم تھے جو اس بحران کے بعد تشکیل پائے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بحران پر قابو پانے اور کسی درمیانی راستے کی تلاش میں معاونت کی جائے۔ مگر ان میں سے کسی نے اب تک کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔

---

[1] علی آزاد محمد، خلفیات الثورة السوریہ، 156۔

بلکہ اکثریت کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ مذہبی حیثیت میں صرف ان جماعتوں کو شنوائی ہوتی ہے جنہیں کسی طاقتور ملک کی جانب سے حمایت حاصل ہو۔ (1)

جلاوطن مذہبی رہنماؤں کا امن میں کردار

شام کی بات جائے تو یہاں عوامی سطح پر جن مذہبی جماعتوں کو پذیرائی حاصل تھی انہیں شامی حکومت نے ملک اور اس کی سیاست سے بے دخل کر دیا تھا جن میں اخوان المسلمون اور جماعت زید شامل تھیں۔ اس کے بعد حکومت نے ایک اور جماعت کو رواج دیا اور اس کی معانت کی جو حکومت کے حق میں تھی، اس کا نام احمد کفتارو تھا۔ اس جماعت کے اہم سربراہان میں محمد سعید رمضان البوطی بھی شامل تھے۔ جب 2000ء میں بشار الاسد کو اقتدار ملا تو اس نے جماعت الاخوان المسلمون کے سربراہان کو ملک میں واپس بلایا تھا۔ اس وقت یہ سمجھا گیا تھا کہ حکومت ماضی کی تلخ یادوں کو رفع دفع کر کے مذہبی فکر کو آزادانہ فضا دینا چاہتی ہے لیکن یہ حقیقت نہیں تھی۔ ملک میں عبد الفتاح ابو غدہ جیسی شخصیات واپس آئیں لیکن ان سے حکومت نے کوئی بات چیت نہیں کی اور نہ بطور ایک جماعت کے سربراہ کے انہیں اجازت ملی کہ وہ جماعت کی سرگرمیوں کو دوبارہ بحال کر سکیں۔ (2)

جب 2011ء میں شام کے اندر مظاہرے شرع ہوئے تو اس وقت بشار الاسد نے حکومت کے حلیف علماء کو اپنی حمایت میں استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور اسے کسی حد تک کامیابی بھی ملی۔ ملک سب سے بڑی مذہبی جماعت کفتارو نے حکومت کو اپنے خطبوں میں یہ نصیحت تو کی کہ وہ عوام پر بے دریغ بمباری نہ کریں اور مصالحت سے کام لیں لیکن وہ سرعام عوام کے ساتھ کھڑے نہیں ہوئے۔ (3) تاہم جب رفتہ رفتہ معاملات زیادہ بگڑتے گئے تو اس جماعت نے بھی بعد میں حکومت پر تنقید کی اور عوام کے ساتھ کھڑے ہوئے لیکن اس وقت تک بشار حکومت اپنے پنجے گاڑ چکی تھی اور اسے کسی مذہبی جماعت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ (4)

شام کی سرکاری جماعت کے علاوہ جب بحران کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو علماء وہ مذہبی مفکرین کو اس لیے بھی میدان میں آنا پڑا کہ انہیں یہ لگا کہ اگر اس بحران میں مذہبی فکر کا کوئی کردار نہ ہوا تو ملک کے مستقبل میں بھی مذہبی فکر کو

---

[1] حمزہ المصطفی، المجال العام الافتراضی فی الثورۃ السوریہ، 264۔

[2] ایضاً، 313

[3] سامی الحداد، مبادرہ العریضہ الشعبیہ، 101

[4] سابقہ مرجع، 243۔

جگہ نہیں ملے گی اور اس انقلاب کی باگ ڈور لبرل اور سیکولر حلقے کے پاس چلی جائے گی۔ اس لیے بھی کئی جماعتیں اور تحریکیں وجود میں آئیں جنہوں نے شامی بحران کے حل میں اپنی مقدور سعی کی اور تجاویز پیش کیں۔ [1]
مثال کے طور پہ جن جماعتوں کا اوپر ذکر کیا گیا وہ سب مگر بحران کے بعد کی پیداوار ہیں۔ ان میں سے آدھی جماعتوں کا تعلق اخوان المسلمون کے ساتھ ہے۔ اگر ایک ہی فکر کی جماعت اتنی تقسیم رکھتی ہو گی اور مختلف ناموں کے ساتھ کئی گروہ بن جائیں گے تو اس کے کیا نتائج سامنے آسکتے تھے۔

شامی مذہبی قیادت کا خلا:

شامی بحران کے حل کے لیے تشکیل دی جانے والی ان جماعتوں میں کئی خلا پائے جاتے ہیں۔ مثلا ان میں شام کے وہ عام اہل علم شامل نہیں ہیں جنہیں نچلی سطح عوام کی جانب سے احترام اور مقبولیت حاصل ہے، بلکہ ان جماعتوں میں بڑے بڑے مناصب کی حامل شخصیات کو اوپر رکھا گیا ہے جن کا دائرہ کار شام کے اندر سے زیادہ باہر ہے۔ یا پھر ان کی انتظامی کمیٹی میں وہ افراد شامل ہیں جو مذہبی مفکرین نہیں ہیں بلکہ کاروباری، سیاسی اور فوجی طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ جماعتیں بڑے بڑے سیمینارز تو منعقد کراتی ہیں اور تجاویز وسفارشات دیتی ہیں لیکن وہ عام شامی شہریوں کی نظر میں بے وقعت اور اجنبی ہوتی ہیں۔ [2] شامی بحران اور شامی عوام کو مسئلے کے حل کے لیے وہ چہرے درکار ہیں جو سیاسی مقاصد نہ رکھتے ہوں بلکہ ان کا مقصد مذہبی فکر کی ترجمانی اور اس کی اساس پر عوام کی ترجمانی کرنا ہو۔ اس طرح کی جماعتیں شام کے عام آدمی کی حمایت حاصل کرسکتی ہیں اور ان کا وزن بھی ہو گا۔
شام میں معتدل مذہبی فکر بحران کے حل میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ حالانکہ مشرق وسطی میں شامی سماج کو قدرے آزاد خیال بھی کہا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود مذہب کا کردار بھی تسلیم شدہ ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ عرب بہار سے ایک برس قبل 2010ء میں جو پانچ کتابیں زیادہ بکنے والی تھیں وہ ساری کی ساری علماء کی لکھی ہوئی تھیں۔ [3]

ان کتب کے نام یہ ہیں: الکفاح العربی، ناصر العظام۔ خطط الشام، محمد کرد علی۔ بلاد اشلام، اسماعیل علی۔ علی اعتبا النہایہ، ہانیہ الشبعی۔ المؤامرۃ الکبری، فاروق الخالدی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عوام میں مذہبی دانش کا اثرورسوخ کتنا زیادہ ہے۔ اور جب انقلاب کے مظاہرے شروع ہوئے تو ان کے مراکز مساجد اور مذہبی مقامات

[1] سمیر یوسف، الموقف السوری من الوجود السیاسی، 46۔
[2] دیب کمال، تاریخ سوریا المعاصر، 120۔
[3] سعیفان سمیر، تاریخ التدخل فی سوریا، 36۔

تھے۔ انہیں مقامات سے مظاہروں کی تنظیم کی جاتی تھی۔ اگر ملک میں انقلاب کے مراکز یہی تھے تو بحران کے وقت میں ان مقامات اور ان کی فکر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شام تاریخی طور پہ بھی مذہب اہل علم کی سرزمین رہی ہے۔ یہاں ابن تیمیہ جیسے جلیل القدر علماء نے جنم لیا، ان کے علاوہ عبد القادر جیلانی اور عبد الغنی المقدسی بھی اسی سرزمین پر پیدا ہوئے۔ کئی سو سال تک اہل علم کی سرزمین رہنے والی یہ جگہ مذہبی دانش کے لیے زرخیز ہے۔ اس ملک میں 30 سال تک مذہبی جماعتوں پر پابندی عائد رہی اس کے باوجود مذہبی فکر کو اس سے ختم نہیں کیا جاسکا۔

لیکن بدقسمتی سے شام کی سرزمین پر مذہبی فکر میں اتحاد نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ سرکاری پالیسیاں رہی ہیں۔ تاہم مجموعی طور صورتحال یہ ہے کہ یہاں ایک ادارہ جاتی حیثیت میں کوئی ایک بھی دینی دانش کا حلقہ موجود نہیں رہا ہے جس کا اثر سب میں تسلیم کیا جاتا ہو۔ عرب بہار سے قبل بھی یہ حالت تھی دمشق اور حلب کے علماء کی تقسیم نمایاں تھی۔ ایک شہر کے علماء کی کتب دوسرے شہر میں نہیں بیچی جاسکتی تھیں۔[1] اس طرح کی تقسیم اور دانش کے بحران نے شام کے موجود بحران میں اتحاد کو پیدا نہیں کیا بلکہ اسی طرح ٹکڑوں میں بٹ کر بحران کے حل میں حصہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ لہٰذا علماء اور مفکرین کو چاہیے کہ وہ آپسی اختلافات کو بھلا کر ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوں اور ریاست کو ظلم و جبر سے نکالنے میں کردار ادا کریں۔ چھوٹے اختلافات بڑے مقاصد کے حصول میں آڑے نہیں آنی چاہیے۔

شام کی مذہبی فکر میں اختلاف کی تاریخ سو سال پرانی ہے۔ یہ عثمانی خلافت کے اواخر میں اس ڈگر پر چلی تھی۔ اس کے بعد سلفی جماعت کے ظہور نے بھی لوگوں کو تقسیم کیا۔ سلفی جماعت اسد خاندان کی سیکولر پالیسیوں کی حمایت کرتی رہی ہے۔ مگر جب عرب بہار شروع ہوئی تو داعش نے بھی اسی فکر سے جنم لیا اور ہر ایسی علامت کو کفر قرار دیا جو سیکولر اور لبرل حلقے سے تعلق رکھتی ہو۔

مذہبی دانش کی ادارہ جاتی حیثیت کی ضرورت:

شامی بحران جس طرح کی شکل اختیار کر گیا ہے اس کے لیے ایک ادارہ جاتی حیثیت کے دینی حلقے کی ضرورت ہے، جیسا کہ بوسنیا میں میں ایک ہی مذہبی ادارہ کام کرتا ہے اور یوگوسلاویا میں بھی ایسی ہی صورتحال ہے۔ شام میں حکومت نے علماء کی طاقت کو بالکل مسمار کر دیا تھا۔ جو سرکاری دینی حلقہ قائم تھا وہ تصوف کی طرف میلان رکھتا تھا اور وہاں ریاست کے سیاسی امور پہ مذہبی تناظر میں کوئی بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ ایک طویل عرصے تک علماء ریاست کے سیاسی امور سے بے گانہ رہے اس لیے بحران کے وقت میں شام کے اندر سے متوقع مذہبی قیادت سامنے نہ

---

[1] ہندی احسان، کفاح الشعب العربی، 88۔

آ سکی۔[1] یہی وجہ ہے کہ ان علماء کی جگہ کو جہادی مسلح جماعتوں نے پر کیا۔ ان جہادی مسلح جماعتوں نے حساس مذہبی معاملات کے اندر رائے دینے سے گریز نہیں کیا اور انجام یہ نکلا کہ آپس میں گتھم گتھی ہو گئے۔ ہر جماعت نے اپنا ایک مفتی متعین کر رکھا ہے اور اس کی رائے حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ ماضی میں جہادی جماعتیں فتوی دینے سے گریز کرتی تھیں[2] اور حساس مسائل میں ان اہل علم سے رجوع کرتیں جن کا مشغلہ علم و دانش ہوتا تھا۔ مگر اب شام کے بحران کے بعد سے منظر نامہ میں تبدیلی آ گئی ہے۔

شام کے مذہبی حلقے میں باہمی تفریق کے علاوہ اب یہ مسئلہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ اس میں دیگر ادیان و مذاہب کے لیے جگہ تنگ ہو گئی ہے۔ مسلکی اختلافات اور فرقہ واریت نے صرف مسلم طبقے کو ہی آپس میں دست گریباں نہیں کیا بلکہ غیر مسلم طبقات کے لیے بھی زمین کو تنگ کر دیا ہے۔[3] شام میں بڑی تعداد میں اقلیتیں رہتی ہیں جو نسلی بھی ہیں اور دینی بھی۔ مثال کے طور پہ آبادی کے کل حصے کا 10 فیصد مسیحیوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح کردوں کی بڑی تعداد وہاں رہتی ہے۔ اس طرح کی اقلیتیں بالکل محفوظ نہیں ہیں اور ان پر مسلسل حملوں کی وجہ سے دنیا میں شام کا اکثریتی دینی حلقہ بدنام ہوا ہے۔ اس لیے مذہبی دانش شامی بحران میں کردار ادا کرے تو اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فرقہ واریت کی طرح غیر مسلم اقلیتوں پر ظلم کو بھی مسترد کرے، بلکہ ان کی حمایت میں کھڑی ہو۔ مذہبی حلقے کا شام میں کردار مسلکی سے زیادہ انسانی اور تمدنی ہونا چاہیے۔ تاکہ اقلیتیں بھی اس کے کردار کو تسلیم کریں۔ ورنہ اگر نسلی و دینی اقلیتیں اسے قبول نہیں کرتیں تو خانہ جنگی کا خاتمہ ممکن نہیں ہو گا۔[4]

اس کے علاوہ مذہب کی کوئی بھی پر تشدد تعبیر شام کے مسئلے میں ان کے کردار کو کم کر سکتی ہے۔ جو مذہبی جماعت بھی اس بحران میں کام کرے وہ عالمی قوانین اور جدید سماجی و انسانی اصطلاحات کو بھی جگہ دے ورنہ ان کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا اور ان کا کردار سکڑ کر رہ جائے گا۔

بحران کے دوران انسانی بنیادوں پر کام کی نوعیت میں رفاہی امور سر فہرست ہیں۔ یہ وہ عملی اقدام ہے جس سے مذہبی حلقہ اپنے لیے وسعت پیدا کر سکتا ہے اور ہر سطح کے فرد تک رسائی حاصل کر کے حمایت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ راستہ مستقبل کے شام میں بھی اس طبقے کے لیے فائدہ مند ثابت ہو گا اور وہ آزادی کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت کا حامل ہو گا۔ شام میں علمی و سیاسی حلقے کی طرح اسد خاندان نے رفاہی حلقے کو بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہاں حافظ

---

[1] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات، 25۔

[2] برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات، 27۔

[3] محمد بوعزہ، الانقلابات العسکریہ فی سوریا، 73۔

[4] سابقہ مرجع، 36۔

الاسد اور بشار الاسد کے ادوار میں مذہبی نوعیت کے رفاہی کاموں پر پابندی تھی تاکہ اس کا اثرورسوخ عوام میں نہ پھیل سکے۔ جو رفاہی کام کیا جاتا تھا وہ ان کاروباری افراد کی جانب سے تھا جو حکومت کی حمایت کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ ان رفاہی اداروں کے سربراہان کو بشارالاسد نے معزول کرادیا تھا تاکہ لوگ ان کے بھی اثرورسوخ میں نہ آجائیں۔ (1)

13 مئی 2018ء میں المجلس الاسلامی السوری نامی شام کی مذہبی جماعت نے ایک تفصیلی اعلامیہ جاری کیا تھا جو پہلی مرتبہ کسی مذہبی جماعت کی طرف سے پیش کردہ قومی وحدت کی اساس پر مبنی بیانیہ تھا۔ یہ اعلامیہ عملی طور پہ شامی عوام اور اس کی تاریخ وثقافت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اگر دیگر جماعتیں اس اعلامیے کے تحت اپنی کاوشوں کو لائیں اور اسی نہج پر کام شروع کیا جائے تو یہ سعی ثمر آور ثابت ہوسکتی ہے۔ اس اعلامیے میں کہا گیا کہ شام کی سرزمین کو نہ زمینی حوالے سے تقسیم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے شہریوں کے مابین تفریق کی اجازت دی جائے گی۔ اس کے علاوہ جو اہم نکات اس میں شامل تھے وہ درج ذیل ہیں: (2)

تمام شامی شہری مساوی حقوق رکھتے ہیں اور اپنے فرائض وواجبات کی ادائیگی میں قانون کے ماتحت ہیں۔

ظلم اور انتقام دونوں کو مسترد کیا جائے گا تاکہ خانہ جنگی کو ختم کیا جاسکے۔

شام کے مسئلے کا حل شام کے شہریوں کی آراء وخواہشات کے مطابق ہو۔ دستور میں جو اصلاحات کی جائیں وہ شامی عوام کی ترجمانی کرتی ہوں۔

ہجرت پر مجبور کیے گئے تمام شامی شہریوں کو واپس آنے کی سہولت دی جائے اور ان کے مکان ومتاع کو ان کے سپرد کیا جائے۔

ملک کے عسکری اور سکیورٹی کے شعبے کی از سرِنو تنظیم وتشکیل کی جائے جس میں آمریت کے تمام استعارے مسترد کیے جائیں۔

مذہب تمام انسانوں کو ان کے حقوق دیتا ہے، اس کے نام پر ظلم کی اجازت نہ دی جائے۔

یہ وہ چند تجاویز ہیں جو شام کے بحران کے حل اور اس کے مستقبل کی تشکیل میں مذہبی حلقے نے پیش کیے ہیں جو ہم آہنگی، یگانگت اور احترام انسانیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔

شام میں علماء ومذہبی قیادت کو استعمال میں لاتے ہوئے اور ان کی مدد سے ہنگامی بنیادوں پر کرنے کا پہلا کام تو یہ ہے کہ کسی طرح جاری مظالم کو روکا جائے۔ روس اور شامی حکومت کو جنگ بندی پر آمادہ یا مجبور کیا جائے، زخمیوں اور ضرورتمندوں کے علاج معالجے اور انہیں خوراک بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ دیگر نقصانات کا ازالہ کیا جائے۔ اس

---

[1] لزاوادین، السیطرہ الغامضۃ، 420۔

[2] Rees Erlich, Inside Syria: The Backstory of Civil War ,179

کے لیے ضروری ہے کہ دنیا بھر میں ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائی جائے، مسلم کمیونٹی اور انسانی حقوق کی تنظیمیں منظم انداز سے اپنا احتجاج ریکارڈ کروائیں اور اقوام متحدہ وعالمی طاقتوں سے مسئلے کا غیر جانبدارانہ حل کا مطالبہ کریں۔

اس کے ساتھ ساتھ سنجیدہ اہل علم، دانشور، علمائے دین اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ آج کی دنیا میں اپنے حقوق حاصل کرنے کے کیا کیا طریقے ہیں اور پر امن احتجاج سے کس طرح اپنے مطالبات منوائے جاسکتے ہیں۔ کوئی بھی گروہ یا طبقہ جب یہ دیکھے کہ ارباب اختیار کے فیصلوں سے اس کے مفادات یا حقوق پر زد پڑتی ہے تو ذرائع ابلاغ یا جرگہ کے ذریعے فوراً اپنی آواز متعلقہ حلقوں تک پہنچائی جائے تاکہ حق تلفی کا ازالہ ہو سکے۔ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر فوری رد عمل نہ دیا گیا تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ لاوا پکتا رہے گا اور کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بنے گا۔ اگر ایسے میں کوئی چھوٹا سا مسلح گروہ بھی حکومتی پالیسیوں کے خلاف میدان عمل میں آتا ہے تو اسے بڑی عوامی تائید مل سکتی ہے۔ اس لیے کوشش کی جائے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز نہ کیا جائے اور مقتدر حلقوں تک اپنی بات پہنچائی جائے۔ اس حوالے سے سوشل میڈیا کا سہارا بھی لیا جاسکتا ہے۔ جمہوری معاشروں میں ارباب اختیار بھی عوام میں سے ہی ہوتے ہیں اس لیے انہیں بھی عوامی مسائل پر توجہ دینی چاہیے اور چھوٹے چھوٹے مسائل کو ساتھ ساتھ ہی حل کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ یہی معمولی مسائل عفریت کی شکل اختیار کر لیں اور ان سے نمٹنا مشکل ہو جائے۔

فصل سوم

او آئی سی کا کردار

جس طرح دنیا کی سیاست اور سٹریٹیجک معاملات میں عالمی قوتوں اور ترقی یافتہ ممالک کا کردار اہم ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے دنیا کے متنوع بحرانوں پر قابو پایا جاتا ہے بالکل اسی طرح عالمی تنظیمیں بھی انتہائی اہمیت کی حامل کہلاتی ہیں۔ اس وقت اقوام متحدہ کے بعد او آئی سی ایک بڑی اور ممتاز تنظیم سمجھی جاتی ہے جس میں 57 اسلامی ممالک کو رکنیت حاصل ہے۔ اس کے۔ علاوہ ایسے ملک جن میں مسلمانوں کی اقلیت ہے مگر ان کی تعداد بہت زیادہ ہے تو ان ممالک کو بھی اس کا جزوی حصہ خیال کیا جاتا ہے اور سالانہ سیمینار میں ان ممالک کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ روس بھی اس میں مدعو کیا جاتا ہے۔[1]

او آئی سی کی اس اہمیت اور وقعت کے سبب شام کے بحران میں بھی اس کا کردار نہایت اہم ہو جاتا ہے۔ او آئی سی نے اب تک عملی طور پہ کوئی قابل ذکر قدم نہیں اٹھایا ہے، ماسوائے اس کے کہ شامی حکومت کے اقتدار کی بقاء تک ملک کی رکنیت کو ختم کیا گیا۔ یہ فورم عرب لیگ سے زیادہ طاقتور اور ہمہ جہت تھا، اس میں تمام مسلم ممالک کی شراکت کے ساتھ کوئی جامع منصوبہ تشکیل دے کر بحران کو کسی منطقی انجام تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ ذیل میں چند ایسے نکات پیش کیے جاتے ہیں جنہیں او آئی سی کے فورم کی مدد سے ثمر آور بنایا جا سکتا ہے اور اس سے خانہ جنگی کو ختم کر کے شامی حکومت کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔

مسلح اپوزیشن کو غیر مسلح تحریک کی طرف لے آنا

بشار الاسد یہ بات بارہا ذکر کر چکا ہے کہ کہ شام میں اس کی حکومت کے بغیر انارکی جنم لے گی۔ وہ ملک کے استحکام کی آخری علامت ہے۔ اگر اسے متاثر کیا گیا تو اس کے بھیانک نتائج نکلیں گے۔[2] اس نے اکتوبر 2011ء میں یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسے معزول کرنے کی کوشش کی گئی تو پورا خطہ بدامنی کی آگ میں جھلس جائے گا۔[3]

بشار الاسد کی یہ دھمکی عملاً درست ثابت ہوئی۔ اس لیے نہیں کہ وہ حقیقت میں شامی استحکام کی علامت ہے۔ بلکہ اس کی وجہ شامی اپوزیشن کا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا ہے۔ بشار الاسد حکومت کو مسلح اور غیر مسلح دونوں سطح پر شروع

---

[1] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 454۔

[2] سابقہ مرجع، 443۔

[3] Islamists religion and revolution in Syria, Harmoon Center for Contemporary Studies(216)63

میں انتہائی زبردست اپوزیشن کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن یہ اس لیے ناکام ثابت ہوئی کیونکہ وہ شدید تقسیم کا شکار ہو گئی۔ اور پر تشدد کاروائیوں سے اپوزیشن کو بے انتہاء نقصان ہوا۔ ایک پر امن تحریک سے جو مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں وہ متشدد بن کر نہیں حاصل ہو سکتے ہیں۔ شام کی اکثریت آبادی سنیوں کی ہے اور وہ بدیہی طور پہ ایک ایسی دیوار بن سکتے تھے جو شامی حکوت کی طاقت کا سامنا کر سکتی لیکن اسے خطے میں ملی سطح پر وہ سپورٹ اور تعاون نہیں ملے جو ضروری اور متوقع تھی۔[1]

شامی اپوزیشن کو ممکنہ طور پہ حاصل ہونے والا ایک بڑا تعاون او آئی سی کا تھا۔ اگر یہ فورم کوئی ایسا جامع منصوبہ تشکیل دیتا کہ صرف بیانات کی حد تک رہنے کی بجائے ایسا مربوط نیٹ ورک تشکیل دیتا جس میں اپوزیشن کی تمام جماعتوں کو شامل کیا جاتا اور حکومت کے خلاف سیاسی و غیر سیاسی دونوں شعبوں میں ان کی فوقیت کو ثابت کیا جاتا تو شامی حکومت کو اپنے مطالبات کے لئے مجبور کر سکتی تھی۔ مگر او آئی سی نے اس طرح کو کوئی منصوبہ تشکیل نہیں دیا اور اپوزیشن کو ضروری تعاون پیش نہیں کیا۔

او آئی سی کا شامی بحران میں سب سے ممتاز اور ثمر آور اقدام یہ ہو سکتا ہے کہ شامی اپوزیشن کے ٹکڑوں کو یکجا کرے اور اپنی سرپرستی میں ایک زبردست و مؤثر طاقت کو شام میں اتارے۔ اور اپوزیشن اور حکومت کو باور کرائے کہ پر تشدد کاروائیاں کسی صورت قابل قبول نہیں۔ اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے عوامی فلاح و بہبود کے لئے حکومت اور اپوزیشن کو ایک ساتھ بٹھائے اور کسی متفقہ حل کی طرف بڑھے تاکہ ملک سے خون ریزی ختم ہو سکے۔ اپوزیشن جماعتیں منقسم اس لیے بھی ہوئیں کہ ان کے آپس میں فکری اختلافات تھے۔ کچھ جماعتیں جہادی تھیں، تو کوئی غیر مسلح جدوجہد پر یقین رکھتی تھیں، جبکہ بعض عالمی سطح پر کیمپین چلانے میں مصروف ہیں۔ تاہم فکری و نظریاتی اختلافات کے باوجود بھی ان جماعتوں کو یکجا کرنا اہم اور ضروری ہے۔ اس کے لیے عرب لیگ سے بھی زیادہ مؤثر فورم او آئی سی کا ہے جس کے لیے شام کی تمام اپوزیشن جماعتیں متحد ہو سکتی ہیں۔

اس تناظر میں او آئی سی سمیت مسلم دنیا کی حکومتوں بھی مغرب کی طرح یہ رجحان نظر آیا کہ انہوں نے حقیقی تنظیموں سے بھی لاتعلقی کا اظہار کیا یا اس کی حمایت پر آمادہ نہیں ہوئیں۔ اس کا فائدہ ان پر اکسی تنظیموں کو ہوا جو شامی عوام کے لیے نہیں لڑ رہی تھیں۔ انہیں زیادہ کوریج ملی اور عملی طور پہ ان کا نام اور کردار زیادہ زیر بحث رہے، جو ان تنظیموں کا مطمع نظر بھی ہے۔

اس کشمکش میں شامی عوام کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی مسلح جماعتوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حتی کہ او آئی سی نے بھی ان کے لیے کوئی حمایت کا اعلان نہیں کیا۔ او آئی سی اگر شروع سے ہی ان مسلح مگر منقسم حقیقی جماعتوں کو

---

[1] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 436۔

اپنی سرپرستی میں لیتی اور ان کی حمایت جاری رکھتی تو بشار الاسد کی یہ پیشین گوئی ایک خوش فہمی ثابت ہوتی کہ اس کو ہٹانے کی کوشش میں خطہ انار کی کا شکار ہو جائے گا۔[1] جہاں ایک نقطہ نظر یہ ہے وہیں دوسرا یہ بھی ہے کہ
او آئی سی کو چاہیے کہ مسلح تنظیموں کو باور کرائے کہ تشدد کو ترک کر کے ایک پر امن مگر منظم تحریک شروع کی جائے جس میں عام عوام کو عملی طور پر شامل کیا جائے۔ اور حکومت کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپوزیشن کی تجاویز پر عمل کرے۔

او آئی سی کی جانب سے رکن ممالک کے اختلافات کو ختم کرنے کی ضرورت

سعودی عرب، ترکی اور قطر کے اشتراک کے ساتھ 2012ء میں شامی اپوزیشن کے ساتھ تعاون کے لیے ایک استنبول میں ایک دفتر قائم کیا گیا تھا جس نے محدود سطح پر اپوزیشن کی بعض جماعتوں کو مدد فراہم کی تھی اور انہیں مستقبل میں بھی اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ لیکن یہ دفتر منظم نہیں ہو سکا اور نہ اس نے اپوزیشن کی تمام جماعتوں کو متحد کرنے کے لیے واضح اقدامات اٹھائے۔ بالخصوص بعد میں جب شامی بحران کے قضیے میں ترکی اور قطر ایک علیحدہ بلاک میں شریک ہو گئے اور سعودی عرب کے ساتھ ان کا اختلاف ہوا تو اس دفتر نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا یہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔[2] گویا او آئی سی کے اندر شامل ممالک بھی شامی بحران پر ایک پیج پہ نہیں ہیں اختلافات کا شکار ہیں۔ اگر او آئی سی خود تقسیم کا شکار ہو گی تو پھر شام کی اپوزیشن کو کیسے متحد کر سکے گی۔

2013ء میں شامی فوج کے سابقہ 700 فوجیوں نے اس بات کا اعلان کیا تھا کہ وہ بشار حکومت کے خلاف ایک مؤثر فورس قائم کر سکتے ہیں اور میدان میں اس کا بہتر انداز میں مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ ایک اچھی تجویز تھی۔ اس لیے کہ وہ فوج سے تعلق رکھنے والے افراد تھے جو شامی حکومت کی منصوبہ بند ذہنیت کا مقابلہ کر سکتے اور اسے سمجھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ تربیت یافتہ و منظم طبقہ تھا جن کا مقصد صرف شامی عوام کی ترجمانی تھا۔ یہ وہ لوگ ہو سکتے تھے جن میں کوئی غیر شامی اثر و رسوخ و دخل اندازی کا شبہ نہیں تھا۔ یہ کسی ملک کی پراکسی نہ بنتے۔ مگر بدقسمتی سے اس تجویز کو زبانی کلامی خوش آمدید تو کہا گیا مگر انہیں کوئی تعاون نہیں دیا گیا۔ او آئی سی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔

---

[1] Legal implications of armed conflict in Syria,Harmoon Center for Contemporary Studies(216)71

[2] عمر اسکندر، شوریا ازمۃ نظام وثورۃ شعب، 23

مسلح تنظیموں کا خاتمہ اور پائیدار سیاسی حل کی تلاش

شام میں لڑنے والی تمام جماعتیں صرف مذہبی اور جہادی ہی نہیں ہیں، بلکہ کچھ مسلح جماعتیں لبرل اور سیکولر حلقوں کی بھی ہیں جو بشار حکومت کی آمریت کے خلاف سرگرم ہیں۔ جب کچھ وقت کے لیے شام کی مذہبی مسلح جماعتوں کا اتحاد قائم ہوا تھا تو اس میں ان سیکولر و لبرل جماعتوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔[1] حالانکہ وہ جماعتیں بھی شامی عوام کے حقوق کے لیے لڑ رہی ہیں مگر انہیں وہ تعاون نہیں مل سکا جو مذہبی جماعتوں کو متحدہ حیثیت میں منقسم سطح پر میسر آتا رہتا ہے۔ ان سیکولر جماعتوں میں کتائب شہداء سوریا اور صقور الشام کے نام نمایاں ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں فعال ہیں مگر ان کا نام نہیں لیا جاتا۔ او آئی سی اور دیگر مسلم ممالک کے لیے ضروری تھا کہ مسلح تنظیموں کا خاتمہ کر کے یا انہیں پس پشت ڈال کر غیر مسلح اور معتدل سیاسی جماعتوں کو آگے لے آتی تا کہ اپوزیشن کی جدوجہد کو پر تشدد اور متشدد ہونے سے بچایا جاسکے۔ جس کی وجہ سے شامی حکومت کو پروپیگنڈہ کرنے پورا موقع ملا ہے۔ اگر تشدد کو ترک کر کے منظم انداز میں معتدل جماعتوں کو آگے کیا جائے تو حالات مختلف ہوسکتے ہیں۔ اور حکومتی پروپیگنڈے سے بھی محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

اختلاف کے باوجود ان سب جماعتوں کو متحد کرتے تاوقتیکہ شام کا بحران ختم ہو جاتا، اس کے بعد متفقہ طور پہ ایک جامع منصوبہ تشکیل دیا جاتا جس میں انتقال اقتدا اور جمہوری نظم کے ڈھانچے کی تشکیل میں کردار ادا کیا جاتا۔[2]

شامی کی فوج سے تعلق رکھنے والے سابقہ اہلکار جو ریٹائرڈ ہوئے تھے یا بغاوت کر کے فوج سے الگ ہوئے اس وقت اردن اور ترکی کے پناہ گزین خیموں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں متعدد بار کوشش کی کہ انہیں استعمال کیا اور وہ بہتر انداز نتائج حاصل کرسکتے ہیں لیکن انہیں میزبان ممالک سمیت خلیجی ملکوں نے بھی توجہ نہیں دی، نہ ہی او آئی سی کے اجلاسوں میں اس آپشن کو زیر غور لایا گیا۔[3]

اپوزیشن مسلح جماعتوں کو اچھی تربیت اور جدید اسلحے کی بھی ضرورت ہے۔[4] اس کے لیے بھی او آئی سی کے فورم کو کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ فوج کے بعض اہم سابقہ اہلکار جو خیموں میں پناہ گزین ہیں انہوں نے کئی بار اس معاملے پر خدشات کا اظہار کیا ہے کہ شام میں بر سر پیکار اپوزیشن مسلح جماعتوں میں بات چیت اور روابط کا منظم نیٹ ورک قائم نہ کیا گیا تو شامی حکومت سے چھڑائے گئے علاقوں میں یہ اپوزیشن جماعتیں قبضے کی خاطر باہم گتھم گتھی

---

[1] عمر اسکندر، شوریا ازمۃ نظام وثورۃ شعب، 233

[2] حسام ہرہوری، تصورات الاحزاب المغربیہ للاصلاح السوری، 27۔

[3] سابقہ مرجع، 288۔

[4] عبد الفضل، العرب والتجربہ الآسویہ، 69۔

ہو سکتی ہیں۔ اور حقیقت میں اب ایسا ہو رہا ہے کہ جن علاقوں کو شامی فوج سے مقابلہ کر کے چھڑا بھی لیا جائے تو وہاں یہ جماعتیں اپنے اپنے قبضے کے لیے ایک دوسرے سے لڑ رہی ہیں۔ ان اہلکاروں کے مطابق اگر صورتحال یہی رہی تو مستقبل میں اگر بشار حکومت کا سقوط ہو بھی جاتا ہے تو انارکی ختم نہیں ہو گی اور یہ علاقہ مسلسل پر تشدد کاروائیوں کی زد میں رہے گا۔ لہذا یہ ممکن نہیں ہو گا کہ ایک پر امن سیاسی نظم کھڑا کیا جاسکے۔[1]

سیاسی اپوزیشن میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا

تقسیم اور اختلاف کا معاملہ صرف شام کی مسلح اپوزیشن تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کی سیاسی جماعتیں بھی اسی کیفیت کا شکار ہیں اور ایک ایسی ہم آہنگی کا ماحول بنانے میں ناکام رہی ہیں جس کے ذریعے عام شہریوں کی امیدوں کو تسکین ملتی اور انہیں اطمینان کا احساس ہوتا کہ ملک میں ایک مربوط سیاسی اپوزیشن موجود وفعال ہے۔ اس خلیج کو پر کرنے کے لیے بھی اوآئی سی جیسے ایک فورم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جو شام کے بحران میں کردار ادا کرنے والے پر امن وغیر مسلح ونگ کو اپنا تعاون پیش کرے اور کسی بہتر آپشن کی جانب پیش رفت کو ممکن بنایا جاسکے۔

شام کی اپوزیشن سیاسی جماعتیں بھی مختلف فکری رجحانات و نظریات کی حامل ہیں اور اسی اساس پر ان میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے جو شدید ہو کر اس نہج پر پہنچ گیا ہے کہ ایسی سیاسی اپوزیشن وجود نہیں رکھتی جسے اس گھمبیر بحران میں مرکزیت کی حیثیت حاصل ہو اور وہ تمام شامی عوام کی حمایت کی حامل ہو۔[2] ایسے وقت میں اگر ملک کے اندر سیاسی افق پر بھی غبار ہو گا تو بشار حکومت کا مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے اور اس حکومت کا خاتمہ کیونکر ممکن ہو گا۔

شام کے لیے متحرک متعدد سیاسی اپوزیشن جماعتیں ہیں جن میں سے المجلس الوطنی السوری اور ہیئۃ التنسیق الوطنیہ نام کی دو جماعتیں سب سے بڑی اور معروف خیال کی جاتی ہیں۔ ان دونوں نے جولائی 2013ء میں قاہرہ کانفرنس کے اندر ایک مشترکہ لائحہ عمل پیش کیا تھا، جس میں مل کر شام میں کام کرنے کا منصوبہ اور بشار حکومت کے سقوط کے بعد کی صورتحال پر بات چیت کی گئی تھی۔ انہوں نے نئے شام کے لیے ایک متفقہ دستور پر بھی اتفاق کیا تھا۔ لیکن ان کی کوششوں کو سراہا نہیں گیا اور نہ ان کے ساتھ دیگر سیاسی جماعتوں کے الحاق کی سعی کی گئی تھی۔ سیاسی اپوزیشن کو ملک سے باہر کی عالمی قوتوں نے اہمیت نہیں دی اور نہ او آئی سی نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔ بدقسمتی سے شامی بحران کے تناظر میں صرف مسلح کوششوں کو محور رکھا گیا۔ میڈیا میں بھی اسی حصے کو ہائی لائٹ کیا جاتا رہا، گویا شام کے مسئلے کا حل یا اس سے جڑے مصائب کا تعلق صرف مسلح جماعتوں کے ساتھ ہے۔[3] حالانکہ کسی بھی بحران میں

---

[1] سیار الجمیل، تکوین العرب الحدیث، 98۔

[2] عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ، 510۔

[3] علی باروت، مسارات السلطۃ والعارضہ فی سوریا، 321۔

سیاسی تناظر کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اور اسی تناظر کو تقویت دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی مسئلے کا دیرپا اور حقیقی حل ہوتا ہے۔ مسلح جماعتوں کو بھی سیاسی ونگ کے ساتھ جوڑنا چاہیے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلح گروہوں کی آپس کی خانہ جنگی اور کشمکش کو بھی کنٹرول کیا جاسکتا تھا۔ او آئی سی کا فریضہ ہے کہ وہ سیاسی ونگ کو زیادہ اہمیت دے اور اس میں پڑنے والی دراڑوں کو درست کیا جائے۔

عالمی رائے کو ہموار کیا جائے:

بطور ایک بڑی تنظیم ہونے کے او آئی سی اس بات کو بہتر طریقے سے یقینی بنا سکتی ہے کہ عالمی رائے عامہ کو شامی بحران کی حقیقت کے حوالے سے مکمل طور پہ بے غبار اور ہموار بنایا جائے۔ مغرب میں میڈیا اور بعض عالمی رہنماؤں کی شام کے بحران کو دہشت گردی کے ساتھ جوڑنے کی وجہ سے یہ شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں کہ شاید وہاں پر جاری مزاحمت انسانی اور حقوق کی نہیں ہے بلکہ یہ شامی حکومت اور دہشت گردی کے درمیان جنگ ہے۔ اس لیے مغرب اور ترقی یافتہ عوام کے اندر شامی بحران کی حیثیت تبدیل ہوگئی ہے۔ اس کو غبار آلود کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ شام سے مغربی ممالک ہجرت کر رہے ہیں اس مہاجرت کو بھی میڈیا میں یہ رنگ دیا گیا ہے کہ وہ لوگ دہشت گردی سے جان بچانے کے لیے آئے ہیں، نہ کہ بشار حکومت کے مظالم سے بچنے کے لیے۔ [1]

اس تناظر میں ضروری ہو جاتا ہے کہ سفارتی سطح پر مسلم ممالک ایک کیمپین چلائیں اور عالمی سطح پر عوامی رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ اس سے بشارالاسد کی حکومت پر دباؤ بڑھے گا۔ بشار حکومت نے مسلسل مغربی ممالک میں پرپیگنڈا کیا ہے کہ وہ زیادتی نہیں کر رہے بلکہ ان کی دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے، وہی دہشت گردی جس سے مغرب کو بھی خطرات لاحق ہیں۔ 2018ء میں جب شام سے داعش کے ٹھکانوں کو ختم کر دیا گیا اور انہیں وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا گیا تو دنیا میں بشار حکومت نے یہ تاثر دیا کہ داعش کو اس کی حکومت نے شکست سے دوچار کیا ہے۔ گویا ایک پہلو سے اس نے مغرب میں اپنی شبیہ کو معتدل بنانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ میڈیا نے خود بھی اس واقعے اسی حیثیت میں رپورٹ کیا جیسے بشار حکومت نے دہشت گردی کے خلاف کامیابی حاصل کی ہو۔ [2]

عالمی سطح پر رائے عامہ کو بےغبار اور شامی عوام کے حق میں ہموار بنانے کے لیے سفارتی کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ او آئی سی اپنے ایجنڈے کے تحت اقوام متحدہ کے فورم کے ذریعے بھی اس تاثر کو بدلنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ اور اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل کو بحران میں کردار ادا کرنے کیلیئے دباؤ بڑھائے تاکہ سلامتی کونسل

---

[1] علی باروت، مسارات السلطۃ والعارضہ فی سوریا، 265۔

[2] محمد المبارک، ترکیب المجتمع السوری، 123۔

حرکت میں آئے اور شامی حکومت پر دباؤ بڑھایا جائے کہ خون ریزی کو فوراً روکا جائے۔ اور متفقہ حل کی طرف چلا جائے جو حکومت اور عوام دونوں کیلیئے قابل قبول ہوں۔ اور یہ کہ بیرونی مداخلت کو روکا جائے چاہے وہ روس ہیں یا امریکہ کے اتحادی۔ جب تک بیرونی مداخلت کا خاتمہ نہیں ہو گا خانہ جنگی کا خاتمہ نہیں ہو گا۔

مگر یہ بھی واضح ہے کہ او آئی کے طاقتور اور باثر ممبران کا اپنا بھی شام کے معاملے میں کوئی اتفاق رائے موجود نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں مختلف جماعتوں کے توسط سے شام میں پراکسی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس لیے پہلے یہ ضروری ہے کہ او آئی سی کے اندر شامی بحران کے مسئلے پر اتفاق رائے پیدا کیا جائے۔

فصل چہارم

ایران اور سعودی عرب کا کردار

جب سے شام کا بحران شروع ہوا ہے اس وقت سے اب تک وہاں کے مسئلے میں بطور سٹیک ہولڈر اور مؤثر کردار بن کر ابھرنے والے عناصر میں سعودی عرب اور ایران بھی شامل ہیں۔ اگرچہ خطے میں اب ترکی و قطر کا اثر و رسوخ بھی موجود ہے تاہم مقامی سطح پر مشرق وسطی میں ایران اور سعودی کے کردار نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دونوں ممالک کی شامی بحران کے قضیے میں مداخلت واضح ہے اور ان کے آپس کے اختلافات کی وجہ سے معاملات میں مزید پیچیدگی در پیش آئی ہے۔

ذیل میں شامی بحران کے حل میں دونوں ممالک کے ممکنہ کردار پر بات کی جائے گی۔

سعودی عرب کا کردار:

سعودی کی عرب کی شام کے معاملات میں دلچسپی نئی نہیں ہے بلکہ عشروں پرانی ہے۔ ماضی قریب میں جب شاہ عبداللہ مملکت کے حکمران تھے تو انہوں نے اسد خاندان کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے بہت زیادہ کوششیں کیں۔ انہوں نے امریکا کے تعاون کے ساتھ شامی اپوزیشن کو مالی اور اسلحے کی صورت میں مدد کی تاکہ بشارالاسد کو راستے سے ہٹایا جاسکے۔ اس کے بعد جب 2015ء میں شاہ سلیمان سعودی عرب کے حاکم بنے تو انہوں نے پہلے سے زیادہ اس مقصد کے حصول کے لیے کوششیں تیز کردیں حتی کہ ماہرین کے مطابق شام کے اقتدار سے بشار الاسد کو ہٹانا مملکت کی خطے میں سب سے پہلی ترجیح ہے، یمن کے مسئلے سے بھی زیادہ اہم۔[1]

سعودی عرب نے 2016ء کے بعد سے شام میں عملا عسکری طور پر بھی حکومت کے خلاف حصہ لینا شروع کردیا، حالانکہ یہ ایک نہایت فیصلہ تھا اور اس کے اثرات بھی خطرناک تھے مگر محمد بن سلمان کے ترجمان نے کہا تھا کہ وہ اس فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔[2] شام میں مملکت کی فوجی مداخلت اور سیاسی دلچسپی کے کئی اسباب ہیں:

سعودی عرب نے اپنے پڑوسی ملک یمن کے خلاف کچھ وقت سے ایک محاذ کھولا ہوا ہے۔ اس محاذ پر مملکت کو جلد ہی فتح کی امید تھی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ وہاں حوثیوں کی صورت میں ایک نیا خطرہ اٹھ کر سامنے آگیا۔ یہ خطرہ بھی ایران کی طرف سے مسلط کردہ ہے۔ حوثیوں نے سعودی عرب کے اندر بھی وقفے وقفے سے میزائلوں کے ذریعے سے

---

[1] Christopher Philips, The Battle for Syria,23

[2] محجوب زویری، العرب وایران، مراجعة فی التاریخ (دوحہ، المرکز العربی للدراسات، 2013ء)، 241۔

کاروائیاں کی ہیں۔ اس نئے منظر نامے کو دیکھتے ہوئے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جنگ کی طویل اور کھلی پالیسی اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ ایران کے بڑھتے ہوئے اثرورسوخ کو روکا جاسکے جو دن بدن سعودی عرب کے لیے خطروں کا باعث بنتا جارہا ہے۔[1]

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ سعودی عرب ہمیشہ سے ساری مسلم دنیا کے سنی طبقے کے لیے رہنما کی حیثیت کے دعوے کے ساتھ آگے بڑھا ہے۔ شامی بحران میں ایرانی مداخلت اور اس کی طاقت کے خلاف سعودیہ نے فوجی مداخلت کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ دعوے کے مطابق سنیوں کی قیادت کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ زبانی کلامی بات چیت تک ہی محدود نہیں ہے۔

شام میں سعودی مداخلت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مشرق وسطی میں سنی قیادت کے لیے ایک اور مسلم ملک ترکی بھی ابھر رہا ہے اور خلیجی ریاستوں کی عوام اس کے اقدامات اور رجب طیب ارگان کی کرشماتی شخصیت کو پسند کرنے لگی ہے۔شام بحران میں بھی ترکی عسکری سطح پر فعال ہے اور کاروائیاں کرتا رہتا ہے۔ شامی اپوزیشن کا ایک گروہ ترکی کے زیراثر بھی ہے۔ اس صورتحال میں سعودیہ کے لیے یہ خدشے کی چیز ہے کہ خطے میں اس کے متبادل کے طور پہ کوئی اور ملک سامنے آئے،اس لیے شام میں ہر سطح پر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے مملکت پہلے سے زیادہ حساس نظر آتی ہے۔[2]

اس کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ شام بحران کے اختتام اور اس کی مستقبل کی تشکیل میں وہ عناصر زیادہ فعال ہوں گے جو ابھی اس کے حل میں زیادہ کوششیں بروئے کار لارہے ہیں۔ اس کے لیے بڑے سٹیک ہولڈرز میں سے مملکت خود کو بھی حصہ سمجھتی ہے اور مستقبل میں نئے منظر نامے کی تشکیل میں کردار ادا کرنے کی خواہشمند ہے، کیونکہ اس قضیے میں ایران بھی ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ لہذا شامی بحران کے حل میں جس طرح ایران کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اسی طرح سعودی عرب کو بھی نہیں کیا جاسکتا۔

خطے میں ایران و سعودی عرب کے مابین تعلقات کی کشیدگی کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسعت اختیار کرتا جائے گا۔ کیونکہ ایران کا دائرہ کار پہلے سے زیادہ بڑھ رہا ہے۔پہلے لبنان کے معاملے پر سعودی عرب کے شام کے ساتھ روابط متاثر ہوئے۔ پھر عراق پر امریکی حملے کے بعد مشرق وسطی کا دروازہ سمجھے جانے والے ملک میں ایران نے پراکسی حکومت قائم کی جس کی شام نے تائید کی۔ اس کے بعد یمن میں بھی شام و ایران کے کردار نے سعودیہ کے لیے

---

[1] سعیفان سمیر، تاریخ التدخل فی سوریا، 145۔

[2] مجوب زویری، العرب وایران، مراجعة فی التاریخ، 87۔

خطرات میں اضافہ کر دیا۔ ان تمام وجوہات کے پیش نظر یہ چیز عیاں ہو جاتی ہے کہ شامی بحران صرف شام ہی کا بحران نہیں ہے بلکہ یہ اس سے کہیں آگے تک پھیلا ہوا ہے جس میں کئی ممالک براہ راست شریک ہیں۔ (1)
اور اس قضیے میں حزب اللہ اور دیگر جہادی جماعتیں بھی آزادانہ اپنے کردار کے لیے کوشاں نظر آتی ہیں۔ یہ سارا معاملہ آئیڈیالوجکل بیانیوں کے زیر اثر پنپ رہا ہے۔ اگر یہ جیوپولیٹکس یا جیوسٹریٹیجک قضیہ ہوتا تو حل ہونے کے امکان بھی غالب ہوتے مگر یہ آئیڈیالوجیکل بیانیوں کی جنگ ہے۔ آئیڈیالوجیکل بیانیوں کی کشمکش میں انفرادی جتھے بھی خود کو مجاز حصہ دار سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں اعتقادی پہلو غالب ہوتا ہے۔ اس لیے جو ملک شام کے بحران میں کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں جو وہاں فعال جماعتوں کے ساتھ بھی ربط رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ (2)

ان امور کے پیش نظر سعودی عرب کا کردار بھی ہمہ جہت بن جاتا ہے کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ سٹریٹیجک حوالے اس بحران سے متأثر ہوتا ہے بلکہ مشرق وسطی کی قیادت کی دوڑ میں بھی وہ ایک فریق ہے۔ مملکت کی اس حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شام بحران میں اس کا کردار خطے میں ایران کی طرح نہایت اہم و توانا ہے۔ (3) لہذا عالمی قوتوں کو بھی چاہیے کہ وہ اس کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے درمیانی راہ نکالیں جس میں مملکت کے مفادات بھی متأثر نہ ہوں۔ اور خود سعودی عرب کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ خطے میں تمام سٹیک ہولڈرز کے ساتھ مل کر برابری کی سطح پر اس قضیے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔
شامی مسئلے میں مسلم دنیا نے اپنی نگاہیں سعودی عرب کی طرف لگائے رکھی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر سعودی عرب چاہے تو اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا ہے۔ سعودی عرب میں عوامی سطح پر سب سے زیادہ حساسیت شامی قضیے کے حوالے سے نظر آئی۔ عرب بہار سے متأثرہ کسی ملک کے لیے سعودی عوام نے اتنی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا جتنا کہ شامی بحران کے دوران وہاں کی عوام کے لیے دیکھا گیا۔ لیکن سعودی میڈیا میں اس مسئلے کو شروع سے ہی فرقہ وارانہ رنگ میں پیش کیا گیا تھا جس کا فائدہ بشار حکومت کو ہوا کیونکہ وہ بھی اسے مسئلے کو حقوق کی بجائے اسی تناظر میں پیش کرنا چاہتی تھی تاکہ احتجاج کی اس لہر کو سازش قرار دیا جاسکے۔ (4) سعودی میڈیا میں شامی حکومت کے لیے نصیری نظام حکومت کی اصطلاح استعمال کی جا رہی تھی اور عوام بھی اس کو شیعہ تسلط و ظلم سے تعبیر کر رہے

[1] محجوب زویری، العرب وایران، مراجعة فی التاریخ، 99۔

[2] ادھم آل جندی، تاریخ الثورات السوریہ، 66۔

[3] جمال باروت، الاحزاب والجماعات الاسلامیہ، 44۔

[4] محجوب زویری، العرب وایران، مراجعة فی التاریخ، 102۔

تھے۔[1] اگست 2011ء میں شامی حکومت نے سب سے پہلی خونریز اور انسانیت سوز بمباری کی تھی جس میں چار سو سے زائد لوگ مار دیے گئے تھے۔ اس واقعے کے بعد سعودی عرب پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ بالخصوص شامی عوام نے اس کا اظہار کیا۔ ان کے مطابق مملکت نے انہیں مایوس کیا ہے اور محض زبانی کلامی تعاون پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس واقعے کے بعد سعودی عرب نے بھی شامی حکومت کے خلاف سخت موقف اپنایا۔ دوسری طرف ایران اور شامی حکومت شام میں ہونے والے مظاہروں کو سعودی سازش کہہ رہے تھے۔ شام کا سرکاری میڈیا بندر بن سلطان کو ان مظاہروں کا ماسٹر مائنڈ بتاتا رہا۔

ایران اور سعودی عرب کی جانب سے شامی بحران کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالنے کی وجہ سے شام کا مسئلہ الجھ گیا ہے۔ یہ صرف خطے کی جیوسٹریٹیجک منظر نامے میں غلبے کی جنگ نہیں ہے اور نہ اسے آئیڈیالوجیکل بیانیوں کی بھینٹ چڑھایا جاسکتا ہے۔ یہ شامی عوام کے دکھ اور درد کا قضیہ ہے جس میں وہ سب زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ لہذا سعودیہ کے خلیج میں ایک بڑی طاقت ہونے کے ناطے اور مسلمانوں میں اس سے ایک خاص تعلق کی بنا پر ضروری ہے کہ وہ مصالحت اور بات چیت کی طرف پہلا قدم بڑھائے تاکہ اس بحران کو کنارے لگایا جاسکے۔

ایرانی کردار:

شام کے بحران کو پوری طرح سمجھنے اور بشار حکومت کے اب تک قائم رہنے اور خطے کی بدلتی جغرافیائی صورتحال کا ادراک اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ایران کے کردار کو واضح یا اسے تسلیم نہ کیا جائے۔ شامی بحران کو دس سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اس دوران ایران کو بھی عالمی اقتصادی پابندیوں کا سامنا رہا ہے اور خلیج میں بھی اس کو ایک طاقتور مقابل کا سامنا، اس کے باوجود ایران نے شامی بحران سے ہاتھ پیچھے نہیں ہٹایا اور اپنی موجودگی کا مسلسل احساس دلایا ہے۔ ایرانی سہارے اور تعاون کی وجہ سے بشارالاسد کو معزول نہیں کیا جاسکا۔ شام اور ایران کے مابین ربط کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ایرانی مفکر مہدی طائب کے اس قول کو دیکھنا چاہیے جو اس نے 15 فروری 2013ء کو کہا تھا: 'اگر ہم شام کو کھو بیٹھے تو تہران بھی ہاتھ سے نکل جائے گا، ہاں اگر ہم ایران کے علاقے اہواز کو کھو بیٹھے تو جب تک شام میں ہماری اجارہ داری ہے اہواز کو ہم واپس حاصل کرلیں گے'۔[2] اس لیے ایران شام کے بحران میں اپنی بالادست حیثیت کو ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے چاہے اس کی جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

ایران کی خارجہ پالیسی کی بنیاد پانچ ارکان پر قائم ہے:

---

[1] محجوب زویری، العرب وایران، مراجعۃ فی التاریخ، 106۔

[2] سابقہ مرجع، 49۔

1. بطور ایک ریاست کے ایران کی قومی مصلحت کی ترجیح۔
2. خطے میں ایرانی نفوذ اور طاقت کا تحفظ۔
3. خلیج کے پانیوں میں اپنی مؤثر موجودگی کو برقرار رکھنا۔
4. ایران کے شیعہ پڑوسی ممالک کے ساتھ نظریاتی روابط کو استوار رکھنا۔
5. امریکی سیاست کی مخالفت۔[1]

یہ وہ پانچ ارکان ہیں جن پر ایران کی خارجہ پالیسی قائم ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایران کا ملک شام کی سیاست میں کتنا زیادہ عمل دخل ہے۔ اسی لیے شام کا بحران چاہے سنگین ہوتا گیا ایران نے شام سے دستبردار ہونے کا کوئی عندیہ نہیں دیا۔ بلکہ وہ اس ملک کو اپنے لیے جیوسٹریٹجک تحفظ کی ضمانت خیال کرتا ہے۔
شام اور ایران کے اس موجودہ تعلق کی تاریخی حیثیت بھی ہے۔ مثال کے طور پہ 80 کی دہائی میں شام نے اخوان المسلمون کے گرد گھیرا تنگ کیا تھا اس کے عناصر کو ملک سے جبری طور پہ بے دخل کر دیا تھا، اس پر سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں نے ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ اسی دہائی میں ایران کی عراق کے ساتھ جنگ ہوئی تھی جس میں سعودی عرب اور دیگر سنی خلیجی ریاستیں عراق کے ساتھ کھڑی تھیں جبکہ شام کی ہمدردیاں ایران کے ساتھ تھیں۔ ایسے ہی اسی عہد میں شام کی اسرائیل کے ساتھ جنگ ہوئی اور گولان کی پہاڑیاں اسرائیل کے قبضے میں چلی گئیں۔ ایران بھی اسرائیل کے ساتھ کھلی عداوت کا اظہار کرتا ہے۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے سے قبل اسرائیل کے معاملے میں مصر شام کا سٹریٹجک ساتھی تھا مگر اس معاہدے کے بعد وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد ایران کی صورت میں شام کو اسرائیل کے خلائی خطے میں سٹریٹجک ساتھ دستیاب ہوا۔ عراق پر امریکی حملے کے وقت بھی دونوں ملکوں نے اس کی حمایت کی تھی۔ یوں کئی تاریخی عوامل کی وجہ سے بھی دونوں ملک ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔[2] اسی بنا پر شام کے موجودہ بحران کی سنگینی میں ایرانی کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کسی حل کی طرف انتقال کے مرحلے میں اس کی حیثیت کو ختم کیا جاسکے گا۔
حالانکہ ماضی میں چند بار ایسا ہوا کہ دونوں ممالک کی پالیسی میں قدرے اختلاف تھا لیکن دونوں نے باہمی انحصار اور جیوسٹریٹجک معاونت کو ختم نہیں کیا۔ مثال کے طور پہ نوے کی دہائی میں شام نے اسرائیل کے ساتھ مذاکرات کیے تھے جس پر ایران کو ناگواری ہوئی لیکن ان کا تعلق ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے باوجود بھی شام نے اپنی حدود میں ایران کو رسائی دی جس سے اس نے اسرائیل کے خلاف ایک سیاسی محاذ قائم کیے رکھا اور حماس کے ساتھ معاونت

---

[1] سمیر یوسف، الموقف السوری من الوجود السیاسی، 46۔

[2] The Syrian withdrawal: Where Things Stand,35

کی صورت میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ شام کی حدود میں رسائی ہی کی بنیاد پر ایران لبنان میں حزب اللہ کے ساتھ بھی براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ [1]

گویا شام میں ایران کی رسائی اور وہاں پر مداخلت کی مکمل آزادی کی وجہ سے ایران عالمی پابندیوں کے باوجود تنہائی کا شکار ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ اس میدان سے وہ خطے میں بھی سرگرم ہے اور اسی مقام سے وہ اسرائیل و لبنان سے متعلقہ معاملات میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلائے ہوئے ہے۔ اس لیے عالمی طاقتیں اس سے اختلاف کے باوجود بات چیت پر مجبور رہتی ہیں اور اس ملک سے لاتعلق نہیں رہ سکتیں۔ [2]

2003ء میں عراق پر امریکی حملے پر شام وایران کا موقف ایک تھا کہ صدام حسین کو عراق سے الگ کر دیا جائے کیونکہ دونوں اس کی حکومت کے مخالف تھے۔ لیکن اس ہم آہنگی کے باجود شام وایران کا عراق میں انتقال اقتدار کے معاملے میں اختلاف تھا۔ شام کا موقف تھا کہ عراق میں صدام کے متبادل کے طور پہ فرقہ وارانہ حکومت کا قیام عمل میں نہ آئے اس لیے اس نے ایاد علاوی کیمپ کو سپورٹ کیا تھا۔ یہ کیمپ حکومت کی تشکیل میں کامیاب ہو بھی گیا، مگر ایران اس تجویز کا قائل نہیں تھا، اس کے مطابق عراق کی متبادل حکومت اس کی ہمنوا ہونی چاہیے۔ ایاد علاوی نے متعدد بار ایران کی عراق میں مداخلت کو کوششوں پر تنقید کی تھی۔ ایران نے عراق میں اپنی پسند کی حکومت کے قیام کے لیے شام سے رابطہ کیا اور اسے اس پر قائل کر لیا تھا کہ وہ ایاد علاوی کی سپورٹ ختم کر کے نوری المالکی کو سپورٹ کرے، ایران اور نوری المالکی نے اس کے بدلے شام کو عراقی تیل کی فراہمی کا یقین دلایا جو امریکی حملے کے بعد سے معطل کر دیا گیا تھا۔ [3] شام نے عراق کے موقف پر ترکی اور قطر کو ناراض کرتے ہوئے ایران کی حمایت کی اور عراق میں نوری المالکی کی حکومت کے قیام میں تعاون کیا۔ اسی طرح لبنان کے معاملے میں بھی شام نے سعودی عرب کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کو توڑ کر ایران کا ساتھ دیا لبنان میں اپنے حلیفوں کی مدد سے 2011ء میں سعد الحریری کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ [4]

ایران اور شام کے مابین اس طرح کی سٹریٹیجک معاونت بتاتی ہے کہ دونوں ممالک باہمی انحصار کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور شام کسی بھی طور ایران کی مشاورت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔

---

[1] Sectarianism and Sectarian System in Syria,44

[2] The Syrian withdrawal: Where Things Stand, Rand Studies(2017)40

[3] محجوب زویری، العرب وایران، مراجعة فی التاریخ، 156۔

[4] سابقہ مرجع، 160۔

جب عرب بہار کے مظاہرے شروع ہوئے تھے تو اس وقت ایران نے ان مظاہروں کو انقلابی کہا تھا، تب تک یہ لہر شام نہیں پہنچی تھی۔ لیبیا، تیونس اور مصر میں عوامی سمندر کے سڑکوں پر نکل آنے کو ایران میں مسلم انقلاب سے تعبیر کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اسی نوع کے مظاہرے ہیں جیسے انقلاب ایران کے لیے ہوئے تھے۔ یعنی کہ اب مسلم دنیا ایرانی ماڈل کی طرف آ رہی ہے۔ (1) لیکن جونہی یہ احتجاج شام میں شروع ہوئے تو اسے فرقہ وارانہ اور مسلکی رنگ دیدیا گیا تھا اور کہا گیا کہ اس کے پیچھے سازش ہے۔

شام کا بحران ایران کے لیے شامی مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ اسے اپنا داخلی مسئلہ قرار دیتا ہے۔ پچھلے دس سالوں میں ایرانی قیادت اور وزرائے خارجہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ شام کے مسئلے کو ایران سے الگ کر کے نہ دیکھا جائے۔ اس میں ہماری قومی مصلحت پوشیدہ ہے۔ اتنے عرصے تک ایران شام کو اقتصادی اور عسکری تعاون مہیا کرتا رہا ہے، اس دوران شامی حکومت کا ایران پر انحصار اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ وہ ملکی مسائل کے حل کرنے میں خودکفیل نہیں رہی ہے۔ وہ ایران کی مرہون منت ہے۔ ایرن کو اور باقی دنیا کو بھی اس بات کا بخوبی علم ہے اور اسی لیے ایران کو شامی بحران سے لاتعلق نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی کوئی ایسی پالیسی سامنے لائی جاتی ہے جس میں بشار الاسد کی حکومت کو معزول کرنا مقصود ہو کیونکہ یہ براہ راست ایرانی حکومت کو اس کے اقتدار سے الگ کرنے جیسا عمل ہے۔ اگر شام میں ایران کا اتنا نفوذ نہ ہوتا تو بشار الاسد کی حکومت کو ختم کرنا خطے کے ممالک یا عالمی قوتوں کے لیے مشکل نہیں تھا۔ (2)

ایران اور شام کے تعلقات اس وقت سے ہیں جب ایران عراق جنگ کے دوران شام نے ایران کی مدد کی تھی، اس کے علاوہ دونوں ممالک اسرائیل دشمنی میں بھی شریک ہیں، اسی طرح ایران کی لبنان میں حزب اللہ تک رسائی کے لیے شام ہی واحد گزر گاہ ہے۔ (3)

حزب اللہ کے ٹھکانوں میں پایا جانے والا اکثر اسلحہ ایران سے براستہ شام ہی پہنچتا ہے۔ بشارالاسد کے شام پر کنٹرول سے تہران کے لیے حزب اللہ کو سپلائی ممکن ہوتی ہے اور بحر متوسط سے لنک بھی قائم ہوتا ہے۔

ایران کی جانب سے حزب اللہ کے اسدی افواج کے ساتھ مل کر لڑنے کے مطالبے کے چند ماہ بعد ایران نے دیگر شیعہ ملیشیا گروہوں کی تیاری شروع کر دی اور فاطمیین (سابق بر گیڈ) کے نام سے ایک گروہ تشکیل دیا، یہ افغان پناہ

---

[1] S.Hadia, Sectarianism and Sectarian System in Syria,48

[2] سابقہ مرجع، 56۔

[3] سابقہ مرجع، 60۔

گزینوں کی ملیشیا تھی،اس ملیشیا کو پاسداران انقلاب اور حزب اللہ کے قدیم جنگجوؤں نے ٹریننگ دی،یہ ملیشیا اندازاً8000 سے 12000 جنگجوؤں پر مشتمل ہے۔ایرانی حکام کا کہنا ہے کہ یہ جنگجو رضاکار ہیں۔[1]

فاطمیین بر گیڈ کے اولین بھرتی ہونے والے اصل میں افغان ہزارہ شیعہ تھے جو نوّے کی دہائی کے اوائل میں ہونے والی خانہ جنگی اور سوویت یونین کے قبضہ کے بعد ایران میں آباد ہو گئے تھے جس کے بعد طالبان کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ان بھرتیوں میں پاکستان (افغانوں کو پناہ دینے والا دوسرا بڑا ملک) کی جانب سے نوّے کی دہائی کے وسط میں پشتون سنی افغانوں اور ان کے بچوں کو طالبان تیار کرنے کے لیے کی جانے والی بھرتیوں کی بازگشت تھی۔

گزشتہ چند برسوں میں ایران نے عبدالامین جیسے غیر رجسٹرڈ افغانیوں کی بھرتیوں میں اضافہ کر دیا ہے جو کہ حال ہی میں روزگار کی تلاش میں افغانستان سے آیا تھا۔افغان پناہ گزینوں کی مالی حالت اور قانونی طور پر بے یقینی کی کیفیت سے قطع نظر ایرانی افغان پناہ گزینوں کو شام میں اسدی حکومت کی بقا کے لیے لڑائی کی غرض سے بھرتی کر کے ان کے ساتھ نظری عقیدے کا استحصال کر رہے ہیں۔

ایرانی پروپیگنڈے نے ان پناہ گزینوں کے لیے شامی جنگ کو اس طور پر دلفریب بنادیا ہے کہ یہ ایمان وعقیدے کے دفاع اور مقدس مقامات کے تحفظ کی جنگ ہے۔ہیومن رائٹس واچ کے سابق ریسرچر احمد شجاع کا کہنا ہے کہ:ان کی اکثریت اَن پڑھ ہے،ان میں سے بیشتر عربی نہیں بول سکتے اور اکثریت کبھی افغانستان یا ایران کی حدود سے باہر نہیں نکلی،اور بہت سے مذہبی شیعہ ہیں۔

مثال کے طور پر عبدالامین کا خیال ہے کہ شام کی جنگ اسد اور جہادی تنظیم النصرہ فرنٹ،جو2012ء میں رسمی طور پر بنی،کے مابین لڑائی کے نتیجہ میں شروع ہوئی۔اسے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ جنگ اس وقت شروع ہوئی جب النصرہ کے رہنما(جو امین کے مطابق اسد کا ساتھی تھا) نے ایک مسجد پر سٹور بنانے کا ارادہ کیا جس پر اسد،جو کہ علوی ہے،فوراً مسجد اور تمام مقدس جگہوں بالخصوص ملک میں شیعہ مزاروں کی حفاظت کے لیے آگے بڑھا۔جس کے جواب میں (عبدالامین کے مطابق) النصرہ نے عوام کو اسد کے سقوط اور مزارات کے گرانے پر اکسایا۔

غیر ملکی شیعہ ملیشیا گروہوں نے اسدی حکومت کو تقویت دینے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا اور انھی ملیشیا گروہوں نے ہی حلب کے فیصلہ کن معرکے میں بری افواج کو آگے بھیجا۔حلب میں فتح سے بشار الاسد کو اور ایران کو مزید وقت مل گیا جس نے شامی محقق کے مطابق ایران کے لیے لبنان تک عملداری کی کمان بنانے کا ہدف قریب تر کر دیا۔[2]

---

[1] سامی الحداد، مبادرہ العریضہ الشعبیہ، 101

[2] محجوب زویری،العرب وایران، مراجعۃ فی التاریخ،153۔

ایران اور اسد کی اس جنگ میں سینکڑوں افغان قتل ہوئے اور مارے جانے والے افغان جنگجوؤں کی میّتوں کی دفن سے قبل تہران اور قم کی گلیوں میں رسمی نمائش کی گئی اور ایرانی مرشد اعلیٰ آیت اللہ خامنہ ای اور جنرل قاسم سلیمانی شام میں افغان ملیشیا کے قتل ہونے والے جنگجوؤں کے خاندانوں سے ملے اور ان کے بیٹوں کی اسلام اور مقدس مزارات کے دفاع کی خاطر دی گئی قربانی پر شکریہ ادا کیا۔

اگر ایران کا شام میں اثرورسوخ اور عمل دخل نہ ہوتا تو شام کی اپوزیشن اتنی طاقتور تھی کہ وہ اس حکومت کو گرادیتی۔ مگر یہ ممکن نہیں ہوسکا جس کی وجہ ایرانی عنصر ہے۔ شام واضح طور پہ ایران کی کالونی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے خطے کے عرب ممالک کو شامی بحران کے متعلق کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل ایران کو اس میں شامل کرنا ہوگا، اور ایران کو بھی شامی عوام کی ترجیحات کا خیال رکھتے ہوئے ایک متفقہ حل تلاش کرنا ہوگا۔ کوئی بھی ایسا حل جو ایران کی غیر موجودگی میں ہو وہ کامیاب نہیں ہوسکتا کیونکہ ایران کی شام میں جڑیں بہت زیادہ مضبوط ہیں۔ اور ایران کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے ہر قدم میں اکثریتی عوام کی رائے کو مقدم رکھے۔ ایران کو اس خاص نظریاتی فکر سے نکل کر عام شامی عوام میں اپنی مقبولیت بڑھانی ہوگی اور وہ تب ہوگی جب ان کی شکایات کا ازالہ کیا جائے گا۔

نتائج

شامی بحران پر کی گئی اس تحقیق کو سامنے رکھتے ہوئے جو نتائج مرتب کیے گئے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

1. ملکِ شام کی حیثیت مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے جس کی متعدد دینی اساسات ہیں، جن میں سے سب اہم انبیاء کا وہاں مبعوث ہونا اور قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں اس کا ذکر ہے۔
2. ارضِ شام کے بارے میں تمام آسمانی مذاہب میں ایسی تعلیمات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرزمین مستقبل میں مختلف تہذیبوں کے مابین جنگوں کا مرکز بنے گی۔
3. مشرقِ وسطیٰ اپنے جغرافیائی خدوخال اور وسائل کی وجہ سے دنیا کا انتہائی اہم ترین خطہ شمار کیا جاتا ہے۔ دنیا کے طاقتور ترین ممالک کی نظریں مشرقِ وسطیٰ پر جمی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس خطے کا اہم ترین ملک ملکِ شام ہے۔
4. United Nation High Commission for Refugees کی 2018ء کی ایک رپورٹ کے مطابق 520،000 سے زائد لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ 6.6 ملین لوگ اندرون ملک اور 5.6 ملین لوگ بیرون ملک ہجرت کر چکے ہیں۔
5. اس خانہ جنگی کے نتیجے میں شامی معاشرے کو چلانے کے ضروری ادارے بھی تباہ ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر تعلیم اور صحت کے تین چوتھائی حصے یا تو تباہ ہو چکے ہیں یا انہیں شدید نقصان پہنچا ہے۔
6. 2018ء تک خانہ جنگی کی وجہ سے 400 ارب ڈالر سے زائد کا معاشی نقصان ہوا ہے۔
7. شامی خانہ جنگی نے ملک کے اندر ایک سیاسی بحران کو جنم دیا ہے۔ اس بحران نے لوگوں کو تقسیم کر دیا ہے اور ان کے مابین آپس میں منافرت پیدا ہوئی ہے۔
8. شام کی اس صورتحال کی ایک بڑی وجہ اس معاملے کا عالمی سیاست (امریکہ، روس، ایران، سعودی عرب، ترکی وغیرہ) کی بھینٹ چڑھ جانا ہے جس میں بڑی حد تک اپنوں (حکومت و اپوزیشن) کی غفلت بھی شامل ہے۔
9. ارضِ شام سے متعلق قیامت کے قریب جنگوں کی پیشین گوئیاں بھی پائی جاتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی یہیں ہو گا اور یہاں حق و باطل کا آخری معرکہ لڑا جائے گا۔

10. شامی بحران کے جہاں داخلی وخارجی سطح پر متنوع اثرات رونما ہوئے وہیں یہ چیز بھی سامنے آئی اس سرزمین سے اٹھنے والے مسلکی اختلافات اور فرقہ واریت کے شراروں نے مسلم امہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سفارشات

اس مقالہ کی اہم تجاویز و سفارشات درج ذیل ہیں۔

1. شام کی مقدس سرزمین سے خانہ جنگی کو فی الفور ختم کیا جائے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ حکومت اور اپوزیشن مسلح تنظیموں کا خاتمہ کریں کسی بھی مسلح جتھے کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے اور جمہوری طریقے سے مل بیٹھ کر ایک متفقہ حل کی طرف جایا جائے۔
2. فرقہ واریت ملک شام میں آگ کی طرح پھیل رہی ہے، حکومت اور اپوزیشن دونوں کو مل کر فرقہ واریت کی آگ کو جڑ سے اکھاڑنا ہو گا۔
3. مہاجرین کی سہولیات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ان کی واپسی کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ تاکہ وہ عزت کے ساتھ اپنے ملک میں زندگی گزار سکیں۔
4. ملک میں تعلیمی ایمرجنسی نافذ کی جائے اور مہاجر کیمپوں میں بھی تعلیمی سہولیات کی فراہمی یقینی بنایا جائے۔
5. ملک میں آزادانہ انتخابات کرائے جائیں جن میں تمام سیاسی جماعتوں کو حصہ لینے کی اجازت ہو جو عوام کی نمائندگی کرتی ہیں۔
6. ملکِ شام میں فرقہ واریت میں کمی اور اخوت و بھائی چارے کی فضاء کا پیدا ہونا از حد ضروری ہے اس کے لیے علماء اور مذہبی مفکرین کے کردار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے۔ شام میں معتدل مذہبی فکر بحران کے حل میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

محققین کے لیے تجاویز

- مہاجرین کے مسائل اور جہاں آباد ہو رہے ہیں وہاں ان کو درپیش مسائل پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

فہارس

فہرست آیات

فہرست احادیث

11	سَیَصِیرُ الْاَمْرُ إِلٰی أَنْ تَکُوْنُوْا جُنُوْدًا مُجَنَّدَةً جُنْدٌ بِالشَّامِ وَجُنْدٌ بِالْیَمَنِ وَجُنْدٌ بِالْعِرَاقِ' قَالَ ابْنُ حَوَالَةَ خِرْ لِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ إِنْ أَدْرَکْتُ ذٰلِکَ، فَقَالَ: عَلَیْکَ بِالشَّامِ فَإِنَّھَا خِیَرَةُ اللّٰہِ مِنْ أَرْضِہٖ یَجْتَبِیْ إِلَیْھَا خِیَرَتَہٗ مِنْ عِبَادِہٖ، فَاَمَّا إِنْ أَبَیْتُمْ فَعَلَیْکُمْ بِیَمَنِکُمْ، وَاسْقُوْا مِنْ غُدُرِکُمْ، فَإِنَّ اللّٰہَ تَوَکَّلَ لِیْ بِالشَّامِ وَأَھْلِہٖ	صحیح المسلم، رقم الحدیث 5067	17
12	طُوْبٰی لِلشَّامِ، فَقُلْنَا: لِأَیِّ ذٰلِکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ لِأَنَّ مَلَاءِکَةَ الرَّحْمٰنِ بَاسِطَةٌ اَجْنِحَتَھَا عَلَیْھَا	سنن ابی داوٗد، رقم الحدیث 2483	18
13	فَإِنَّ دِمَاءَکُمْ، وَأَمْوَالَکُمْ، وَأَعْرَاضَکُمْ، بَیْنَکُمْ حَرَامٌ، کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ ھَذَا، فِي شَھْرِکُمْ ھَذَا، فِي بَلَدِکُمْ ھَذَا، لِیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الغَائِبَ، فَإِنَّ الشَّاھِدَ عَسَی أَنْ یُبَلِّغَ مَنْ ھُوَ أَوْعَی لَہُ مِنْہُ۔	صحیح مسلم، حدیث نمبر:72	178
14	يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَفْشُوا السَّلاَمَ وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الأَرْحَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلاَمٍ۔	سنن ترمذی، حدیث نمبر:373	181
15	يا ابنَ حوالةَ، إذا رأيتَ الخلافةَ قد نزَلَت أرضَ المقدَّسةِ فقَد دنَتِ الزَّلازِلُ والبَلابلُ والأمُورُ العِظامُ، والسَّاعةُ يومَئذٍ أقربُ منَ النَّاسِ من يدي هذِهِ من رأسِکَ	ابوداوٗد، رقم الحدیث 2535	19

فہرست اعلام

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر
1	الاخضر الابراہیمی: یکم جنوری 1934ء کو الجزائر میں پیدا ہوئے۔ اقوام متحدہ اور عرب لیگ کا ملک شام کے لیے 2014ء تک مندوب خاص تھا	124
2	امام نووی شارح صحیح مسلم: یحیٰ بن شرف نووی، 1233ء میں ملک شام میں پیدا ہوئے اور 1278ء میں وفات پائی	14
3	تھیوڈر ہرتزل: 1860ء میں پیدا ہوئے۔ 3 جولائی 1904ء کو وفات ہوئی۔ سب سے پہلے اسرائیلی ریاست کا خواب دیکھا تھا	111
4	حافظ ابن حجر عسقلانی: 1372ء میں مصر میں پیدا ہوئے۔ احمد بن علی نام تھا۔ بخاری کی شرح لکھی ہے	14
5	حافظ ابن عساکر: ملک شام کے بلند پایہ محدث اور مورخ تھے۔ ابوالقاسم علی بن ابی محمد الحسن نام ہے۔ پیدائش 1105ء اور وفات 1176ء میں ہوئی	14
6	حزب اللہ: 1980ء میں ایرانی پشت پناہی سے تشکیل پائی۔ لبنان میں موجود اسرائیلی فوجی دستوں کے انخلاء کے لیے جدوجہد کی۔ صدر دفتر بیروت میں ہے	53
7	رعمسیس اول: قدیم مصر کے شاہی خاندان کا پہلا فرعون تھا۔	07
8	سکندر مقدونی: 323ء سے 350ء تک مقدونیہ کا حکمران رہا ہے۔ اس نے ارسطو جیسے استاد سے صحبت پائی ہے۔	08
9	شیخ الاسلام ابن تیمیہ: تقی الدین احمد بن عبدالحکیم۔ 1263ء میں پیدائش ہوئی اور 26 دسمبر 1328ء میں وفات پائی۔	14
10	علامہ ابن القیم: شمس الدین ابوعبداللہ 1292ء میں دمشق کے زرع نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابن تیمیہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ 1350ء میں وفات پائی۔	14
11	فش مین: یہ ایرل شیرون کا مشیر تھا۔ اور اسرائیلی خارجہ امور کا سینیئر عہدیدار تھا۔	104
12	کوفی عنان: 08 اپریل 1938ء کو پیدا ہوئے۔ 18 اگست 2018ء کو وفات پائی۔ اقوام متحدہ کے ساتویں سیکرٹری جنرل تھے۔	123
13	ماہر عرار: 1970ء میں پیدا ہوئے ایک انجنیئر تھے شام اور عراق کی دہری شہریت رکھتا تھا۔ القاعدہ سے تعلق کے شبے میں 2002ء میں گرفتار ہوا۔	96

14	محمد الحسینی: مفتی اعظم فلسطین سے پہچانے جاتے ہیں۔ 1895ء میں یروشلم میں پیدا ہوئے۔ 1974ء میں بیروت میں انتقال ہوا۔	**95**
15	محمد حسین ہیکل: مصر کے شاعر، سیاستدان اور ادیب تھے۔ 20 اگست 1888ء میں مصر میں پیدا ہوئے۔ اور 1956ء میں وفات پائی۔	**106**
16	مفکر اوید دینیون: یہ یہودی مفکر اور ادیب ہے۔	**105**

فہرست اماکن

نمبر شمار	جگہ / مقام	صفحہ نمبر
1	اِدلب شمال مغربی شام کا ایک شہر ہے۔	25
2	المزہ دمشق کا مغربی علاقہ ہے	96
3	بیت المقدس یروشلم میں واقع مسلمانوں کا قبلہ اول	02
4	بیروت لبنان کا دارالحکومت ہے	04
5	تدمر شامی قدیم شہر کا نام تدمر ہے جو کہ دمشق کے شمال مشرق میں ہے۔	96
6	حطین بحیرہ طبریہ کے مغربی جانب واقع ہے جو اب مقبوضہ فلسطین میں ہے۔ سرسبز و شاداب بستی ہے جہاں پانی کی فراوانی ہے۔	14
7	حلب یہ شمال مغربی شام کا ایک بہت ہی پرانا شہر ہے۔ زمانہ قدیم میں ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔	25
8	خان شیخون یہ ادلب شہر کا ایک قصبہ ہے۔	25
9	سامراء عراق میں بغداد کے شمال میں دریائے دجلہ پر واقع ایک شہر کا نام ہے	06
10	صیدا لبنان کا تیسرا بڑا شہر ہے	05
11	عسقلان اسرائیل کا ایک رہائشی علاقہ ہے۔	19
12	عین جالوت شمالی فلسطین میں واقع ایک مقام ہے۔	15
13	غوطہ ملک شام کی دار لحکومت دمشق کے نواح میں واقع ایک شہر کا نام ہے،	19
14	فارس 1935ء تک یہ ایران کا سرکاری نام تھا	08
15	گولان یہ گولان ہائٹس کے نام سے مشہور ہے۔ شام کے مغرب میں واقع ہے۔	112
16	لد تاریخی اعتبار سے یہ ایک قدیم شہر ہے، یہاں پر 5250 ق م پرانے ظروف بھی پائے گئے ہیں، یہ شہر اس وقت اسرائیل کا ایک سٹی سینٹر ہے اسکی آبادی ستر ہزار کے قریب ہے۔	17
17	یروشلم القدس شہر بھی کہا جاتا ہے	08
18	یمن مغربی ایشیاء میں واقع مشرق وسطی کا ایک اسلامی ملک ہے، یمن کی آبادی تقریبا 2 کروڑ ہے۔	17

فہرست مصادر و مراجع

کتب:

القرآن الکریم

ادھم آل جندی، تاریخ الثورات السوریہ (بیروت، دار صادر، 2020ء

اسعد صقر، الشرق الاوسط الجدید (بیروت، دارالحریہ، 2020ء)

ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی (بیروت، المکتبہ اللمیہ، 2001ء

ایلیا دسوقی، المقاومہ الاھلیہ فی سوریا (بیروت، مکتبہ الدیدات، 2016ء)

برھان غلیون، المسالہ الطائفیہ وحالۃ الاقلیات (دوحہ، مرکز للعلم، 2001ء)،

حبیب اللہ چشتی، امت مسلمہ کا عروج وزوال، ضیاء القرآن پبلیکیشنز کراچی، 2005

حسام ہرہوری، تصورات الاحزاب المغربیہ للاصلاح السوری (بیروت، مکتبہ الحیاۃ، 2019ء)

حمزہ المصطفی، المجال العام الافتراضی فی الثورۃ السوریہ (القاہرہ، مرکز الجزیرہ للدراسات، 2017ء)

خلیل مصطفی، سقوط الجولان (اسکندریہ، دارالنصر، 2015ء)

دیب کمال، تاریخ سوریا المعاصر (بیروت، دار النھار للنشر، 2012ء)

رضوان زیادہ، التحول الدیمقراطی فی سوریہ (القاہرہ، مرکز لدراسات حقوق الانسان، 215ء)،

زیادہ رضوان، الاسد والصراع علی الشرق الاوسط (بیروت، دارالکتاب العربی، 2015ء)،

سامح العائد، الزاوادین، السیطرہ الغامضۃ (بیروت، دارالریس، 2011ء)

سامی الحداد، مبادرہ العریضہ الشعبیہ (بیروت، دارالاندلس، 2013ء)98

سلیمان المدنی، ھؤلاء حکموا سوریا (القاہرہ، دارالمعارف، 2017ء)

سمیر قصیر، دیموقراطیۃ سوریا (القاہرہ، دارالنہار، 2018ء)

سمیر یوسف، الموقف السوری من الوجود السیاسی (بیروت، مکتبہ الحیاۃ، 2012ء

ظل ہما، معاشی مسائل لاہور، عکس پبیلی کیشنز، 2010ء)

عبد الفضل، العرب والتجربہ الآسویہ (بیروت، مرکز دراسات الوحدہ العربیہ، 2013ء)،

عروہ التاج، الاستقلال الثانی نحو مبادرۃ الاصلاح السیاسی فی العالم العربی (القاہرہ، مکتبہ الشرق الجدید، 2018ء)77

عزمی بشارہ، سوریا درب الاحلام نحو الحریہ (دوحہ، المرکز العربی للابحاث ودراسۃ السیاسات، 2016ء)

علی آزاد محمد، خلفیات الثورۃ السوریہ (بیروت، المرکز العربی للدراسات والابحاث، 2019ء)،

علی باروت، مسارات السلطۃ والعارضہ فی سوریا (القاہرہ، مرکز القاہرہ لدراسات حقوق الانسان، 2018ء)،

عمر اسکندر، شوریا ازمۃ نظام وثورۃ شعب (بیروت، مرکز امیہ للبحوث والدراسات، 2014ء)

عمر عبد الحکم، الثورہ الجہادیہ فی سوریا (القاہرہ، مکتبہ طیاف، 2017ء)

مجید ایاد، الموقف العربی من التغییر فی المنطقة (القاہرہ، مجلہ سیاسات عربیہ، مارچ،2019ء)،166
محارب محمود، اسرائیل والتغییرات الجیوالاستراتیجیہ (بیروت، دارالکتب العلمیہ، 2013ء)،
مجوب زویری، العرب وایران، مراجعة فی التاریخ (دوحہ، المرکز العربی للدراسات، 2013ء)،
محمد المجذوب، دراسات فی السیاسہ والاحزاب (بیروت، دارابن خلدون، 2017ء)
محمد النجار، الحرب السریہ فی الشرق الاوسط (اردن، مکتبہ المنار، 2019ء)
محمد بوعزہ، الانقلابات العسکریہ فی سوریا (دمشق، مکتبہ المنارہ، 2010ء)
محمد حسین ہیکل، ماالذی جری فی سوریا (القاہرہ، مکتبہ طیاف، 2014ء
محمد حسین ہیکل، ماالذی جری فی سوریا (القاہرہ، مکتبہ طیاف، 2014ء
محمد ذوقان، تطور الحرکة الباطنیہ فی سوریا (بیروت، المکتبہ العلمیہ، 2014ء)
محمد عبدالواحد، الدکتاتوریہ محنة الاسلام (القاہرة، دارالمعارف، 2014ء)
محمد المبارک، ترکیب المجتمع السوری (القاہرہ، مکتبہ الحداد، 2015ء)44
محمود صالح، الہلال الخضیب (بیروت، دارالمشرق، 2018ء)
مسعد ناجی، مستقبل التغییر فی الوطن العربی (اسکندریہ، منشورات الکتب العامہ، 2012ء)
مولاناعبدالحفیظ بلیلاوی، مصباح اللغات، مکتبہ قدوس، زیلدار روڈ، اچھرہ لاہور۔
ہندی احسان، کفاح الشعب العربی (بیروت، ادار الشؤون العامہ، 2009ء)،
یوسف سیوفی، ذکری استقلال سوریا (بیروت، دارالامان الجدیدہ، 2017ء)

کتب صحاح ستہ

ابوداؤد، سلمان بن اشعث، السنن، بیروت لبنان۔ دارالفکر۔
ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید، امام، سنن ابن ماجہ، مطبوعة، نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی۔
الترمذی، ابوعیسی محمد بن عیسی، الامام، جامع ترمذی، بیروت، دارالفکر 1981ء۔
النسائی، الامام، السنن الکبری، بیروت، لبنان، دارالکتب العلمیة، 1411ھ۔
محمد بن اسماعیل، البخاری، الجامع الصحیح، دارالسلام، ریاض، 1997ء۔
مسلم بن حجاج القشیری، الامام، الصحیح المسلم، علمی کتب خانہ لاہور۔

مجلات:

مجلہ البیان، لندن، جولائی، 2018ء
مجلہ دستور، پیرس، جنوری، 2019ء
مجلہ المجتمع، کویت، اگست، 2016ء
مجلہ مرکز حرمون للدراسات، قطر، ستمبر، 2020ء

رپورٹس:

بی بی سی، امریکہ کا شام پر عالمی دباؤ کا خیر مقدم، 15 نومبر 2011ء

دی گارڈین، 2019ء، اَن ایمپلائمنٹ اِن سیریا

ڈی ڈبلیو، شامی خانہ جنگی کی مختصر تاریخ، 29 اکتوبر 2017ء www.dw.com

سیرین آبزرویٹری فار ہیومن رائٹس، رپورٹ 2019ء

ورلڈ بینک رپورٹ 2018ء، سیریا

یو این رپورٹ 2018ء، سیریا

انگریزی کتب:

Barah Mikail, FRIDE Policy Briefs, June, 2012, Madrid, span
Christopher Philips, The Battle for Syria(Yale University Press, (2016)
Food & Agriculture Organization of the United Nations: Counting the cost: Agriculture in Syria, April 2017
Impact of Syrian Crisis(The World Bank Report, April, 2014),
Islamists religion and revolution in Syria, (Harmoon Center for Contemporary Studies, 2014)
Jermy Bowen, Surge in Arab Sectarian Violence After Arab Uprising BBC news 20 September, 2013
Kamran Bukhari, Jihadist Opportunities in Syria, Geopolitical Weekly, Stratfor Global Intellengence, 14 Feb, 2012
Krugman, Paul; Wells, Robin. Economics (3rd Edition) P.2.Worth Publishers New York. (2012)
Legal implications of armed conflict in Syria, (Harmoon Center for Contemporary Studies, 2016),

Legal implications of armed conflict in Syria, (Harmoon Center for Contemporary Studies, 2016),

Marwan Hisham, Brothers of the Gun (New York, Rendom House Publishing, 2016),
Raina Abouzied, No Turning Back (Newyork, W.W Norton, 2018),
Rees Erlich, Inside Syria: The Backstory of Civil War (London, Prometheous Books, 2017),
Sectarian violence could Destry the Muslim World" Posted, 21 Aug, 2013, Huffington post, UK
Sectarianism and Sectarian System in Syria
The Ripple Effects of Syria Conflict in Mashreq Region(The World Bank Report, June, 2020)
The Syrian withdrawal: Where Things Stand(RAND Studies, 2017),

The Syrian withdrawal: Where Things Stand(RAND Studies, 2017),